بسم اللہ الرحمن الرحیم

محرم الحرام ۱۴۳۳ ہجری بمطابق ۲۰۱۲ عیسوی

شش ماہی مجلہ

میراث برصغیر

(برصغیر کے علمی، ادبی، ثقافتی اور فرہنگی آثار کا ترجمان)

محرم الحرام نمبر

خدا کا فدائی، اسلام کا شیدائی، مسلمانوں کا غمگسار، امت کا جان نثار، خدا کا محبوب، محمد کا لخت جگر، علی کا نور نظر، فاطمہ کا چاند، حق کا دلدادہ، صداقت کا شہزادہ، مجسمہ ایثار، صبر و استقلال کا پتلا، خلق و مروت کا پیکر، ہمت کا دھنی، امت کا پیشوا، شان الٰہی کا مظہر، کمالات رسالتی کا آئینہ، حافظ دین الٰہی، مظلوموں کے بادشاہ، صابروں کے شہنشاہ حسین ابن علی کی بارگاہ میں یہ ناچیز ہدیہ پیش کیا جاتا ہے۔

دوسرا سال

تیسرا شمارہ

(برصغیر کے علمی، تحقیقی، ادبی اور ثقافتی آثار کا ترجمان)

رابطه برای حصول مجله:

پاکستان: مجاہد عباس اعوان
فون: 00923333854398

حیدر آباد دکن «ہند»: باب العلم لائبریری
فون: 00919391312386

ہندوستان: مرکز احیاء آثار برصغیر (شعبہ کشمیر)
فون: 00919796737269

عراق: سید تنویر حسین نقوی
فون: 009647704317542

شام: سید ظہیر الحسنین شیرازی
فون: 00963933013932

برطانیہ: شیخ عباس رضا
فون: 00441618392866

ایران:
Ph: 0098-251-8848746
Mob: 0098-919-9704372
e-mail: maab1431@yahoo.com

اکاؤنٹ نمبر:
حبیب بنک، برانچ کراچی ملیر ۱۵ 08897900284303
بانک ملی ایران شعبہ حجتیہ قم 0340215265000

قیمت: 250/روپے

انتشارات مرکز احیاء آثار برصغیر (کراچی)

نوٹ

مآب کسی خاص خاندان یا کسی خاص شخص کا ترجمان نہیں ہے، بلکہ ہماری کوشش ہے کہ برصغیر کی مرحوم عظیم شیعہ شخصیات کا تحریر کردہ مواد اور ان شخصیات کے بارے میں اطلاعات، ملت کے ہاتھوں پہنچائی جائیں، اس میں ہمارے پیش نظر تمام وہ مرحوم شخصیات ہیں جنہوں نے مذہب اہل بیت کی نمایاں ومخلصانہ طور پر علمی، فرہنگی، فردی واجتماعی خدمات انجام دی ہوں۔

اس حوالے سے سینکڑوں شخصیات ابھی تک ایسی موجود ہیں جنہوں نے کئی حوالوں سے مذہب کی خدمت انجام دی، حتی اس راہ میں اپنی جان بھی قربان کردی، لیکن ہم ابھی تک انکے حالات و آثار سے واقف نہیں ہیں ، جن کے چند نمونے مآب کے تعارف نامہ، اور مجلہ میراث کے پہلے شمارہ میں پیش کیے ہیں۔

مجلہ میراث برصغیر میں مرحومین کی تحریروں کو محققین مآب کی آراء کے بعد زیور طبع سے آراستہ کیا جائے گا اور بقید حیات اہل قلم (خدا انہیں زندہ وسلامت رکھے) کی تحریروں میں سے فقط وہ تحریریں نشر ہوں گی جو مندرجہ ذیل تین موضوعات میں سے کسی ایک سے متعلق ہوں:

ا۔ تاریخ تشیع: مثلاً برصغیر میں شیعہ حکومتیں، تاریخ عزاداری، گذشتہ وموجودہ، مذھبی وسیاسی تحریکیں وتنظیمیں، خاص شیعہ علاقے، گذشتہ وموجودہ شیعہ خاندان، موقوفات، مقابر، مذہبی رسومات و مذہبی مقامات، مثلاً مدارس، امام باڑے، مساجد وغیرہ (برصغیر یعنی ہندوستان، پاکستان، کشمیر، بنگلہ دیش کے کسی ملک، کسی شہر، کسی دہات، وعلاقہ سے مربوط مقالات ہوں۔)

۲۔ تراجم: یعنی مرحوم شیعہ اہم شخصیات اور ان کے آثار وخدمات سے متعلق کچھ تحریر کیا گیا ہو۔

۳۔ کتاب شناسی: کسی خاص ایک کتاب کی تحقیق یا معرفی، خاص شخص کی کتابیں، خاص کتابخانہ کی فہرست کسی خاص موضوع یا کسی ایک خاندان کی علمی میراث وغیرہ کے حوالے سے قلم اُٹھایا گیا ہو۔

اراکین ادارے کا صاحب مقالہ (زندہ یا مرحوم) کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

«من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ»

(تفسیر نور الثقلین، ج۵، ص۱۳۸۔)

ہم تہہ دل سے ان تمام حضرات کے شکر گزار ہیں۔ جنہوں نے مؤسسہ "مرکز احیاء آثار برصغیر (مآب)" کی ترقی کے لیے ہمارے ساتھ دامے، درمے، سخنے اور قدمے تعاون فرمایا۔ خصوصاً ان خیرین (کثر اللہ امثالہم) کہ جن میں سے بعض احباب نے اپنا نام دینا مناسب نہیں سمجھا لیکن مرکز کے اہداف کو عملی جامعہ پہننے کے لیے اور بالخصوص مجلہ میراث برصغیر کے اس نمبر میں خصوصی تعاون فرمایا۔

قارئین کرام سے التماس ہے کہ معاونین مرکز احیاء آثار برصغیر (مآب) اور دیگر خادمین مکتب اہل بیت علیہم السلام کے مرحومین کی مغفرت کے لیے دعا گو رہیں۔

والسلام

مرکز احیاء آثار برصغیر

فہرست مطالب

کتاب: ہدایات ناصریہ

کتاب ہدایات ناصریہ پر
ایک تحقیقی نظر

کتاب: غازہ شاہد

کتاب: تاریخ کا خونی ورق

کتاب: شہید انسانیت

کتاب: شہادت امام حسینؑ

امام باڑۃ جڈیبل (سرینگر)

تاریخ کے جھروکوں سے

اداریہ

برصغیر میں تشیع کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ تاریخ بھی محسنان تشیع کے حالات اور ان کے آثار کے ساتھ آہستہ آہستہ تاریخ کے سینے اور جوانوں کے ذہنوں سے مٹتی جارہی ہے جس کی حفاظت ہماری اولین ذمہ داری ہے۔لہذا آئیں اور سب مل کر اس تاریخ اور میراث کو زندہ کریں تاکہ بزرگوں کی یہ امانت صحیح وسالم آئندہ نسلوں تک پہنچا سکیں۔

اس حوالے سے انہیں محسنان اسلام کے آثار و حالات اور ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے برصغیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ **مرکز احیائے آثار برصغیر** کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ جس میں دیگر اہم کاموں کے علاوہ ایک شش ماہی مجلہ بنام "میراث برصغیر" کی اشاعت بھی شامل ہے۔ جس میں برصغیر کے بزگ مرحوم علماء ودیگر خدمتگذاران اسلام و تشیع کے آثار و حالات کے علاوہ تاریخ تشیع کے عنوان سے علمی مواد موقع و محل کی مناسبت سے قارئیں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا ان شاءاللہ۔

یہ مجلہ ہر سال ماہ محرم اور مآب کی تاریخ تاسیس کی مناسبت سے جمادی الثانی میں نشر ہوگا۔ اس وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ محرم الحرام میں نشر ہونے والا مجلہ اکثر محرم الحرم نمبر کے عنوان سے شائع کیا جائے۔ اس حوالے سے یہ پہلا محرم نمبر ہے جو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

بحمد اللہ سرزمین برصغیر میں فقط امام حسین علیہ السلام، عزاداری سید الشہداء اور دیگر شہداء کربلا سے متعلق اردو، عربی، فارسی اور دیگر علاقائی زبانوں میں دوہزار (۲۰۰۰) سے زیادہ کتب و رسائل تحریر ہوئے

ہیں جن میں سے اہم کتب و رسائل کو موقع و محل اور امکانات کو مد نظر رکھتے ہوئے ملت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

ایک اہم بات: اس حوالے سے جو اہم بات ہم عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ رسائل یا مضامین چونکہ قدیم ہیں اور اُس زمانے کی نزاکت و ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لہذا ممکن ہے۔ ان میں کچھ ایسے مطالب موجود ہوں جو دور حاضر کے بعض ذہنوں کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ تو ہم ان حضرات سے میراث کو من و عن پیش کرنے کی وجہ سے پیشگی معذرت چاہتے ہیں۔ البتہ کہیں خاص خاص موقعوں پر سخت و ثقیل الفاظ کو آسان الفاظ میں تبدیل کیا جائے گا۔ بعض تکراری باتوں کو علامت گذاری کے ساتھ حذف کیا جائے گا لیکن ہماری سعی یہی رہے گی کہ کسی بھی عنوان سے محسنان اسلام کی اس علمی میراث کے اصل مطالب میں تبدیلی نہ آنے پائے۔

اس مجلہ میں اگرچہ شیعہ دانشوروں ہی کی میراث کو نشر کیا جائے گا لیکن اہل سنت کے ان دانشوروں کے آثار بھی نشر کیے جائیں گے جن میں کسی بھی عنوان سے دفاع اہل بیت علیہم السلام ہوا ہے یا مذہب اہل بیت کی حقانیت کے پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ **ہمارے پیش نظر ہندوستان، پاکستان، کشمیر، بنگلہ دیش کے تمام شیعہ علماء و دیگر دانشوروں** کے حالات اور ان کے آثار ہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ ہر دو مذہب (شیعہ و سنی) کے دانشوروں میں سے کوئی شخص یا کوئی کتاب کسی کی محبوب اور کسی کی مبغوض ہو۔ لیکن مرکز احیائے آثار برصغیر (مآب) سعی کرے گا کہ ان اختلافات کو نظر انداز کر کے ہر اس شخص اور ہر اس کتاب کو ملت کے سامنے پیش کرے۔ جس نے کسی بھی عنوان سے حقیقی تشیع و عزاداری سید الشہداء و صحیح تعلیمات آل محمد علیہم السلام کی پاسبانی کی ہو۔

لہذا اس جگہ پر ہم پیشگی اعلان کر رہے ہیں کہ تشیع کے نام پر باطل فرقوں کے مروجین اور ان کی کتب کو مرکز احیائے آثار برصغیر (مآب) کسی بھی عنوان سے نشر نہیں کرے گا۔

مرکز احیائے آثار برصغیر کے اہداف

مرکز احیائے آثار برصغیر، کا اصلی ہدف برصغیر کی شیعہ علمی میراث کو زندہ کرنا ہے، لیکن اس اصلی ہدف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلیئے مآب مندرجہ ذیل اہداف کو لے کر آگے بڑھے گا:

۱۔ احیائے میراث علمی

شیعیان برصغیر کی دینی علمی، تحقیقی، ادبی اور فرہنگی میراث کا احیاء مندرجہ ذیل طریقوں سے ممکن ہے:

الف) کتابوں کی اشاعت

ب) کتابوں کی Pdf اور CD,s تیار کرنا؛

ج) فوٹو کاپی؛ اصل کتاب کے نہ ملنے کی صورت میں اسکی تصویر حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

د) لائبریری کا قیام؛ جس کے ایک حصے میں صرف برصغیر کے علماء اور دیگر دانشوروں کی مخطوطہ اور مطبوعہ کتابوں کو محفوظ کیا جائے گا۔

۲۔ شیعہ دائرۃ المعارف

اس کتابی مجموعے میں برصغیر کی شیعیت سے مربوط تمام اہم مطالب، اہم شخصیات، کتب، مقامات وغیرہ کو مقالوں کی شکل میں الف، ب یعنی حروف تہجی کی ترتیب سے پیش کیا جاے گا۔

۳۔ کتابوں کی فہرست کی تدوین

اس کتابی مجموعے میں برصغیر کی شیعہ تالیفات، تصنیفات، تراجم (مخطوطات اور مطبوعات) کی توصیفی معرفی کی جائے گی۔ جنکی تعداد ایک تخمینی حد تک چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) ہے۔

۴۔ برصغیر کے شیعہ اکابرین کا تذکرہ

اس کتابی مجموعے میں برصغیر کے شیعہ علماء اور دیگر دانشوروں کے مجموعی حالات زندگی پر روشنی ڈالی جائے گی۔

۵۔ یادنامے

یعنی بعض شیعہ علماء اعلام و دیگر دانشوروں کے حالات زندگی اور ان کی علمی واجتماعی کاوشوں پر مشتمل مستقل کتابیں تحریر کی جائیں گی۔

۶۔ سیمینار

ملت کے بزرگوں اور محسنان اسلام کی یاد میں سیمینار کا انعقاد کرنا۔

۷۔ تراجم کتب

برصغیر کے علمائے اعلام کی عربی اور فارسی کتابوں کا اردو میں اور بعض اردو کتابوں کا فارسی اور عربی میں ترجمہ کیا جائے گا۔

۸۔ نشر مجلہ

"میراث برصغیر" کے عنوان سے شش ماہی مجلہ کی اشاعت و تشہیر۔

۹۔ ویب سایٹ

انٹرنیٹ کے ذریعے ان مطالب کو ساری دنیا تک پہنچایا جائے گا۔ ان شاءاللہ تعالی.

۱۰۔ احیائے قبور

یعنی جن بزرگ شخصیات نے مذہب اہل بیتؑ کی خدمات انجام دی ہیں انکی قبور و مقابر کی تعمیرات کرنا۔

مرکز سے تعاون کے ذرائع

آپ مندرجہ ذیل طریقوں سے اس مرکز کے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں:

مالی تعاون؛

مرکز احیائے آثار برصغیر کسی بھی ادارے اور شخصیت سے منسلک نہیں بلکہ قوم وملت کا درد رکھنے والے مخیر حضرات کے تعاون سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ لہذا قوم وملت کے تمام افراد سے اس کارخیر میں تعاون کی اپیل کی جاتی ہے۔

کتب سے متعلق تعاون؛

یعنی عام کتب کے علاوہ نایاب وکمیاب کتابوں کا قلمی یا مطبوعہ اصل نسخہ یا فوٹو کاپی یاCdsارسال کرکے یا اطلاع دے کر؛

قلمی و دیگر قدیمی کتابوں کے بارے میں فون، ایمیل یا خط کے ذریعے اطلاع دے کر کہ فلاں کتاب فلاں صاحب یا فلاں کتابخانہ میں ہے؛

جن افراد کے پاس قلمی ونادر الوجود(کمیاب)کتابیں ہیں۔ وہ مرکز سے مربوط افراد کو فوٹو لینے کی اجازت دیں؛

جن کتابوں کو یہ مرکز شائع کرنا چاہتا ہے۔ آپ اپنے بزرگوں کے ایصال ثواب کی نیت سے اس کتاب کو شائع کروائیں؛

محققین اور مترجمین مرکز کی انتخابی کتابوں کی تحقیق اور ترجمے میں حتی المقدور تعاون فرماکر؛

اور ملت کے تمام دلسوزافراد سے اپیل ہے کہ براہ کرم، شیعہ دائرۃ المعارف، فہرست کتب اور تذکرہ اکابرین شیعہ سے مربوط کتب کی تدوین کے لئے شیعہ مذہب سے مربوط اطلاع فراہم کرکے اس اہم کام میں مرکز کے ساتھ تعاون فرمائیں، مثلاً

تدوین مقالات:

آپ اپنے علاقے یا دیگر علاقوں سے متعلق مذہب وملت کے موجودہ اور گذشتہ دلسوز شیعہ علمائے کرام، ذاکرین، اطباء، حکماء، مستبصرین(یعنی اپنے سابقہ مذہب کو چھوڑ کر مذہب شیعہ کو قبول کرنے والے حضرات)، مذہب کے خدمت گذار شیعہ وزرا، وقبائلی رؤسا، شیعہ خاندان، شیعہ حکمران، شیعہ اولیائے کرام و دیگر اہم ترین شیعہ شخصیات، کے حالات زندگی اور انکے آثاراوراہم ترین ماتمی انجمنیں، امام بارگاہیں، شیعہ مساجد، شیعہ مدارس، شیعہ کتاب خانے، شیعہ موقوفات، شیعہ قبرستان، خلاصہ: شیعیت سے متعلق ہر قسم کی چھوٹی یا بڑی، ہر زبان اور ہر موضوع سے متعلق کتاب ودیگر مقامات اور موضوعات کے متعلق اطلاعات اور مقالات ارسال کرکے۔

ارسال فوٹو:

مذکورہ بالاعناوین یعنی شیعہ علمائے کرام و دیگر دانشوروں اور مذہب کے دیگر محسنوں کے اور شیعیت سے متعلق مقامات سے مربوط فوٹو، فیلم وغیرہ ارسال کر کے ،یا اطلاع دے کر، خلاصہ کلام یہ کہ برصغیر کی شیعیت سے مربوط ہر قسم کی دقیق اطلاع یا اصل مواد فراہم کر کے آپ اس کار خیر میں حصہ لے سکتے ہیں۔

ضروری اعلان!

آپ جس قسم کی بھی اطلاع یا مواد فراہم کریں اُسے مستند ہونا چاہیے اور اگر آپ کی یہ اطلاع مقالہ کی شکل میں ہو تو مذکورہ بالا کتب میں اسے آپ کے ہی نام سے تحریر کیا جائے گا لہٰذا اسے مستند و مستدل طریقے سے تحریر کرنا ضروری ہے البتہ مرکز اس کو مفید بنانے کے لیے ترمیم و اضافہ کا حق رکھتا ہے اور حتی المقدور چاپ کرنے سے قبل ایک دفعہ صاحب مقالہ کو یہ مقالہ دکھایا جاے گا،اس لیے آپ اطلاع ارسال کرتے وقت اپنا مستقل اور عارضی پتہ اور رابطہ و فون نمبر اور E-mail ضرور تحریر فرمائیں۔ شکریہ

مفارقات الحُسینیه والعثمانیه

تالیف: علامہ الحکیم السید غلام حسین کنتوری
ناشر: مطبع اصلاح کھجوہ ضلع سارن ہند (زیر سرپرستی علامہ سید علی حیدر نقوی)

- تمثال مؤلف کتاب
- مؤلف کے بارے میں
- کتاب کے بارے میں

عَلّامہ حکیم مولانا سیّد غلام حسنین رحمہ کنتوری اعلی اللہ مقامہ

تمثال مبارک مؤلف کتاب "مفارقات الحسینیہؑ والعثمانیہ"

✍ از قلم: طاہر عباس اعوان

مؤلف کے بارے میں

علامہ سید غلام حسنین کنتوری (۷ ربیع الاول ۱۲۴۷ - ۱۳ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ - ق)

ولادت و تعلیم

آپ ۷ ربیع الاول ۱۲۴۷ھ میں بمقام کنتور پیدا ہوئے۔ کنتور میں قرآن ختم کرنے کے بعد ۱۲۵۴ھ میں لکھنو آئے اور شاہی مدرسہ میں ابتدائی کتب پڑھیں، ۱۵ سال کی عمر میں یعنی ۱۲۶۲ھ میں آپ کی شادی جناب علامہ سید مفتی محمد قلی خان مرحوم کی صاحب زادی سے ہوئی۔

پھر آپ کچھ عرصے کے لیے اپنے شہر کنتور تشریف لے گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں دوبارہ لکھنو آئے اور جناب سید احمد علی صاحب محمد آبادی اور آیت اللہ سید العلماء سید حسین علیین مکان اور جناب ممتاز العلماء بن سید العلماء سے تکمیل علوم کی اور جناب علیین مکان نے آپ کو اجازۂ اجتہاد عطا فرمایا۔

علمی و ثقافتی سرگرمیاں

قادر مطلق نے روز اول سے ذہانت و ذکاوت اور جودت آپ کے حصے میں لکھ دی تھی۔ آقای نوگانوی صاحب ''تذکرہ بی بہا'' کے کہنے کے مطابق جناب علامہ کنتوریؒ چونسٹھ علوم کے ماہر تھے۔ مندرجہ ذیل چند موضوعات پر آپکی دسترسی اس قول کی تصدیق کرتی ہے۔

۱۔ آپ کچھ عرصہ مدرسہ سلطانیہ کے داروغہ رہے اور ۱۸۶۱ء میں چوک لکھنؤ کے رجسٹرار ہوگئے۔ یہ کام اس قابلیت سے انجام دیا کہ انعام حاصل کیا۔

۲۔ آپ سمریزم کے ماہر تھے اور اکثر امراض کا علاج اس کے ذریعے سے کرتے تھے۔

۳۔ اسی طرح آپ علم جفر کے بھی ماہر تھے مگر ۱۲۸۴ھ سے چھوڑ دیا۔

۴۔ آپ کانامردی کے خاتمے کانسخہ تیر بہدف تھا۔
۵۔ آپ نے مدقوق اور مستسقی کاعلاج کیااور کامیابی ہوئی۔
۶۔ آپ نے چاندی اور سونا بھی بنایا۔
۷۔ دینی مدرسے کے استاد اور علمی کتب کے مصنف اور مترجم ہونے کے باوجود گھڑی بھی درست کی۔

خدمت دین

مذکورہ بالا موضوعات کے استاد ہونے کے باوجود آپ نے ساری زندگی دین کی خدمت کی اور مذکورہ فنون سے ضرورت کی حد تک معاش زندگی کا استفادہ کیا لیکن دینی خدمت کے بدلے میں کچھ نہ لیا جس کی زندہ مثال وہ زمانہ ہے کہ جب آپ عسرت و تنگدستی میں تھے اور امام جماعت بھی تھے تب بھی نماز پڑھانے کی نوکری نہیں کی بلکہ حکیم ہاشم علی خان صاحب رئیس موہان کے صاحبزادوں کو پڑھانے کی ملازمت کرلی۔ انہیں چیزوں کو دیکھ کر آگرہ کالج کے پرنسپل نے آپ سے ملنے کی خواہش تھی اور جب ملاقات ہوئی تو پرنسپل صاحب آپ سے بہت عزت سے پیش آئے۔

تقریباً۱۲۸۹ھ میں جناب مرحوم نے لکھنؤ میں ایک مدرسہ دینی کی بنیاد ڈالی یہ مدرسہ پہلے جناب ممتاز العلماء کے امام باڑہ میں تھا مگر آپ کی کوشش سے ایسی ترقی کی کہ جناب مولوی سید احمد علی صاحب قبلہ محمد آبادی نے آپ کے اس فعل حسن کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی "آپ کے مساعی جمیلہ کا ہم سب کو شکریہ ادا کرنا چاہیے آپ نے قومی طاقت شیعہ کو معین کردیا اور کیسی کیسی امید ہائے موہومہ ہماری روز بروز بر آتی جاتی ہیں"۔ اس کے علاوہ آپ اکثر اپنے رسائل چھپوا کر مفت تقسیم فرمادیتے تھے۔

مگر افسوس کہ ستم ظریفوں، بدزبانون اور حاسدوں نے اس خادم دین کو بھی نہ چھوڑا لہذا لوگوں نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی جناب پر زبان اعتراض بلند کی جس کی وجہ سے آپ نے فورا مدرسہ سے علیحدگی اختیار کرلی جس کی وجہ سے مدرسہ پھر پستی کی طرف چلا گیا۔

لیکن بعض افاضل اوراعلام نے آپ کو دوبارہ تیار کیا اور آپ پھر مدرسے کے علاج میں متوجہ ہوئے۔ان خدمات کے علاوہ آپکی ایک خدمت یہ بھی ہے کہ آپ اپنے ہی جیب خرچ سے تبلیغ دین کے لیے ایک اخبار ''الاخیار'' نکالتے تھے۔

۱۸۶۲ء میں مفلوج ہوگئے۔خواب دیکھا کہ دو میم انجیل ہاتھ میں لئے کہہ رہی ہیں کہ اگر عیسائی ہو جاؤ تو ابھی صحیح اور سالم ہو جاؤ گے؛یہ سن کر آپ کو ایسا غصہ آیا کہ تن بدن میں آگ لگ گئی،اشتعال سے حرارت عزیزی کے سارا بدن بھیگ اٹھا اور تمام سدہائے بلغمی اعصاب حرکت میں آکر تحصیل ہو گئے آنکھ کھلی تو تمام اعضا درست تھے۔

آقای نوگانوی کے بقول عزائے سید الشہداء میں خاص انہماک تھا۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بمقام بہڑہ سادات ضلع مظفر نگر میں ہونے والا سنی شیعہ مناظرہ آپ ہی کا منعقدہ کیا ہوا تھا اور نحیف بھی شریک تھا۔ غالبا ۱۸۹۵ء کے جلسۂ ندوۃ العلما میں بھی آپ شریک تھے۔اہل سنت نے آپ کی بڑی عزت افزائی کی اورآپ نے بھی دستار نبوی پر اعلیٰ درجے کی تقریر فرمائی۔انجمن جعفریہ مظفر نگر کے پہلے جلسے ۱۳۲۴ھ میں بھی آپ شریک تھے۔شیعہ پرچہ ''کھجوہ ۱۹۰۶ء'' میں ہے کہ آپ کی نگرانی میں میرٹھ میں ایک انجمن بغرض اصلاح مومنین قائم کی گئی اور جس کا ہر اتوار کو وعظ ہوتا تھا۔

پرچۂ مذکورہ اپریل ۱۹۰۸ء میں ہے کہ ۷ محرم ۱۳۲۶ھ کو آپ نے تربت کا سرخ ہوجانا اور آسمان سے خون برسنا وغیرہ میرٹھ میں ممبر پر پڑھا،کسی کو شک ہوا تو گیارہ بجے رات کے امام باڑہ کے پانچ عَلَم سرخ ہوگئے درمیان والا علم بہت سرخ تھا؛دو بجے تک یہی حالت رہی اور ۷،۸،۹، محرم تک یہی کیفیت ہوتی رہی،بہت لوگوں نے دیکھا۔

ذریعۂ معاش

اسی گھڑی سازی اور صابون سازی اور حکمت ،کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا اور نماز پڑھاتے تھے لیکن تنخواہ وصول نہیں کرتے تھے اور نیل بنانے کا کارخانہ ککرولی ضلع نگر میں کھولا مگر اس میں خسارہ ہوا۔راج جودھپور،بھرتپور،آگرہ،گوالیار،کشمیر،ضلع میرٹھ،مظفر نگر وغیرہ میں آپ نے اپنے مطب اور ہدایات

کے فوائد کے چشمے بہادیئے اورامراض مزمنہ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا نیز اپنی کتب کے علاوہ جناب ممتاز العلماء کی تفسیر "ینابیع الانوار" بھی چھاپنی شروع کی۔

آثار

آپ کی تصانیف یہ ہیں:

ا۔حواشی مغنی اللبیب وحواشی شرح کبیر ؛(آیہ مبارکہ:﴿اینما تولوافثم وجه الله...﴾؛پر ایک پادری صاحب نے اعتراض کیا تھاسلطان العلماء نے اس کے جواب پر آپ کو مامور کیااور آپنے ایسارسالہ لکھا کہ جناب سلطان العلماء نے اجازۂ اجتہاد دیا۔)

۲۔رسالہ در اشکال وضو مشتمل بر(۲۰۷)صور؛

۳۔رسالہ تفنی فی القرآن؛

۴۔شرح اعجاز خسروی؛(منشی نولکشور صاحب کے ایما پر تحریر فرمائی اس کا پہلا حصہ جناب مولوی سید اعجاز حسین صاحب مرحوم نے ملاحظہ فرماکر کہا کہ خدا تم کو حاسدوں کی نظر سے بچائے۔)

۵۔رسالہ ٔشیخ الرئیس؛(عمل اکسیر امض عربی کا اردو ترجمہ۔)

۶۔رسالہ ٔشیخ اکسیر احمر عربی کا اردو ترجمہ؛(سرسید احمد خاں صاحب کے اخبار تہذیب الاخلاق کا جواب۔)

۷۔رسالہ ٔشواہد(اردو یعنی جو الفاظ اردو میں بولے جاتے ہیں ان کی تذکیر و تانیث کا قاعدہ اور شعرائے ہند سے انکی سند۔)

۸۔رسالہ نورالعینین فی شرح حدیث ابطال ومرویہ بالعین(جو کافی میں حدیث ہے۔)

۹۔شرح زیارت ناحیہ ٔ مقدسہ؛(حسبِ فرمائیشِ حضرت واجد علی شاہ مرحوم مغفور سلطان اودھ بوساطت جناب نواب رفعتہ الدولہ بہادر اس کو سن کر جناب قائمۃ الدین نے بھی فرمایا تھا کہ ایسے دقائق حقائق آج تک ہماری سماعت سے نہیں گذرے۔)

۱۰۔ترجمہ تشخیص جالینوس فارسی

۱۱۔مائتین در مقتل حسینؑ ۳جلد

۱۲۔انتصار الاسلام در سہ جلد(غیر مسلمین کے جوابات)

۱۳۔ انعیہ اردو ترجمہ العین
۱۴۔ زینبیہ در حال ازدواج رسول درر د نصاری و آریا
۱۵۔ مفارقات حسینیہ وعثمانیہ
۱۶۔ ذوالجناحیئہ حسنیہ
۱۷۔ حسینیہؑ قرآنیہ
۱۸۔ معراجیہؑ قرآنیہ
۱۹۔ اردو ترجمہ قانون شیخ
۲۰۔ اردو ترجمہ کامل الصناعہ
۲۱۔ ماہنامہ رسالہ تہافتہ الفلاسفہ

یہ مجلہ برسوں جاری رہا۔ اسکے علاوہ آپ کے مضامین اصلاح، شیعہ کھجوہ، اور اخبار امامیہ لکھنؤ و اثنا عشری دہلی، و سرمہ روزگار آگرہ وغیرہ جیسے رسالوں میں طبع ہوتے تھے۔

ان تالیفات کی فہرست لکھنے کے بعد صاحب تذکرۂ بی بہا تحریر فرماتے ہیں کہ اس پیری (بڑھاپے) میں آپ کا زور قلم جوانوں کو گھٹاتا تھا، آپ چھوٹے سے مولوی کو بھی اپنا قوت بازو سمجھتے تھے اس راقم الحروف سے ایسی محبت رکھتے تھے کہ جیسے باپ بیٹے سے محبت رکھتا ہے آپ اکثر اپنے رسائل چھپوا کر مفت تقسیم فرمادیتے تھے میرے یہاں آپ کی تصانیف آپ ہی کا عطیہ ہے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

تلامذہ

آپ کے چند تلامذہ کے نام یہ ہیں:۔
آپ کے فرزند مولوی تصدق حسین صاحب
دوسرے فرزند مولوی محمد علی صاحب مرحوم
جناب فخر الحکماء سید علی اظہر
شریف العلماء سید شریف حسین
حکیم مہدی علی صاحب کنتوری

مولوی سید آغا علی صاحب جلالوی مدرس وکٹوریہ کالج آگرہ
مولوی محمد امین صاحب ساکن کھجوہ ضلع سارن
مولوی حبیب حسین صاحب ساکن وہولڑی ومدرس مدرسہ منصبیہ میرٹھ

وفات

بالآخر اس خادم دین ومذہب نے ۱۷دسمبر ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو فیض آباد میں انتقال فرمایا اور لاش کنتور میں لا کر دفن کی۔ جنتری ہندی میں لکھا ہے کہ اس شب کو چاند گرہن ہوا جو بعض جگہ ہوا اور بعض جگہ نظر نہ آیا اور اخبار مشرق گورکھپور ۹ جنوری ۱۹۱۹ء میں جناب ڈپٹی سید محمد ہاشم علی صاحب رئیس جونپور کی یہ تاریخ لکھی ہے:

حیف از ظلم تعدی و جفائی چرخ پیر — سخنف شد ماہ دین عالم ہمہ بی نور شد
عالم زین عالم فانی شدہ سوئی جنان — دل ہمہ مجروح گشت وزخم دل ناسور شد
خالی شد ہندوستان از عالم معجز بیان — در کتاب و در مجالس وصفت او مذکور شد
کردہ رحلت از جہان و یافت جائش درجنان — سال فصلی وفاتش ظاہر از مغفور شد

از لب کنتور نیز آمد ند از بہر سال
زیب ایوان جنان علامہ کنتور شد
باز بشنود از لب جمہور بہر سال او

وائی پنہان از نگہ علامہ
کنتور شد

شیعہ کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۱۹ء مقام آگرہ میں یہ ریزولیشن پاس ہوا کہ یہ کانفرنس جناب علامہ مولانا سید غلام حسنین صاحب کنتوری کی وفات حسرت آیات پر افسوس ظاہر کرتی ہے اور ان کے پس ماندگان سے ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔[1]

[1] ۔ تذکرہ بی بہاء ص ۲۸۰ چاپ جدید؛ سفر نامہ علامہ کنتوری؛ مرتبہ حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی، ۸۸ صفحات؛ مطلع انوار ص ۳۸۶۔

متن کتاب

(آغازِ سخن)

الحمد الله الذی میز من عباده الصالحین والطالحین بعلامات لا یشبه احدالفریقین منهم بالاخر ثم بین لنا انبیائه ولا سیما نبینا خاتم الانبیاء ایاها ببیان واضح وتبیان ظاهر، صلوة الله وسلامه علیهم وعلیه واله صلوة تعد لنا في دارالکرامه مثوبات ومفاخر وبعد

جمیع حمد ایسے خدا کے واسطے ہیں جس نے اپنے نیک بندوں اور بد کردار بندوں میں تمیز دی ایسی علامت سے کہ ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں ہوسکتا پھر ان آیات کو انبیائے کرام علیہم السلام خصوصا ہمارے نبی خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم، نے ہم سے بیان فرمایاواضح طور سے اور ظاہر طریق سے، درود خدا سب انبیاء علیہم السلام پر ہو، ہمارے نبی ﷺ پر اور ان کی آلؑ پر ایسادرود جو ہمارے واسطے دار آخرت میں ثوابہائے کثیر اور مفاخر کا ذخیرہ جمع کردے۔

بعد حمد اور صلوۃ کے، کہتا ہے بندۂ فقیر محتاج اپنے اس پروردگار کا جو سچ مچ غنی ہے غلام حسنین کنتوری کہ مجھے اس رسالہ کے لکھنے پر بعض افراد کے اس قول نے کشاں کشاں آمادہ کیا جو حضرت عثمان کے حق میں کہتے ہیں کہ، حضرت عثمان ذی النورین تھے اور غنی تھے اور شہید بھی ہوئے۔ یہ تینوں اوصاف ایسے ہیں جو کسی صحابی یا اہل بیت نبی میں جمع نہیں ہوئے۔ حضرت عثمان ذی النورین تو اس وجہ سے ہوئے کہ دو دختر نبی کے یہ شوہر تھے۔

کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ ان دونوں دختروں کو، کیوں یہ لوگ دو نور کہتے ہیں؟ کیاجناب رسول صلی اللہ علیہ وألہ وسلم نے یہ لقب ان کو دیاہے؟ یاان لوگوں نے یہ لقب دونوں دختروں کو دیاہے جنہوں نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنایا؟

حضرت عثمان کا غنی ہونا اس وجہ سے کہ اپنے کنبہ اور قبیلہ کو زیادہ درہم دینار دیتے تھے فقط۔ پھر چونکہ یہ دادو دہش مسلمانوں کے مال سے ان کے حق تلفی کر کے ہوتی تھی لہذا بعض فُضلا سے میں نے یہ تاویل سنی ہے کہ حضرت حضرت عثمان کو اکسیر بنانا آتا تھا (اچھی کہی) شہید ہونا حضرت عثمان کا تو یہ حیلہ اس واسطے کیا جاتا ہے کہ ان کا خاتمہ بالخیر ہونا ثابت ہو کہ جو بدگمانی ان سے لوگ کرتے ہیں اور چند برائیاں ان کی ثابت کرتے ہیں ان کا رد اور ابطال ہو جائے۔

مجھے قسم ہے تمہاری جان کی یہ لوگ اپنی مستی اور بیہوشی میں سرگردان ہیں۔ اس لئے کہ خدائے عادل نے بغرض تمیز حق وباطل کے اسی قتل حضرت عثمان کو پوری دلیل اور برہان کے ظاہر کر دیا ہے کہ اس قتل سے ان کی برائی، بدانجامی، خرابی عاقبت ثابت ہو گئی۔ خدا نے ان کے مریدوں کی دروغ گوئی کو باطل کر دیا اور جو مباہات اور فخر کیا کرتے ہیں سب کو مٹا دیا۔ پھر چونکہ ان امور کا اعلان نتائج عظیمہ پر شامل ہے اور شبہۂ زیادتی مرتبہ اور شبہۂ مساوات، حضرت عثمان کا اہل بیت نبی سے، خاص کر امام حسینؑ، کی مساعات امر شبہات میں باطل کرتا ہے۔

لہذا یہ رسالہ خاص ہم نے اسی غرض سے لکھا ہے اور غرض یہی ہے کہ اس رسالہ میں ہم قتل حضرت عثمان اور شہادت امام حسینؑ کا فرق بیان کریں گے۔ اور میں ان امور کا ذکر اس رسالہ میں نہ کروں گا کہ جن میں صحیح شبہات کا پڑ جانا بلا تخصیص اعتقاد مذہبی کے ہو سکتا ہے اور ان شبہات کی وجہ سے وہ روایات موضوع کہی جاتی ہیں، بلکہ میں ان باتوں کا ذکر کروں گا، جن کو تاریخ صحیح لکھ رہی ہے، روزِ قتل جو امور ان دونوں مقتولین کے حادث ہوئے اور روزانہ حادث ہوتے ہیں، جن کو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ہم کو لائق ہے کہ پہلے امور مشارکہ کو بیان کریں اور اس کے بعد مفارقات، کو لکھیں کہ جنہیں وہ مشارکات سمجھ رہے ہیں (نہ درحقیقت) اور یہ گمان اور ان کا براہ جہالت ہے، یا تجاہل عارفانہ کرتے ہیں۔

(سات عدد مشترکات)

(۱۔ خلافت؛ ۲۔ مظلومیت؛ ۳۔ پیاس؛ ۴۔ اہل وعیال کے سامنے قتل؛ ۷،۶،۵۔ غسل، کفن اور دفن سے منع۔)

پہلا امر مشترک یہ ہے کہ دونوں خلیفۂ رسولؐ تھے:

ایک فرقہ کے نزدیک، جو حضرت عثمان کو تیسرا خلیفہ اور امام حسینؑ کو چھٹا خلیفہ شمار کرتا ہے۔ لیکن حضرت عثمان کا تیسرا خلیفہ ہونا، اس طرح پر کہ آدمیوں نے اپنی رای اور اختیار سے ان کو خلیفہ بنایا، تو یہ ایسی بات ہے جس سے کوئی فرقہ انکار کر نہیں سکتا۔ جس طرح اس کا بھی انکار کوئی فرقہ نہیں کر سکتا ہے، کہ یہ اختیار خلیفہ بنانے کا آدمیوں کو خدا اور رسول کا حکم اس پر نہیں ہے۔ لیکن امام حسینؑ کا چھٹا خلیفہ ہونا، اس طرح کہ آدمیوں نے اپنی تجویز سے ان کو خلیفہ بنایا ہو تو چونکہ ان کی خلافت کا انتظام نہیں ہوا یعنی اجماع اور قہر اور غلبہ جو شرط ضروری اس خلافت کی ہے وہ پوری نہیں ہوئی پھر کیونکر آپ چھٹے خلیفہ ہو سکتے ہیں؟ اور ان خلفاء میں ان کا شمار ہو سکتا ہے جو آدمیوں کے بنائے ہوئے خلفا گزرے ہیں؟

ہاں! امام حسینؑ کا تیسرا خلیفہ منصوص من اللہ، زبانی ہمارے نبی کے ہونا اور نیز ان کو ان دلائل کا عطا کرنا خدا کا، جن سے سچے خلیفہ نبی کی شناخت ہوتی ہے، یہ بھی ایسی بات ہے جس سے کوئی آدمی انکار نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ دشمن خدا اور رسول نہ ہو اور محض برائے عناد انکار نہ کرتا ہو۔ جب تیسرے خلیفہ کی شرکت باطل ہو چکی۔ تو اب ثابت ہو گیا کہ امور مشترکہ میں سے خلافت دونوں میں نہیں ہے، بلکہ بڑا فرق بین ان دونوں میں اسی امر خلافت کا ہے، جس پر اور سب امور متفرع ہوئے ہیں اور چونکہ ہم نے عہد کر لیا ہے ابتدا میں اسی رسالہ کے کہ جن روایات میں شبہہ پڑتا ہے ان کو ذکر نہ کریں لہذا ان روایات کو جو کتب سماویہ میں بہ نسبت اسی واقعہ کے ہیں ان کو نہ لکھیں بلکہ اہل ہنود کی کتب کی بھی کوئی روایت درج نہ کریں۔

اب رہے (دیگر) مشترک امور

ان کا یہ بیان ہے کہ حضرت عثمان بھی (۲۔) مظلوم تھے اور (۳۔) پیاسے (۴۔) اپنے اہل و عیال کے سامنے قتل کئے گئے اور (۵۔) دفن اور (۶۔) غسل اور (۷۔) کفن سے منع کئے گئے، زمین پر ان کی لاش پڑی رہی اور یہی حال امام حسینؑ کا ہے۔ یہ سب چھ ۶ باتیں ہیں۔ اب ہم ان کو ضرور بیان کریں گے کہ ان سب میں حضرت عثمان اور امام حسین شریک ہیں یا کہ بالکل جدا جدا ہیں۔

حضرت عثمان کا مظلوم ہونا اور اس میں یہ دیکھو ان پر کس نے ظلم کیا؟ اور کیوں یہ ظلم کیا؟ اور یہ بھی دیکھو کہ ابتدا ظلم کی قاتلان حضرت عثمان سے ہوئی؟ یا انہوں نے ان مظالم کا انتقام لیا جو حضرت عثمان سے صادر ہوئے تھے؟ اور دراصل وہی لوگ مظلوم تھے، یہ بھی دیکھو کہ وہ قاتل کون کون لوگ تھے؟ جن میں صحابہ جلیل اور ثقہ عادل بقول اہلسنت ایسے شامل تھے (بلکہ بانی) جن کی فضیلیت کا کوئی سنی انکار ہی نہیں کر سکتا اور نہ ان کی دیانت اور بزرگی سے انکار ہو سکتا ہے۔ قاتلان حضرت عثمان کے نام اور شرکا اور معاونین کے بموجب تصریح ثقاۃ علماء اہلسنت کے پڑھو جن میں ابوالحسن مازنی ایسے بزرگ جلیل الشان تھے اور وہ لوگ بھی جو بیعتِ عقبہ اور جنگ بدر میں حاضر تھے۔

چنانچہ کتاب استیعاب ابن عبد البر میں لکھا ہے اور عبد اللہ بن عمر (پسر خلیفہ دوم) بھی شریکِ قتل تھے جیسا کہ واقدی امام تاریخ اہل سنت نے لکھا ہے، عبد اللہ کا قول یہ ہے: قسم بخدا کہ ہم سب طالبان قصاص میں کوئی ایسا نہ تھا جو قاتل حضرت عثمان نہ ہو یا خاذل یعنی تارک نصرت حضرت عثمان نہ ہو۔ تم کو لازم ہے کتاب مستطاب "تشیید المطاعن" کو دیکھو کہ وہ اسی بحث خاص میں لکھی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان کا مظلوم ہونا اس کو تاریخ باطل کر رہی ہے اور صحابہ عدول کا شریک ان کے قتل میں ہونا، یہ بھی ان کے مظلوم نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اب تو ثابت ہو گیا کہ حضرت عثمان اپنے مظالم شدیدہ کی سزا میں قتل کئے گئے اور وہ بے گناہ نہ تھے بلکہ واجب القتل تھے۔

(ردشبہات)

چند جھوٹی روایات جو حضرت عثمان کے قتل ہونے کی اور ان کے جنازے پر فرشتوں کے نماز پڑھنے کی جو ہمارے نبیؐ کی طرف منسوب کرتے ہیں، سب موضوع ہیں اور بنی امیہ کی گھڑی ہوئی ہیں جیسا کہ محققین اہل سنت نے بتصریح اس کو لکھ دیا ہے اور حضرت عثمان کے مقتول ہونے پر محض خبر دہیٔ رسولؐ اور ان کے قاتلوں کی بدحالی اور بدانجامی کی خبر نہ دینے اور نہ اس قتل کی کوئی عظمت بیان فرمائی، نہ قاتلوں کا معذب اور مقہور ہونا، دنیا اور آخرت میں اس کا کچھ ذکر نہ کرنا یہ حضرت عثمان کو کیا نفع دے سکتا ہے؟

لیکن واقعہ حرۃ اور قتل اہل مدینہ کا جو یزید کی فوج کے ہاتھ سے گذرا، یہ سب کچھ بعد شہادت امام حسینؑ کے تھا، حضرت عثمان کے قتل سے اس کو کیا تعلق ہے اور نہ کسی روایت میں حضرت عثمان کے مجازات سے ہونا وارد ہوا ہے اور کیونکہ یہ واقعہ مجازات قتل حضرت عثمان سے ہو سکتا ہے حالانکہ قاتلان حضرت عثمان وہی صحابہ بدری ہیں جن کو عموماً سنیوں کے اعتقاد کے مطابق جنت کی بشارت ہو چکی ہے پھر اگر ان کے معذب ہونے کے قائل ہوں تو وہ اجماع باطل ہو گا جو ان کے بہشتی ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ مگر اینکہ اس کے قائل ہوں کہ قاتل حضرت عثمان اور مقتول یعنی حضرت عثمان دونوں بہشتی ہیں جیسا کہ سنیوں کا شعار ہے (میرے دونوں میٹھے) پھر جب ہم نے حضرت عثمان کے مظلوم اور بے گناہ مارے جانے کو باطل کر دیا، اب ظاہر ہو گیا کہ اس امر میں بھی مشارکت ان کو امام حسین سے نہیں ہے۔ ہم آئندہ ان مفارقات کا ذکر کریں گے کہ جن سے معلوم ہو گا کہ ان دونوں مقتولین میں کوئی ایسی نسبت یا شرکت نہیں ہے کہ جس سے مقتول حضرت عثمان کی کرامت ثابت ہو۔

اب رہے ہمارے حسینؑ مظلوم: کیا کسی منصف کو تم دیکھتے ہو جو آپ کے مظلوم ہونے میں شک اور شبہ کرے؟ یا آپ کے بے گناہ شہید ہونے میں اس کو شک ہو؟ اور کیا علماء سیر میں کسی کو تم پاتے ہو جو ہمارے نبیؐ سے امام حسینؑ کا بے جرم مقتول ہونا روایت نہ کرتا ہو؟ بلکہ شہادت امام حسین کے اس ہولناک واقعے کو، تم ان کتب سماویہ میں بھی مذکور پاؤ گے جو قبل بعثت ہمارے نبیؐ کے پیشین گوئی کر رہی ہیں۔ اسی طرح ہمارا قرآن بھی واقعہ شہادت اور سزا اور جزا جو کچھ اس کے متعلق ہے سب کو ابتدائے ولادت امام حسینؑ سے بیان کر رہا ہے، جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ حسینیہ قرآنیہ میں بخوبی اس کو لکھ دیا ہے (پڑھو) یہ قصہ ہائے شہادت اور روایات، ان کا ذکر حد تواتر کو پہنچ گیا ہے اور مؤرخین اسلام کی تخصیص نہ رہی اور یہی کھلا ہوا فرق ہے۔

روایات شہادت امام حسینؑ کے صحیح ہونے اور حضرت عثمان کے قتل کی ان روایات کے غلط ہونے میں، جن سے کوئی بزرگی ان کی ثابت ہو ایضاً ایک اور طریقہ روایات کی صحت اور غلطی جانچنے کا بعد اس طریق کے جو ہم نے لکھا ہے، یہ بھی ہے کہ اس واقعہ کے وقوع کے بعد نتائج کیا ظاہر ہوئے جن سے

عظمت یا برائی، خرابی اس واقعہ کی ثابت ہو۔ اب تم کو لازم ہے ان روایات کو پڑھو جو اگلے پچھلے مؤرخین ہر مذہب کے ان دونوں مقتولوں کے بارے میں روایت کر رہے ہیں۔ بس یہی یادآوری تم کو حق اور باطل کے فرق کرنے میں کافی ہو گی۔

روایات سے بڑھ کر تم کو مشاہدہ ان کرامات اور معجزات کا جو آج تک امام حسینؑ کے ظاہر ہو رہے ہیں، ان کا ظہور برابر رہے گا، جب تک مشیت الٰہی جاری ہے اور حضرت عثمان کے روز قتل سے لے کر آج تک کوئی کرامت ظاہر نہی ہوئی۔ اس کے دیکھنے اور سوچنے سے امر حق کی شناخت اور بھی بخوبی ہوتی ہے جس سے بڑھ کر اور کونسی بات ہے۔ مجملاً ہم بیان کرتے ہیں کہ خلیفہ نبی اگر خدا کا پسندیدہ ہو اور اس کی عزت اور آبرو پیش خدا بھی ہو پھر وہ قتل کیا جائے یا شہید ہو سب سے پہلے خدا پر واجب ہے کہ اس کا خون جو بہایا گیا ہے اور اس کو ذلت اور خواری سے بچائے اور اس خون میں جہاں پر گرا ہو، یا کسی چیز میں بھر گیا ہو کسی قسم کی بدبو نہ آنے پائے، نہ اور کسی قسم کی خرابی پیدا ہو کہ جس کے دیکھنے اور سننے سے لوگ نفرت کریں۔ کیا تم کو پوری خبر ہے کہ خون حضرت عثمان کا کیا حال تھا؟ اور کیسی کراہت لوگوں کو اس کی بدبو سے پیدا ہوئی تھی؟ مجھے اس خرابی کو طول تقریر سے لکھنا منظور نہیں ہے۔

رہا خون امام حسینؑ کا یہ وہ خون ہے جو تمہارے نبیؐ کے خون سے پیدا ہوا ہے، اس کو خدا نے چند خواص عجیبہ عطا فرمائے ہیں، ان میں ایک بڑی صفت یہ ہے کہ جس وقت یہ خون زمین پر گرے اس زمین کی مٹی کسی جگہ پر کیوں نہ ہو سرخ ہو جائے بلکہ خون تازہ ہو جائے چنانچہ تم نے حدیث جناب ام سلمہ کی سنی ہے کہ اس میں اسی زمین کی مٹی لائی ہوئی جبرائیل کی تھی جس کو جناب رسول نے ام سلمہ کے سپرد فرمایا تھا اور بروقت قتل اور خونریزی امام حسینؑ کے وہ مٹی خون تازہ ہو کر شیشہ میں جوش مارنے لگی اور یہ صفت اس خاک پاک سے آج تک زائل نہیں ہوئی بلکہ سجدہ گاہ اور دانہ تسبیح کہ جن میں کسی قدر شائبہ یا آمیزش اس کی ہے ، بروز عاشورہ اب بھی سرخ ہو جاتی ہے، چنانچہ ہمارے ملک ہند میں چند مقامات پر ایسی تسبیح موجود ہے۔

یہ بھی صفت خون امام حسینؑ میں خدا نے دی تھی کہ جس وقت خنجر ظلم سے وہ خون بہایا جائے آسمان سے خون برسے اور جو پتھر اور ڈھیلا اٹھایا جائے، اس کے نیچے خون بھرا ہوا پایا جائے، یہ دونوں اوصاف تو

چشم دید کی قسم سے ہیں ان کا تو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر کیا خون حضرت عثمان میں کسی نے ان دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت پائی ہے؟ ایضاً یہ بھی خاصیت اس خون میں خدا نے دی تھی کہ جس کپڑے میں یہ خون لگ جائے اور جب اس کو کوئی شقی جسم اطہر امام سے اتار کر پہنے اس کو مرض بالخورہ کا یا اور کوئی مرض لاحق ہو جیسا کہ اسحق بن حبثوہ ملعون، کو آپ کے خون آلودہ کرتہ کے پہننے سے ہوا۔ یا دوسرا شقی جس نے عمامہ سحاب کو آپکے سر اقدس سے اتار کر اپنے سر پر باندھا۔ یہ بھی صفت دیکھنے میں آگئی ہے اور خون حضرت عثمان میں اس کا بھی کچھ شائبہ نہیں ہے۔

لیکن وہ خواص جو ہمارے دیکھنے کے قابل نہ تھے، ہاں روایات صحیحہ سے ہم کو معلوم ہوئے ہیں ایک ان میں یہ بھی ہیں کہ ایک فرشتہ آسمان سے اترا اور ایک شیشہ میں خون امام حسینؑ اور دوسرے شیشہ میں خون شہدائے کربلا کا بھر کر آسمان پر لے گیا۔ ایضاً بعض معتمد علمائے اہلسنت نے جیسے احمد اور ابن بطہ نے روایت کی ہے کہ حالت خواب میں رسول اللہؐ نے ایک شخص کی آنکھ میں ایک سلائی خون سے ڈبو کر پھیر دی وہ شخص اندھا ہو گیا جو قبیلہ رَیاحِ قاضی کے اندھوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہی وہ خواص ہیں خون امام حسینؑ کے جو پوری دلالت کرتے ہیں کہ وہ جناب پیش خدا جلیل القدر اور بزرگ مرتبہ تھے۔ جب ان میں سے کوئی بات بھی ہم خون عثمان میں نہیں پاتے پھر کیونکر ہم دونوں کے شرکتِ مراتب کے قائل ہوں؟ اور جس طرح خون کی حفاظت واجب ہے اسی طرح لاش کی بھی حفاظت واجب ہے کہ سڑ نہ جائے درندے اسے نہ پھاڑیں، اس کے گوشت کو درندوں پر حرام کر دے بلکہ خدائے برتر درندوں کو حکم دے کہ اس لاش کی حفاظت کریں جو پارہ پارہ ہو کر زمین گرم پر پڑی ہو اور ایک نور سے اس کو ڈھانپ دے اور اس لاش سے بوئے مشک اور عنبر کی دور دور تک پھیلے جس وقت ہوا کسی رخ کی چلے بدلے عفونت اور بدبو کے۔

اب آؤ اور دیکھو کہ امور مذکورہ بالا میں سے کون کون امر واقع ہوا قتل عثمان کے بعد؟ اور کون کون سا واقع ہوا ہے بعد شہادت امام حسینؑ کے؟ اسی واقعہ جسد کے حالات کے معلوم کرنے سے تم پر خواری اور عزت کا پورا پتا لگ جائے گا اور کچھ شبہ باقی نہ رہے گا۔

اب ہم کہتے ہیں جب حضرت عثمان کو اجلۂ صحابہ نے قتل کرایاان کی لاش اور ان کے غلاموں کی اور ساتھیوں کی لاش گھورے پر ڈال دی جو سڑی ہوئی جگہ ہوتی ہے، ان لاشوں کو آنے جانے والے سب دیکھتے تھے جو ادھر سے گذرتا تھا۔ لاشیں تین روز تک وہیں مزبلون پر پڑی رہیں اور ایک ٹانگ عثمان کی مدینہ کے کتوں نے کھائی۔ (۱)

اسی طرح بعد دفن عثمان (اور مجھے نہیں ثابت ہے کس جگہ ہوااور کس نے کیا) جب نائلہ، زوجۂ عثمان، نے ان کے غلام وغیرہ کی لاشوں کو دفن کرنے کا حکم دیا مصری لوگ سختی سے مانع ہوئے اور نہ ہونے دیا، تب ان کی لاشوں کو شاہراہ پر بے غسل اور کفن کے ڈال دیا۔ کہ بھیڑیئے اور کتوں نے ان کو کھایا۔ (۲)

ناظرین کو قسم ہے خدا کی، دیکھیں اور سوچیں اور انصاف کریں کہ جس لاش کے بعض اعضا کو کتے کھائیں جو نجس تریں مخلوقات سے ہیں؛ کیا اسی لاش پر ملائکۂ رحمت نماز پڑھیں گیں جو پاک اور پاکیزہ خلقت سے ہیں؟ یہ بھی دیکھو کہ نماز جنازہ اس وقت ادا کی جاتی ہے جب میت کو غسل دے لیں کہ نجاست موت کی دور ہو جائے۔ یہ جھوٹا بقول مشہور دروغگو راحافظہ نباشد بھول گیا اور یہ روایت اس نے نہ بنائی کہ پہلے فرشتوں نے لاشہ حضرت عثمان کو آب بہشت سے غسل میت دیا، اس کے بعد نماز پڑھی اگر ایسا کرتا تو شاید کوئی اس کی بیجا طرفداری کو تسلیم بھی کرتا۔

مگر خدا کی مشیت پر کون غالب آسکتا ہے۔ لہٰذا یہ مفتری مبہوت ہو گیا۔ ایضاً کسی اور نے یہ بھی روایت نہ کی کہ حضرت عثمان کی لاش کو کسی ان کے پیروکار نے غسل میت دے کر پاک کر دیا (حالانکہ اب دو قسم کی نجاست اس میں تھی ایک تو میت ہونے کی اور دوم کتوں کے چبانے کی پھر ملائکہ کا غسل دینا کیسا؟ اب یہ عذر بھی اگر کریں کہ شہید کو غسل نہیں دیا جاتا ہے ساقط ہو گیا اس لئے کہ نجاست خارجیہ سے پاک کرنا تو ضرور ہے۔

۱۔ دیکھو ترجمہ فارسی تاریخ اعثم کوفی صفحہ ۱۵۹ جو بمبئی میں چھپا ہے ایضاً قاسم خوارزمی نے شرح دیوان ابوالعلا، میں واقدی سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

۲۔ دیکھو جلد دوم تاریخ روضۃ الصفا صفحہ ۲۳۴۔

سو بیچارہ حضرت عثمان کو یہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ رہے غلام اور دیگر رفقاء حضرت عثمان جو مارے گئے تھے وہ تو حضرت عثمان سے بدتر حالت میں رہے جیسا کہ اوپر ہم لکھ چکے۔ آیا جس کا انجام ایسا خراب ہو پھر کسی کو لائق ہے کہ اس کی ایسی بدانجامی دیکھ کر خواہ سن کر افتخار کرے؟ اور فخریہ اس کے حالات کو بیان کرے؟

اب ہم حالاتِ جسدِ مبارک امام حسینؑ اور آپ کے سر اقدس کا نیز اجساد اور سرہائے شہدائے کربلا کا حال بیان کرنا چاہتے ہیں۔

مفارقات

پہلا فرق:

یہی ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب جنگل ویران میں زمین پاک صاف پر شہید ہوئے جس میں کوئی گھور میلا، کوڑا کرکٹ، نہ تھا اور نہ کوئی چیز بدبو کی تھی کہ یہ اجساد اس پر ڈالے جاتے۔

دوسرا فرق:

جو معجزۂ عظیمہ پر شامل ہے وہ یہ کہ جب ان بدکاروں کا بحکم عمر بن سعد ارادہ ہوا کہ لاش اطہر پر گھوڑے دوڑائیں تو خدا نے ایک شیر کو حکم دیا کہ لاشہ کو اپنی گود میں لے کر محافظت کرے جیسا کہ روایت کافی میں فضہ سے منقول ہے کہ جناب زینبؑ نے فرمایا جلدی جا فضہ، اس شیر سے ان بدکاروں کے ارادے کو بیان کر۔ فضہ اس جگہ گئیں جہاں وہ شیر بیٹھا تھا اور شیر سے ارادۂ اشرار کو بیان کیا۔ چنانچہ ان کے ہمراہ شیر آیا اور لاش اطہر کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ ملاعنہ ڈر گئے اور اپنے ارادہ سے باز رہے۔ اور عمر بن سعد نے کہا مخفی رکھو اس بات کو یہ فتنہ ہے۔

یہ جو ہم نے کہا کہ اس شیر کو خدا نے اس خدمت کی بجاآوری کا حکم دیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ شیر کو فضہ کا کلام سمجھنا اور اس کے ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے جانا، پھر لاشۂ امام حسینؑ کو پہچان لینا، یہ سب امور خارق عادات سے ہیں کہ بدون حکم الٰہی کے واقع نہیں ہوسکتے۔

بلکہ اس مقام خاص میں فوراً شیر کا اسی وقت خاص میں ہونا اور فضہ کا اس پر مطلع ہونا (حالانکہ اصحاب اور اعزہ امام کسی کو اس کی موجودگی کی خبر نہ تھی) یہ بھی تائید ہمارے قول کی کرتا ہے۔ بلکہ میرا گمان تو یہ

ہے کہ یہ شیر درندہ بھی نہ تھا۔ چنانچہ روایت کاشتکار سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ شیر اس کے پاس سے ہو کر گزرا اور اس کو نہ پھاڑا اور لاشہ پر شب کو اس طرح روتا تھا جیسے عورت پسرِ مردہ پر روتی ہے۔ تا اینکہ اس کی نسبت بغلط گمان ہوا کہ جناب امیر اپنی شکل بدل آتے تھے نعوذ باللہ منہ۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ شیر نے لاشۂ امام حسینؑ کی حفاظت کی اور کتوں نے حضرت عثمان کی ٹانگ نوچ کر کھائی۔ بہ بین تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا۔ رہا دو روز تک آپ کی لاش اطہر کا دفن نہ ہونا یہ کسی روکنے والے کی روک ٹوک سے مثل واقعہ حضرت عثمان کے نہ تھا۔ اس لئے کہ لشکر عمر بن سعد نے عاشور کا دن گزار کر شب یازدہم کو کوچ کر دیا۔ ڈر تھا کہ شبخون نہ پڑے، خواہ گیارہویں تاریخ صبح کو اس لئے کہ بارہویں تاریخ صبح کو داخل کوفہ ہوے۔ پھر کون تھا جو لاشہای مطہرہ کو دفن سے منع کرتا؟ اور کوئی روایت بھی ایسی ہم کو نہیں پہونچی کہ عمر سعد نے کچھ لوگ ایسے وہاں چھوڑ دئے ہوں کہ دفن شہداء کو منع کریں۔

یہ جو محض جھوٹی خبر اڑائی جاتی ہے کہ عمر بن سعد نے اپنی لشکر کے مقتولین کو جمع کر کے ان پر نماز پڑھی اور دفن بھی کر دیا، یہ تو بنی امیہ کی بنائی ہوئی خبر ہے۔ اس لئے کہ ان مقتولین میں مسلمان اور کافر دونوں تھے، پھر اگر دونوں کو جمع کر کے سب پر نماز پڑھی اور دفن کیا یہ کیونکر اس کو جائز تھا؟ اگر کفار کو جدا اور مسلمانوں کو جدا کر لیا تھا پس تاریخ سے اس کا پتا نہیں ہے پھر کافر مقتول خاک اور خون آلودہ کو مسلم سے کیونکر پہچانا؟ اور ہم نے یہ بھی تسلیم کر لیا کوئی ذریعہ شناخت کا مسلم اور کافر کی لاش کا ہوا، اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ سارے مقتولین مسلمین کو ایک ہی گڑھے میں دفن کیا یا کہ ہر ایک کی قبر جدا جدا بنائی؟ ان دونوں باتوں میں سے آج تک تاریخ سے کوئی بات ثابت نہیں ہوئی اور نہ اس گنج کشتگان کا پتا کسی مورخ نے دیا ہے۔ کہ آخر کس جگہ پر تھا اور کس نے اس کو مٹا دیا۔

آخر کس زمانہ میں اور کس وقت تا اینکہ اس کا نشان مٹ گیا۔ اور اسی طرح کفارہ کا مدفن بھی معلوم نہین ہوا۔ میرا گمان قریب بہ یقین تو یہی ہے کہ ان ملاعنہ کی لاشیں دفن نہیں ہویں یونہی پڑی رہیں ان کو درندہ جانوروں نے کھایا جیسا کہ واقعہ حضرت عثمان اور ان کے غلامان وغیرہ کو ہم نے لکھا ہے اور یہ مشابہت ان لاشوں سے جسد حضرت عثمان کی البتہ پوری ہوتی ہے۔ یہ میرا گمان اخیر ان کی لاشوں کی

نسبت اس کی تائید یہ بھی ہے، کہ جس قدر زوار ہندی خواہ عجمی زیارت مرقد امام کو جاتے ہیں اور جس قدر خدام روضہ مقدسہ کے ہند میں آتے جاتے ہیں، کسی نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ کشتہ گان لشکر عمر بن سعد کی قبریں یا گنج کشتہ گان وہاں کسی مقام پر اندر حائر کے یا حائر سے باہر فلاں مقام ہے یا کبھی تھا۔

جب ہم ان مقتولین کے ذکر سے فارغ ہوئے اور اپنے گمان کو جو مشاہدات سے موید پایا ہے لکھ چکے، تو اب مناسب ہے کہ جو روایات متعلقہ قبر امام حسینؑ ہم کو پہونچی ہیں، ان کو بھی لکھیں۔ منجملہ ان روایات کے یہ بھی ہے کہ جب بنی اسد، بارہویں تاریخ بغرض دفن لاشہائے شہدا مقتل میں آئے اور جناب سید الساجدینؑ، بھی باعجاز طے الارض وہاں پہونچے، آپ نے ان کو حکم دیا کہ ایک جگہ مخصوص میں قبر کے واسطے گڑھا کھودیں۔ جب ان لوگوں نے اسی جگہ بیلچے سے کسی قدر کھودا ایک قبر درست خوشبو معطر اور صاف پاک تیار ان کو ملی، جناب امام نے فرمایا، یہی قبر میرے پدر بزرگوار کی ہے۔

اب اس روایت کی تصدیق مشاہدہ جمع کثیر قوم بنی اسد کے زن و مرد کا کرنا ہے اور یہ روایت تصدیق کرتی ہے جناب ام سلمہ کے خواب کی، جو شب دہم انہوں نے دیکھا، کہ جناب رسول نے فرمایا، آج کی رات میں قبریں کھود رہا تھا اپنے فرزند حسینؑ اور اس کے ہمراہ شہدا کی۔ یہ روایت اہلسنت نے بھی ذکر کی ہے۔ اب خواب کی تاویل گو کہ ہماری عقل اسے دریافت نہ کر سکی مگر تیار قبر کا پایا جانا تو یقینی ہے، جو مشاہدہ میں حضار کے آچکا اور یہی بات ہم کو لکھنی اور اسی سے استدلال کرنا ہے، بمقابلہ سرگذشت حضرت عثمان کے۔

انصاف پسند کو محض یاد آوری ان امور کی جو دفن حضرت عثمان یا عدم دفن میں اوپر گذرا ہے۔ اس روایت کے پڑھنے سے تفرقہ میں کافی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ جناب سید الساجدینؑ کا مقام مخصوص میں کھودنے کا حکم دینا، یہ بھی دلیل صریح ہے، کہ وہ مقام آپ کو معلوم تھا۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ موضع قبر امام حسینؑ کو خدا نے اسی روز سے پسند کر لیا تھا جس روز زمین کو بچھایا ہے اور یہ جگہ امام زین العابدینؑ کو اپنے والد بزرگوار کی تعلیم سے معلوم تھی۔ اور موضع قبر حضرت عثمان آج تک صحیح طور سے معلوم نہیں ہوا۔

بلکہ ان کا جنت البقیع میں دفن ہونا بھی محض وہمی اور مصنوعی بات ہے۔ باقی رہی حکایت بدبو اور متعفن ہونے اجساد مطہرہ شہدائے کربلا کی، سو بخوبی معلوم ہے کہ جس زمین گرم پر، یہ لاشیں پڑی تھیں، ریتلا

میدان جو حرارت سے دھوپ کی ایسا گرم ہو تا تھا کہ بھن جاتا تھاوہاں گر کے زمین پر دانہ اور بعض معتمد نے خبر دی ہے، کسی تاریخ کی کتاب پڑھ کر کہ عمر بن سعد اور اس کے چند معزز اصحاب بوجہ شدت حرارت کے اس کی تاب نہ لا سکے، کہ اپنے خیمہ میں بیٹھتے لہٰذا فرات میں کمر کمر پانی یا کچھ زائد میں بیٹھے تھے۔

اب خیال کرو اس گرمی کو اور مردہ کی لاش تھوڑی سی حرارت سے سڑ جاتی ہے، پھر ایسی شدید حرارت میں تمھارا کیا خیال ہو سکتا ہے، پھر چونکہ خدا نے وعدہ حتمی قرآن میں فرمایا ہے، کہ جو شخص اس کی راہ میں جہاد کر کے شہید ہو گا، اس کو حرارت شمس وغیرہ کچھ نہ پہنچے گی۔ اسی وجہ سے ان اجساد کو ضرر حرارت آفتاب کا نہ پہنچا۔

جس طرح جناب ابراہیم کو حرارت سے آگ کی نہ پہنچا اسی وجہ سے یہ اجساد مطہرہ ترو تازہ باقی رہے اور کسی قسم کا تغیر فساد اور عفونت کا انہیں پیدا نہیں ہوا۔ میرے اس قول کی سچائی پر تم کو زیادہ یقین اس سے بھی ہو گا کہ ان شہدا کے سرہائے بریدہ کو جب ان ظلمہ نے نیزوں پر چڑھا کر شہر بشہر، کوچہ بکوچہ، پھرایا، کوفہ سے لے دمشق تک جہاں جہاں یہ سرہائے شہداء گزرے اور ہزاروں آدمیوں نے پاس آکر بھی انکو دیکھا، آخر کسی تاریخ میں اس کا ذکر ہے کہ یہ سر بوسیدہ ہو کر بدبو دار ہو گے تھے؟

لیکن سر اقدس امام حسینؑ کا اس کی بڑی بزرگی یہ بھی ایک ہے، کہ جب ام حجام ملعونہ نے سر اقدس پر تیر مارا خون تازہ سر اقدس سے جاری ہوا، جس طرح زندہ آدمیوں کے جسم سے چوٹ لگنے سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ فعل معجزہ امام حسینؑ کا تصدیق کراتا ہے۔ خدا کے ارشاد کی کہ شہداء راہ خدا کو مردہ نہ سمجھو بلکہ زندہ ہیں۔ اب لائے وہ شخص جو مدعی ہے کہ حضرت عثمان بھی شہید راہ خدا ہیں، کوئی ایک بزرگی بھی ان کرامات مذکورہ میں سے۔ مگر یہ بیچارہ کہاں سے لائے جامہ ندارم دامن از کجا آرم۔

بلکہ بعض شعراء مداح نے دعوی کیا ہے کہ ایک ہزار معجزہ سر اقدس سے ظاہر ہوئے، از روز شہادت تا روزیکہ جناب سید الساجدینؑ نے اسے واپس لاکر ہمراہ جسد اطہر کے دفن فرمایا۔ رہا قبر کو کھول کر دوبارہ دفن کرنا تو باجماع اہل اسلام جائز ہے۔ اگر میت کا کوئی عضو دفن سے راہ گیا ہو اور اس میں ہڈی ہو۔ پھر حالت بعد

دفن کی، اگر ہم تسلیم بھی کریں کہ عثمان کو کسی نے پوشیدہ دفن بھی کر دیا اور ان کا حال عدم دفن میں مثل حال عائشہ کے نہ ہو، جو معاویہ کے حسن عقیدت سے، بنابر ایک روایت کے زندہ در گور ہوئی ہیں۔

(اس قصہ در گور ہونے عائشہ کو آج ثبوت کامل سے میں نہیں لکھتا محض اس مناسبت سے ذکر عائشہ آ گیا ہے کہ وہ حضرت عثمان کو نعثل کا خطاب دیے کر فرماتی تھیں لعن اللہ نعثلاً یا قتل اللہ نعثلاً لہٰذا عائشہ کے بھی پورے تعلقات قتل حضرت عثمان اور دفن حضرت عثمان میں ہیں) بہر حال اگر بفرض غیر واقع حضرت عثمان دفن بھی ہوئے، اب ان کے مدفن اور امام حسینؑ کے مدفن کا مقابلہ کیجیے، کچھ بھی مناسبت ہے؟ اب ہم کو مناسب ہے کہ پھر از سر نو حالات مذکورہ سابق کو بطور خلاصہ کے بیان کریں۔ اب ہم کہتے ہیں اگر خلیفہ نبی خدا کا پیارا ہو اور اسی کی راہ میں شہید کیا جائے خدا پر واجب ہے کہ اس کے مدفن کو خوشبو کر دے۔

اس کی خوشبو مہکنے لگے بدون اس کے آدمی اپنی تدبیر سے اس کو معطر کرے۔ یہ بھی واجب ہے کہ اس شہید کا مدفن زیارت گاہ مسلمانوں کی اور ذریعہ حاجت بر آوری خلائق کی ہو۔ اگر وہ لوگ اس کو ذریعہ شفاعت گردانیں اور یہ ذریعہ گرداننا ان کا بدعت حرام نہ ہو، بلکہ منصوص حکم خدا اور سولؐ سے یا خلیفہ رسول سے ہو اور شیریعت کی روسے جائز بھی ہو۔ خوابگاہ اس شہید کی چراغ ہدایت اور کلید گنجینہ کرامت ہے۔ اس لئے کہ اسی خدا کی راہ میں شہید ہوا ہے اور اسی کی راہ میں اپنے خون میں لوٹا ہے، کہ خون آلودہ ہو گیا ہے۔ یہ مدفن جائے ظہور کرامت الٰہی، جائے نزول نور خدا (دیکھو روضہ اقدس امام حسینؑ) اس کی زیارت کرنے والوں کے واسطے جائے پناہ آفات دنیوی اور دینی سے ہو گا۔ امان ہو گا نیک بندگان خدا کے واسطے، ہر طرح سے وہ نشانی ہو گا مدتہائے دراز تک کوئی نشان اس کا نہ مٹا سکے گا۔

مقام آمد و رفت ملائکہ مقربین کا اور جائے نزول انبیاء اور مرسلین کی۔ جگہ نماز پڑھنے کی طواف کرنے والے اور روضہ پڑھنے والوں کی۔ اس کی مٹی سے سجدہ گا نماز گزاروں کی اور تسبیح تسبیح خوانی تیار ہو گی۔ میری جان اور جملہ مومنین کی جان فدا ہو ایسے مزار پاک پر، اس مرقد کی مٹی سونگھنے سے ہمارے نبی سردار انبیاء کو گریہ لاحق ہو گا اور نیز سردار اولیا کو۔ زمین اور آسمان کے فرشتے اپنے پروں کو اسی مٹی سے آلودہ کریں۔ (واہ

رے مٹی کیوں نہ ہو)میرے حسینؑ جس روز شہید ہوئے، خون تازہ ہو جائے، جیسے خون کسی شہید کا شہید ایسے ہوتا ہے۔

اب تم کو قسم ہے خدا اور رسولؐ کی جو نبی ہادی ہیں، کوئی بات اور کوئی اثر ان آثار میں سے قبر فرضی حضرت عثمان اور اس قبر کی مٹی میں دیکھتے ہو یا پاتے ہو؟ اور کیا رسول خدا نے قبر حضرت عثمان کی جگہ سے خبر دی ہے کہ آخر کس جگہ بنے گی؟ اور کوئی کرامت اس جگہ کی یا اس کی مٹی کی بیان فرمائی ہے؟

باقی رہی یہ بات کہ حضرت عثمان بھی پیاسے مارے گئے اور امام حسینؑ بھی یہ خیال بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ حضرت عثمان کو ہمارے امام حسنؑ نے پانی پلایا بحکم اپنے والد بزرگوار کے اگرچہ آپ کو ایذائے جسمانی بھی پہنچی بسبب اس کے کہ جو لوگ پانی پہنچانے کو روکتے تھے وہ آپ کو پہچانتے نہ تھے۔ اور امام حسینؑ پر جب پانی بند ہوا خدا نے چشمہ آب جاری کر دیا، جس کا پانی برف سے زیادہ سرد اور شہد سے زیادہ شیرین تھا۔ یہ چھٹی تاریخ محرم کا قصہ ہے اور بروز عاشورا اپنی انگشت مبارک سے ایک زمین پر کھینچا جس سے ایک چشمہ شیرین جاری ہوا اپنے ہمراہوں کو شہادت سے پہلے اسی پانی سے سیر اب کیا، وہ بزرگوار ٹھنڈے کلیجہ جوار الٰہی میں پہنچے۔

شاید اسی وجہ سے جناب امام رضاؑ نے انکار فرمایا جب آپ سے کسی نے کہا کہ امام حسینؑ اور آپ کے ہمراہی سب پیاسے شہید ہوئے (مطلب اس کہنے والے کا یہ تھا کہ جس طرح حضرت عثمان اور ان کے ہمراہی پیاسے قتل ہوئے امام رضا نے غضبناک ہو کر یہ جواب دیا) لیکن یہ اعتراض اس روایت پر جو کہا جاتا ہے کہ پھر رونا نالہ زاری کرنا عزاداران کا سب بجا ہے اور پیاس کی شکایت غلط ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فعل حضور کا قریب مرنے ہر ایک شہید کے تھا اور اس سے پہلے سب پیاسے تھے۔ اس چشمہ کا پانی کسی کو نظر نہ آتا، چونکہ براہ معجزہ جاری ہوا تھا، کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ فقط امام حسینؑ ہی نے اس کو دیکھا ہو۔ اس چشمہ کے جاری ہونے پر آگاہی خاص ہے امام اور حجت الٰہی سے اور وہ جناب ہم کو خبر دیں گے اور یہی واقع بھی ہوا۔ اور جب امام رضاؑ نے جو حجۃ اللہ ہیں ان شہداء کے پیاسے مرنے سے انکار فرمایا ہم کو یقین کامل ہے کہ وہ بزرگوار پیاسے دنیا سے نہیں گئے۔

یہ چشمہ جاری ہونے کی روایت مدینۃ المعاجز کی صحیح ہو۔ انہیں کوئی اور طریقہ ان کی سیر ابی کا ہوا ہو۔ کیا تم نے جناب علی اکبر کا یہ فرمانا نہیں سنا ہے، کہ آواز بلند پکار کر قریب جانب حق تسلیم کرنے کے انہوں نے کہا اے میرے پدر بزر گوار میرے نانا رسول اللہؐ نے مجھے اپنے کاسہ لبریز سے سیر اب کر دیا۔ یہ روایت بھی ہمارے اس مطلب کی تائید کرتی ہے، جس کے درپے ہم اس وقت ہو رہے ہیں، جناب علی اکبر نے چلا کر یہ قول اپنے پدر بزر گوار کے قول کی تصدیق کی غرض سے فرمایا۔

اس لئے کہ جب علی اکبر لڑتے لڑتے بہت پیاسے ہوئے اور خدمت میں اپنے پدر بزر گوار کے آکر شدت پیاس کے شاکی ہوئے، حضرت نے فرمایا اے فرزند اب قریب ہے کہ تمھارے نانا تم کو اپنے کاسہ سے سیر اب کریں دوبارہ جاؤ لڑو ان اشقیا سے۔ بہت بعید ہے کرامت سے حجتہائے خدا کی اور ان کے انصاف سے کہ اپنی اولاد کو سیر اب کریں اور اصحاب اغیار کو پیاسا رہنے دیں، یہاں تک کہ وہ پیاسے مر جائیں۔ اب کچھ شک نہیں کہ جو خبر ان شہدا کے سیر اب ہو کر راہی جنان ہونے کی ہے وہ ضرور صحیح ہے سلام خدا کا سب پر ہو۔ پھر کیا کوئی جھوٹی روایت بنی امیہ کی گھڑی ہوئی بھی اس پیاس اور سیر ابی کی شرکت میں حضرت عثمان کے حالات میں تم نے پائی ہے؟ ہر گز نہیں۔

باقی رہا رونا اور دل گداز ہونا ان دونوں مقتولین کے حالات کو سن کر اور اسی کے بیان پر ہم اس رسالہ کو ختم کریں گے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ جناب رسول کا رونا یا ترحم حالت قتل حضرت عثمان اور مظلومیت پر کوئی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری اور نہ یہ کہ ان کی مصیبت پر رونے کا یہ ثواب ہے۔ قتل حضرت عثمان اور اس کی عظمت کا اظہار ہمارے نبی نے اس وجہ سے نہیں فرمایا آپ کو اپنے علم نبوت سے معلوم تھا کہ حضرت عثمان اپنے کردار کے عوض میں مارے جائیں گے اور قاتلان حضرت عثمان اور ان کی نصرت کو ترک کرنے والے وہ خاص اصحاب ہوں گے۔

پھر باوجودیکہ یہ لوگ قتل حضرت عثمان بعوض ان مظالم کے کریں گے اور شریعت مقدسہ جن امور سے قتل کو جائز کرتی ہے اسی کی پابندی کریں گے، اگر ان لوگوں کی ظالم اور ناحق ہونے کو آپ ارشاد فرماتے جناب نبی کی سچائی کے خلاف تھا اور احکام شریعت میں بھی خلل پڑتا۔ اور اسی وجہ سے یعنی چونکہ

قتل ناحق نہ تھا بلکہ وہ مستحق براہ عدل اسی کے تھے کوئی کرامت ان کی خواہ ان کی قبر کی کبھی ظاہر نہ ہوئی اور نہ کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی جو ان کے قاتلوں کی سزا دہی پر شامل ہوتی۔ حضرت عثمان کی مصیبت میں عزاداری گریہ و بکا درود اور فاتحہ دلانے یا ختم قرآن کا ثواب ان کی روح کو بخشنا ان لوگوں میں ابھی جاری ہی نہیں ہوا جو ان کو خلیفہ مانتے ہیں، بلکہ اکثر پیروان ثلاثہ کو اس کا بھی علم نہیں ہے۔

کس روز حضرت عثمان مارے گئے، پھر دفن ہونے کا دن یہ کون جانتا ہے۔ پھر اگر کوئی، اے برادر تمھارے سامنے کوئی حدیث جناب رسول کی شامل ایسے امور مذکورہ بالا پر پڑھے، جس سے بزرگی حضرت عثمان کے قتل کی پیش خدا ثابت ہو، تم فوراً جواب دینا کہ پھر قاتلان حضرت عثمان جو تمھارے عقیدہ میں ضرور بہشتی تھے، جن کے نام ہم اوپر لکھ چکے ہیں ان کا حشر کیا ہوگا؟ اس سوال کرنے کے بعد وہ ایسا چپ ہوگا، جیسے پتھر اس کے حلق میں ٹھونس دیا ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے حضرت عثمان کے حالات کے بعد از قتل کے ہیں۔ اب چاہیے کہ ہم تھوڑے سے حالات اپنے سردار امام حسینؑ کے بھی لکھیں از روز ولادت تا روز شہادت، بلکہ آج کے دن تک جو روزانہ سب دیکھ رہے ہیں اور یونہی دیکھتے رہیں گے جب تک خدا چاہا ہے۔ پھر اگر میں نام علماء سے اہلسنت کے اور نام کتابوں کا لوں جو حالات امام حسینؑ میں لکھی گئیں ہیں۔ زمانہ حیات جناب رسولؐ میں اور نیز بعد وفات اس جناب کے حالت بیداری اور خواب میں تو اس قدر وقت مجھے نہ ملے گا اور ہمارے علماء کی کتابیں بھی ان کے اقوال سے بھری ہوئی ہیں۔

کافی ہے تم کو جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں امام حسینؑ کے حالات بیان فرمائے از روز حمل اور ولادت اور رضاع اور یہ کہ ان پر مقتول ہونا واجب تھا اور جو کچھ اجر اور بزرگی خدا نے دی ہے۔ اور یہ بھی کہ ان کی اولاد میں نو امام ہوں اور آپ کے ولی قصاص خون ناحق کے لینے والے صاحب الزمان منصور ہوں گے اور زیادہ قتل کرنے سے ممنوع ہیں، ان سب کو خوب شرح اور بسط اور استدلال سے ہم نے رسالہ حسینیہ قرآنیہ میں اور نیز اپنی کتاب مائتین میں لکھ دیا ہے۔ جس کا ارادہ ان حالات پر واقفیت کا ہو ان دونوں کو پڑھے، کہ اس کا مطلب پورا ہوگا، بلکہ خواہش سے زیادہ ایسی ایسی باتیں معلوم ہونگی جو اس کے وہم اور گمان میں بھی نہ ہوں ان شاء اللہ۔

ظاہری مفارق میں سے یہ بھی ہے کہ جناب رسولؐ نے جنت واجب فرمائی ہے اس پر جو حسینؑ کی مصیبت میں روئے یا رلائے یا شبیہ رونے والوں کی بنائے۔ جس آنکھ سے آنسو ایک قطرہ قتل امام حسینؑ کو سن کر نکلے گا یا آنکھ میں قطرہ اشک بھر آئے خدا اس کو بہشت میں گھر دے گا۔ اور قتل حضرت عثمان کے سننے والے کو اگر روئے یہ ثواب رسول اللہؐ نے نہیں فرمایا۔ اسی طرح کی اور بھی روایات مشہورہ دونوں فریق میں وارد ہیں۔

اب رسالہ کو ہم درود بر محمدؐ و آل محمد پر ختم کر رہے ہیں۔

الحمدللہ رب العالمین

تمت

ارض العتاق

تالیف: آیت اللہ سید ابو القاسم لاہوری
تاریخ: ۲۰ شوال ۱۳۱۳ ہجری قمری

- تمثال مؤلف کتاب
- مؤلف کے بارے میں
- کتاب کے بارے میں
- متن کتاب
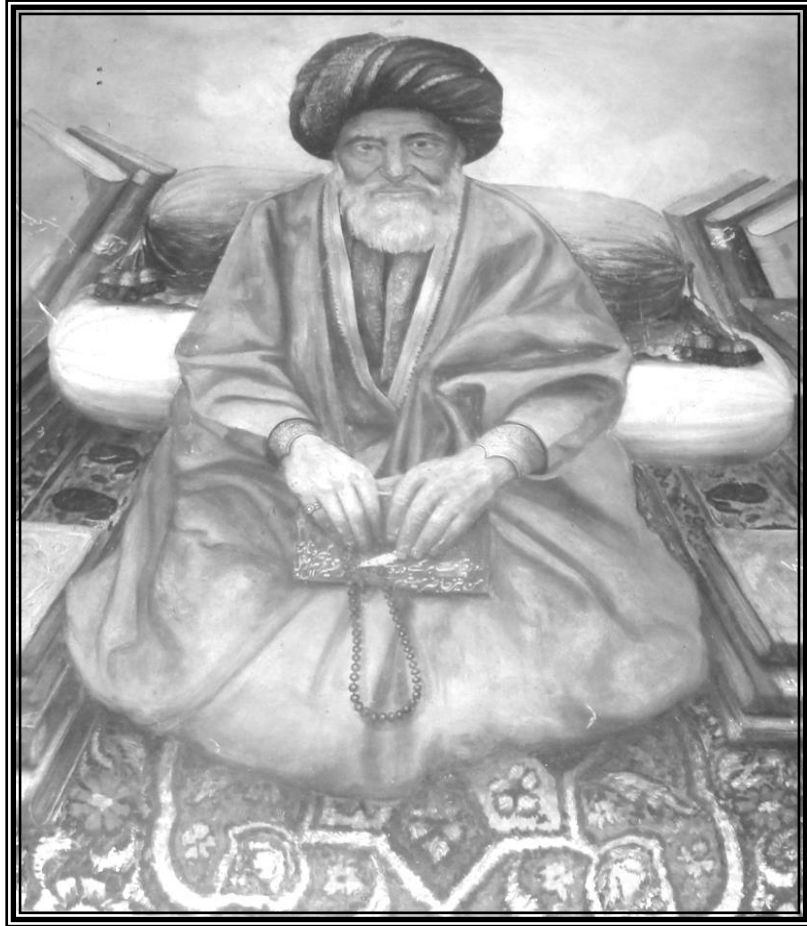
تمثال مبارک آیۃ اللہ سید ابو القاسم رضوی قمی کشمیری لاہوری صاحب تفسیر ”لوامع التنزیل“

✍ از قلم: طاہر عباس اعوان

مؤلف کے بارے میں

السيد ابوالقاسم الرضوي بن السيد الحسين بن السيد النقي بن السيد علي بن السيد ابي الحسن بن الحاج السيد محمد بن السيد حسين القمي (۱۲۴۹ـ۱۴ محرم ۱۳۲۴ھ۔ق)

پنجاب میں فقہی اور علمی سرگرمیوں کے اصلی محرک جناب آیت اللہ سید ابوالقاسم حائری مرحوم ہیں، آپ کے اجداد میں سے جناب سید حسین قمی ایران سے کشمیر آے، اور بھرپور انداز میں شیعیت کی تبلیغ کی ذمہ داری نبھائی، آپ ۱۲۴۹ھ میں یوپی کے علاقہ فرخ آباد میں پیدا ہوئے اور ابتدا ہی سے تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔ مقدمات فقہ وعقائد واصول فقہ وتفسیر وحدیث وغیرہ جناب سلطان العلماء سید محمد (۱۱۹۹ـ۱۲۸۴ھ۔ق) اور سید العلماء سید حسین علیین مکان (۱۲۱۱ـ۱۲۷۴ھ۔ق) سے حاصل کی۔ جناب نواب علی رضاخاں صاحب قزلباش رئیس اعظم لاہور نے آپ کے علم وفضل کا شہرہ سنا تو لاہور میں قیام کرنے پر اصرار فرمایا تو آپ نے وہاں توقف فرمایا۔

جب جناب نواب نوازش علی خاں صاحب اور جناب نواب ناصر علی خاں صاحبان نے حج کا ارادہ کیا تو آپ سے ہمراہی کی درخواست کی جس کو آپ نے شرف قبولیت بخشا اور ادائے حج وزیارات مدینہ مقدسہ کے بعد عراق میں آئے، تو استاد الفقہاء والمجتہدین جناب شیخ مرتضی انصاری مرحوم اور آیہ اللہ العظمی اردکانی مرحوم سے مستفید ہوتے رہے اور اساتذہ سے فاضل ہندی کا خطاب حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اجتہاد کے اجازے بھی حاصل کیے۔

جب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مشہد مقدس کو روانہ ہوئے تو راستے میں علماء شیراز، قم، کرمان، اصفہان ومشہد کی مجالس علمی میں حاضر ہو کر علمی مباحث کرتے رہتے یہاں تک کہ بعض مجتہدین سے اجازت اجتہاد حاصل کیے اور پھر لاہور میں تشریف لا کر قیام فرمایا اور نواب صاحب تمام مصارف کے کفیل ہوئے پھر آپ پڑھاتے تھے۔

آپ کی تحریک سے نواب صاحب نے ریاست علی رضا آباد و پشاور وغیرہ میں ایک ایک اور لاہور میں کئی مسجدیں بنوائیں اور محلہ موچی دروازہ میں شیعوں کی جامع مسجد بنائی اور جمعہ وجماعت وعیدین اور ایام متبرکہ میں شب بیداری ہونے لگی اور متعدد امام باڑے بنوائے، جن میں معصومین علیہم السلام کی ولادت و وفات کی مجالس ہونے لگیں اور محرم میں روضہ خوانی کے علاوہ آپ بھی چار یا پانچ گھنٹے وعظ فرماتے تھے اور پنجاب وسندھ میں ایمانی رونق اور شیعیت کی تبلیغ میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

مسائل دینیہ میں کسی کی رعایت نہ کرتے اور کسی سے رنج ہو جاتا تو دل میں کینہ نہ رکھتے رحلت سے ایک ماہ پہلے اپنا کافور و کفن جو مشاہد مقدسہ سے مس کیا تھا اس کو ملاحظہ فرما کر حائری صاحب کو وصیت فرمائی اور گامے شاہ کے امام باڑے میں دفن کرنے کو فرمایا ۱۳ محرم کی مجلس میں نواب صاحب کے ہاں شریک ہوئے شب ۱۴ میں حائری صاحب نے خواب دیکھا کہ نواب ناصر علی خاں صاحب مرحوم پالکی میں کربلائے معلی سے آئے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے مفسر حجۃ الاسلام ہیں۔

خواب سے بیدار ہوئے خبر پہنچی کہ طبعیت ناساز ہے حائری صاحب فوراعیادت کو حاضر ہوئے اور بعد نماز صبح فورادوران سر عارض ہو کر سر کا دورہ پڑا احتضار کے وقت درود واستغفار میں مشغول تھے کہ ۱۴ محرم ۱۳۲۴ھ کو انتقال فرمایا جب جنازہ اٹھا تو علم سیاہ آگے آگے مومنین اذکار خدا کرتے ہوئے اور پھول جنازے پر بکثرت چڑھائے گئے حائری صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی تین روز فاتحہ خوانی رہی حائری صاحب آپ کے جانشین قرار پائے جابجا مجالس فاتحہ خوانی ہوئیں شعرا نے مراثیے و تاریخیں نظم فرمائیں سید موسی شاہ کلیم لاہوری کا مادہ تاریخ یہ ہے: ع عازم خلد شد فقیہ جلیل۔

آپ نے اپنے پسماندگان میں دو فرزند ایک علامہ سید علی حائری اور دوسرے سید ابوالفضل چھوڑے۔

آپکی تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱. معارف ملتہ ناجیۃ فارسی
۲. ناصر العترۃ الطاہرۃ فارسی
۳. برہان المتعہ فارسی

۴۔ کتاب البشری شرح مودۃ القربی دردو جلد فارسی
۵۔ حقائق لدنی شرح خصائص امام نسائی فارسی
۶۔ حجج العروض عربی
۷۔ شق القمر عربی
۸۔ سیادۃ السادۃ در انساب
۹۔ تجرید المعبود فارسی
۱۰۔ ابطال تناسخ فارسی
۱۱۔ جواب لاجواب در اثبات عزاداری فارسی
۱۲۔ خیر خیر پوری فارسی در مناظرہ در رسالہ نفی الجبر
۱۳۔ رسالہ نفی رویتہ اللہ فارسی
۱۴۔ اجوبۃ زائرہ در مناظرہ فارسی
۱۵۔ جواب باصواب در طعام اہل کتاب عربی
۱۶۔ جواب العین در وجہ کسوفین فارسی
۱۷۔ ارکان خمسہ در فقہ اردو
۱۸۔ ہدایت الغالیہ در جواب غالیہ فارسی
۱۹۔ برہان البیان دو آیہ استخلاف حصہ اول ور عقائد فارسی حصہ دوم در فروع دین فارسی
۲۰۔ ارض العتاق در اباحت زمین کربلا فارسی
۲۱۔ حکمۃ الایلام در اثبات ابتلا فارسی
۲۲۔ رسالہ ابراز واعجاز علی بوقت خلافت فارسی
۲۳۔ رسالہ تعبد مالابد وجہ سجدہ کردن بطرف کعبہ فارسی
۲۴۔ رسالہ غروب الشمس فارسی

اور غیر مطبوعہ یہ ہیں۔

۲۵۔ خلاصۃ الاصول در اصول فقہ عربی
۲۶۔ تذکرۂ ملائے اعلیٰ در کلام فارسی
۲۷۔ براہین اللعنۃ عربی
۲۸۔ زبدۃ العقائد فارسی
۲۹۔ تعلیقہ بر شرح شیخ مقداد بر فصول طوسی
۳۰۔ تعلیقہ بر شرح تجرید علامہ
۳۱۔ تعلیقہ بر تہذیب الاصول علامہ
۳۲۔ صیانۃ الانسان فارسی
۳۳۔ اجوبہ اسولہ نصاری
۳۴۔ تعلیقہ بر شرح باب حادی عشر عربی
۳۵۔ رسالہ خمس سادات
۳۶۔ رسالہ نوروز فارسی
۳۷۔ رسالہ تخریج آلات فارسی
۳۸۔ رسالہ ربانہ در مصاہرۃ صحابہ فارسی
۳۹۔ تعلیقہ عربی بر شرح میر عبد الوہاب
۴۰۔ شرح تبصرہ علامہ عربی
۴۱۔ تعلیقہ بر شرح مبادی الاصول علامہ
۴۲۔ جنۃ الوافیہ در عقائد جلد اول و جلد دوم در فروع دین

۴۳۔ تفسیر لوامع التنزیل کی ۱۲ جلدیں چہ مطبوعہ و
چہ غیر مطبوعہ اس جیسی جامع تفسیر آج تک نہیں ہوئی
اس پر علمائے عرب وایران کی توثیقات ہیں۔

مزید تفصیلات کے لیے مندجہ ذیل کتب کی طرف مراجعہ فرمائیں:

تذکرۂ بی بہاص ۳۹، مطلع انوار ص ۶۵ نذھہ الخواطر ج۸ ص۱۹ اعیان الشیعہ ج۷ ص ۱۷، دانشنامہ شیعیان کشمیر ص ۲۵۱، نقباء البشر ج ۱ ص ۶۶؛ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۴۰۴؛ السادۃ في سیادۃ السادۃ ص ۱۴۲؛ تذکرہ علمائے امامیہ پاکستان ص ۱۷۔۲۰۔ الذریہ الی تصانیف الشیعہ، متعدد مقامات پر، تراجم مشاہر علماء ھند از سید العلماء سید علی نقن صاحب ص ۱۱۶ معجم المؤلفین ج۸ ص ۹۸، موسوعہ مؤلفی الامامیہ ج ۲ ص ۳۹۵۔

✍ از قلم: طاہر عباس اعوان

کتاب کے بارے میں

جیسا کہ مذکورہ اوراق میں آپ نے مطالعہ فرمایا ہے کہ آیت اللہ سید ابو القاسم رضوی خطہ پنجاب کی وہ پہلی ہستی ہیں۔ جنہوں نے اس خطے میں شیعیت کی ترویج و تبلیغ کا کام علمی سطح پر شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جناب ابو القاسم رضوی اور ان کے لائق فرزند آیت اللہ سید علی حائری نے شیعت کو پورے ہندوستان، برما اور افریقہ تک متعارف کرادیا اور تفسیر لوامع التنزیل لکھ کر پوری شیعی دنیا سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ جس کا بہترین شاہد "تقریظات المشاہیر" ہے جو کہ چار جلدوں پر علمائے ایران و ممالک عربی کی اس تفسیر کے متعلق تقریظات ہیں۔

ہر دو ہستیاں باپ اور بیٹا چونکہ بین الاقوامی شخصیات بن کر ابھری تھیں اس لیے مختلف مکاتب فکر کے افراد ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ بعض علمی پیاس بجھانے کے لیے اور بعض اپنا قد اونچا کرنے کے لیے کہ ہم نے فلاں صاحب سے فلان معاملہ میں خط و کتابت کی ہے۔[1]

کتاب ارض العتقاق بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کسی مخالف نے زمین کربلا کے خریدنے والے مسئلہ کو لاینحل سمجھ کر سوال کیا اور سمجھا کہ تحقیق کی دنیا میں بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ لیکن آیت اللہ سید ابو القاسم رضوی رضوان اللہ تعالی علیہ نے مخالف کو ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ مخالف نے کبھی بھی اس مسئلہ کو

---

[1]۔ انشاءاللہ آئندہ میراث برصغیر کا خصوص شمارہ چہارم خصوصی طور پر انہیں دو ہستیوں کے بارے میں ملت کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے، وہاں پر ان اعلام اور اس خاندان کے حالات و آثار پر مفصل روشنی ڈالیں گے۔ اس حوالہ سے ہم ملت کے اہل قلم سے بھی گذارش کرتے ہیں کہ وہ ان ہستیوں کے بارے میں کچھ لکھنا چاہیں تو ۲۰ جمادی الاول ۱۴۳۳ھ تک ہمارے ایمیل یا اڈریس پر اپنا مقالہ ارسال کر دیں۔ جس کو آپکے نام کے ساتھ نشر کیا جائے گا۔

چھیڑنے کی جرائت نہ کی۔ یہ رسالہ ایک سوال کے جواب میں ہے جس سوال کو چند حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ہر حصہ کا جدا جدا محکم جواب دیا گیا ہے۔

سوال

زمین کربلا خلیفہ ثانی کے زمانہ میں قہر و غلبہ سے حاصل ہوئی ہے۔ حسنین شریفین علیہما السلام اس جنگ میں شریک تھے اور یہ زمین تمام مسلمانوں کا مشترکہ مال ہے۔ اس کا خریدنا وقف کرنا۔ ہبہ کرنا اس میں دفن ہونا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

اگر شیعوں کے لیے اس زمین میں دفن ہونا ثواب کا موجب ہے تو پھر شیخین ابو بکر و عمر کا بھی روضہ رسول میں دفن ہونا موجب ثواب ہے۔ لہذا شیعوں کو حق نہیں کہ وہ شیخین کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ غصبی جگہ پر دفن ہیں۔

پہلا جواب

آیت اللہ سید ابوالقاسم رضوی اس سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ حسنین شریفین علیہما السلام کی جنگ میں شرکت والی روایت ضعیف ہے۔

۲۔ اگر شریک ہوئے ہیں تو خلیفہ دوم عمر کی درخواست اور امیر المومنین علیہ السلام کے حکم سے؛

۳۔ اہل عراق نے فوراً اسلام قبول کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے حکم اسلام سے ان کا تمام مال و اسباب محفوظ ہے جس پر کسی کا کوئی حق نہیں۔ لہذا امام حسین علیہ السلام نے اصل مالکان سے زمین خریدی ہے اور پھر اسے وقف کیا ہے۔

دوسرا جواب

زمین کربلا یا آباد تھی یا بنجر؟ اسلامی قوانین کی روشن میں ہر دو صورت میں بنی اسد اس کے تصرف کے حق دار ہیں لہذا امام علیہ السلام نے اصل مالکوں سے زمین خریدی ہے۔

تیسرا جواب

بنی اسد چونکہ شیعیان اہل بیت علیہم السلام میں سے تھے ممکن ہے زمانہ امیر المومنین علیہ السلام میں حضرت سے اس زمین پر تصرف کی اجازت لی ہو۔

چوتھا جواب

مذہب اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ اگر کوئی جابر حکمران کسی زمین کو فتح کرے تو درحقیقت وہ زمین حقیقی امام کی ملکیت متصور ہو گی۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ دیگر خلفاء کی پوزش مذہب اہل بیت علیہم السلام میں روشن ہے۔ زمین کربلا خلافت دوم میں فتح ہوئی ہے۔ لہذا ان کے حقیقی وارث اس زمانہ میں خود امام حسین علیہ السلام تھے۔ لیکن چونکہ اس کو آباد بنی اسد نے کیا تھا۔ لہذا ان کا حق بھی ادا کیا اور پھر اسے وقف کر دیا۔

پانچواں جواب

خود کتب اہل سنت میں اہل بیت علیہم السلام کے متعدد فضائل لکھے ہوئے ہیں اور ان کے حق میں سیکڑوں احادیث رسول خدا ﷺ کی زبانی نقل ہوئی ہیں اور شارحین بخاری نے قبول کی ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو بچپنے میں لوح محفوظ کا مطالعہ کروایا گیا تھا۔ اب یہ سوال اٹھانا جائے کہ زمین کربلاء مسلمانوں کا مال تھا۔

اور امام نے مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے اس زمین کو معاذاللہ ناحق خریدا ہے۔ یعنی اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ مسائل فقہ نہیں جانتے تھے کتنے افسوس کی بات ہے۔ بلکہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔ ہاں! اس زمین کی عظمت سید الشہداء کے خون کی وجہ سے ہے۔

لہذا کربلا میں شیعوں کا دفن ہونا امام حسین علیہ السلام کی اجازت سے ہے اور شیخین خانہ رسول میں غصباً دفن ہوئے ہیں۔

یہی قوم آج تک کہہ رہی تھی کہ رسول مال دنیا میں کوئی چیز نہیں چھوڑ کے جاتا سب کچھ مسلمانوں کا مال ہے۔ یہ گھر بھی تو مال دنیا میں سے تھا اور سب مسلمانوں خصوصاً تمام اہل بیت علیہم السلام کا حق تھا۔ شیخین کس کی اجازت سے دفن ہوئے ہیں۔

چھٹا جواب

فقط عاشقان زہراء سلام اللہ علیہا کو سمجھ آسکتا ہے۔ دشمنان زہراء سلام اللہ علیہا نہیں سمجھ سکتے۔

متن کتاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ الذی اورث العرض عبادۃ الصالحین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء و

خلفاء اللہ من عترتہ الطیبین الطاھرین امابعد اقل نبی ھاشم سید القاسم۔

عرض رسان اہل اسلام و ایمان سے کہ نام اس رسالہ کا اباحہ ارض کربلا لاہل الولا جواب سوال بعضی اہل اسلام ہے واسطے ملاحظہ ناظرین کے اصل سوال سائل نقل کرکے بعد از ان جوابات اسکے بوجوہات مختصرہ زبان اردو میں لکھے جاتے ہیں۔

سوال

یہ ہے کیا فرماتے ہیں علمای شیعہ اس مسئلہ میں کہ زمین کربلا جو بعہد خلافت خلیفہ ثانی بقہر و غلبہ مفتوح ہوئی تھی اور حضرات سبطین رضی اللہ عنھما اس جہاد میں حسب تصریح مورخین فریقین شریک جہاد تھے۔

چنانچہ کتب شیعہ مثل "شرایع الاسلام" اور "جواہر الکلام" میں اسکی تصریح لکھی ہوئی ہے کہ سواد عراق بقہر و غلبہ مفتوح ہوئی اور اسکی خرید و فروخت وہبہ ورہن ووقف وغیرہ کچھ بھی جائز نہیں ہے۔ اسلئے کہ مال جملہ مسلمانان کا ہے پھر اسکا خرید کرنا زمینداران، نینوا سے حضرت امام حسین علیہ السلام کا کیونکہ جائز تھا؟ اور چار میل مربع مسافت کو خرید کرکے خاص اپنے شیعوں پر وقف کر دینا جیسا کہ کتب مصائب میں درج ہے کس مذہب کے رو سے درست ہوا؟

مذہب شیعہ کے تمام علماء کا ایسی زمین میں تصرف نہ کرنے پر اتفاق ہے، بلکہ خود سواد عراق کی تصریح کر کے اس کو تحریر کیا، اور ایسی زمین کی نظیر سواد عراق دیتے ہیں۔ اور ایضا اس میں دفن ہونا شیعوں کا اور درو دروسے اپنے مردوں کا لے جانا کیونکہ جائز ہو گا؟ اس لئے کہ غصب حق مسلمین کر کے اس پر امید مغفرت رکھنا اور غصبی زمین میں دفن ہو کر فشار قبر سے نجات پانا اگر یہی مذہب ہے تو بنا بر مذہب شیعہ حضرات شیخین پر بھی بوجہ دفن ہونے روضہ صلعم کے جو شیعوں کے نزدیک غصب حق ورثہ ہے حق مسلمین ہے فشار قبر نہ ہوا ہو گا؟ بلکہ ثواب ملا ہو گا؟

سائل امیدوار ہے کہ جواب اسکا قابل اطمینان عام مسلمانوں کے لیے تحریر فرمایا جاوئے بیّنوا توجروا۔

پہلا جواب

اولاً؛ سائل کا قول کہ حسنین علیہم السلام جنگ عراق عرب مین شامل تھے یہ ثابت نہیں اور روایت جو اہر خود ضعیف ہے۔

ثانیاً؛ اور بفرض تصحیح اور تسلیم جناب حسنین علیہما السلام حسب درخواست عمر کے حضرت امیر المومنین کی جانب سے اس جنگ میں شامل تھے۔

ثالثاً؛ اور اہل عراق عرب نے جنگ مذکور میں اسلام بمحض فتح قبول کیا تھا، تو تمام مال اور اسباب انکا محفوظ و مامون رہا، اور وہ اپنے مال و زمین کے مجاز اور مالک تھے اس لئے امام حسین علیہ السلام نے اصل مالکان سے جو مومن تھے زمین کربلا کو خرید فرمایا اور وقف کیا۔ پس بنا بر قول سائل اعتراض سائل باطل ہے۔

دوسرا جواب

زمین کربلا آباد تھی یا بنجر؟ بر تقدیر اول زمینداران زمین مذکور جو قابض اور عامر اس کے تھے: بعد لانے اسلام کے اولی اور احق بالتصرف ہیں۔ ان سے خرید فرمانا حضرت امام حسین علیہ السلام کا صحیح اور جائز ہے: «كما قال الشافعي البلاد علي ضربين ضرب اسلم اهلها عليها عامرها مملوك لاهلها» و بر تقدیر ثانی زمین بنجر غیر مملوک تھی تو موافق حکم شارع زمین بنجر باب انفال سے ہے، جو کوئی مسلمانوں سے

اسکو آباد کر لے وہ مجاز اور احق اور اولی بالتصرف اس زمین پر رہے ہیں، قبیلہ بنی اسد مسلمان تھے اور انہوں نے اس زمین پر قبضہ اور اسے آباد کیا تھا، مستحق اور مالک اس زمین کے تھے، بدین لحاظ جناب امام حسین علیہ السلام نے وہ زمین بنی اسد سے خرید فرما کر وقف کی۔

تیسرا جواب

اور نیز جو کہ بنی اسد شیعیان اہل بیت سے تھے ممکن ہے کہ زمانہ خلافت امیر المومنین علیؑ میں انہوں نے تملیک اس زمین کی جو بسبب غیر آباد اور بنجر ہونے کے انفال میں داخل تھے حاصل کی ہو اور اس واسطے حضرت امام حسینؑ نے ایسی زمین کو اُسکے مالکوں سے خرید فرمایا۔

چوتھا جواب

(مذہب اہل بیت کی تعلیمات کی روشنی میں) اگر کوئی ملک بلا اذن امام حق، کسی جابر نے فتح کیا ہے تو وہ ملک مال امام ہے، چونکہ زمین نینوا العہد عمر میں مفتوح ہوئی تھی، جناب امام حسین علیہ السلام نے جو اس وقت امام زمان تھے اور مالک اور صاحب اختیار اس پر تھے، لکن بدین احتیاط کہ بالفعل قبائل بنی اسد جو مسلمان اور شیعیان اہل بیت علیہ السلام ہیں اور اس میں قبضہ اور اختیار رکھتے ہیں، برعایت عارضہ عامرین مقابلہ حقوق عارضہ عامر یہ، خرید فرما کر خالصاً واسطے سکونت اور تدفین شیعیان وقف کر دیا۔ پس بدین وجوہ تدفین شیعیان زمین کربلا بحسب شرع مطہر صحیح اور درست اور جائز ہے کوئی قدح اسمیں نہیں ہے۔

پانچواں جواب

باتفاق امت، جو خلیفہ اللہ اور اخص خواص اولاد و اہل بیت رسول اللہ ﷺ ہو اور اس کے شان میں آیات قرآنی و احادیث متواترہ متفقہ امت مثل حدیث ثقلین و سفینہ وغیرہ موجود اور وارد ہوں وہ شخص کس طرح ممکن ہے کہ جاہل اشتراک ارض کربلا سے ہو؟ اور بلا تحقیق اس زمین مشترکہ کو خرید اور وقف کرے؟ یہ تجویز ادنیٰ عاقل، ادنیٰ آدمی مشتری پر کبھی نہیں کر سکتا ہے، پس خرید کرنا شید الشہداء علیہ السلام کا ارض مشترکہ کو کس طرح متصور ہوا؟ وحالانکہ صاحب صحاح ستہ اہل سنت نے روایت کی ہے

حالت صبایت میں امام حسین علیہ السلام نے دانہ خرما اٹھا کر دھان شریف کی طرف لے گئے پھر حضرت رسالتمآب ﷺ نے اس طفل صغیر کو بلفظ:«كخ كخ يا بني الا تعلم ان الصدقة علينا اهل البيت حرام» خطاب فرمایا۔ پس حضرت امام حسین علیہ السلام نے دفعۃ پھینک دیا۔ شاحین بحاری سوال مقرر کر کے کہ پیغمبر نے طفل صغیر غیر مکلف کو کیوں کر الا تعلم فرمایا؟ جواب لکھا ہے کہ حسنین علیہما السلام کو حالت مہد میں لوح محفوظ کل دکھلایا گیا تھا۔

و اعجبا خود یہ قوم اسطرح سے حال اُن کا لکھیں معذلک انحضرت کو عالم کان و یکون جان کے اسناد جہالت خرید ارض مشترکہ میں کریں العیاذ باللہ۔ پس باکمال تعاند و تعصب یا جہالت تامہ سائل سے صادر ہے، کوئی خارج اسلام بھی یہ حال سنکر ایسی تجویز امام علیہ السلام پر نہ کرے گا۔ ھان شرافت اس زمین اطہر کی بسبب شہادت و خون ریزی سبط سید انبیاء فی سبیل اللہ ثابت ہے: «بقوله تعالي ابنائنا وابنائكم و لقوله عليه السلام حسين مني و انا من حسين والحسين سبط من الاسباط والحسن والحسين ابناى» پس جس جگہ پارہائے جگر رسول خدا کا جو خون اور گوشت رسول خدا کا عینا ہے گرے البتہ وہ جگہ اشرف البقعات ہے۔

لہذا یہ زمین شیعیان اہل بیت کے واسطے امن و امان و باعث نجات فی الدنیا و الآخرہ ہے چنانچہ مرویہ متفق علیہ شاہد اسکا ہے کہ حسین علیہ السلام کا چار چیز عوض اس شہادت کے دئے گئے ہیں:«الشفاء في ترتبه و اجابة الدعاء تحت قبته والائمه من زيته والشفاء في امة جده» پس اگر وہ زمین مغصوب ہوتی تربت شفاء ہر مرض اور موضع اجابت دعائے مسلمانان اور مہبط ملائکہ و انبیاء نہ بنتی، پس واضح ہوا کہ اس میں اور تدفین شیخین میں جو خانہ مطہر پیغمبر مشرقین میں بلا اذن بغصب صریح دفن ہوئے فرق اور تفاوت بیں ہے، کیونکہ زمین نینوا میں رہنا اور دفن ہونا امام علیہ السلام کی جانب سے ماذون اور شرعاً مجاز ہے اور داخل ہونا غیر کا بیت پیغمبر میں در حضور و غیاب بہ نص صریح قطعا ممنوع اور منہی عنہ ہے۔

لقولہ تعالی: ﴿لاتدخلوا بیوت النبی الا ان یوذن لکم﴾؛ پس تدفین شیخین حرام اور مغصوب محض ہے، اس لئے کہ شیخین کو کسی قسم کا حق تملیک یاور اثنی وہاں حاصل نہ تھا اور نہ وارثان حقہ یعنی اہل بیت سے اذن حاصل کیا تھا اور نہ ابھی تقسیم ہوئی تھی کہ بحصہ زوجتین ان کے اذن سے ہوتی، اور اگر بمرویہ لانورث جو واسطے غصب کرنے حقوق فاطمہ لزہراء صلوات اللہ علیہا مثل فدک وغیرہ کی حدیث وضع کی تھی اس سے خانہ نبوی کو بھی صدقہ میں قرار دیا تھا، پھر کیوں اس روضہ شریفہ میں دفن ہوئے، نہ اہل بیت عصمت وطہارت سے اذن حاصل کیا نہ تمام مسلمانوں سے۔

خلاصہ مانند فدک وخلافت کے خانہ نبوی کو بھی غصب کر کے مرتکب فعل حرام ہو کر دفن ہوئے اور ایسا دفن ہونا یا قریب ہونا کچھ فائدہ مند انکے واسطے نہیں ہے، بلکہ مستوجب اشد عذاب اور عقاب تا یوم الحساب ہے آیا نہیں دیکھتے ہو کفار ومنافقین کو جو الی حین قرب مسکنت ومجاورت ومدفنت قدیم سے حرمین میں رکھتے ہیں ہر گز ان کو فائدہ نہیں پہونچتا ہے، چنانچہ متفق علیہ روایت ہے: «من غضب ارضا طوق الله ذلك غاصبا يوم القيامة» پس باطل کو مشابہ ومماثل حق تمثیل عین باطل ہے۔

چھٹا جواب

تمام زمین اور پانچ دریا اور خمس دنیا مہر حضرت فاطمہ الزہراء کا باحادیث متفقہ ثابت ہے چنانچہ دیلمی فردوس اخبار میں لکھتا ہے۔

«عن ابن عباس قال قال رسول الله ياعلي ان الله زوّجك فاطمة و
جعل صداقها الارض فمن مشي عليها مبغضا لك مشي حراما»

اور ایضا باحادیث متفقہ وارد ہے کہ دریائے دجلہ وفرات ونیل وجیہون وسیحون وخمس دنیا حق سحانہ وتعالی نے مہر میں انحضرت کے قرار دی ہیں، پس باوجود ان احادیث کے کیونکر زمین عراق غصب ہو سکتی ہے، اور اگر یہ زمین غصب ہوتی تو کیونکر عالم کان ومایکون خلیفہ اللہ جناب سید الشہداء علیہ السلام خود و شیعیان اپنے کو ایسی زمین میں دفن ہونے دیتے سبحان اللہ جس امام علیہ السلام کی والدہ کے مہر میں خدا ی

تعالی نے تمام روئے زمیں و آب شرین مقرر کیا ہو کسطرح متصور ہو سکتا ہے کہ آنحضرت اور شیعہ ان کے زمین مغصوب میں مدفون ہو سکیں؟

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جو آنحضرت کے بلا اذن مخالفین میں سے روی زمیں میں دفن ہوئے عذاب ابدی میں رہیں گے، بدحال زیادہ ان لوگوں کا جو کہ خانہ اور روضہ مطہرہ میں بلا اجازت غصباً و قہر داخل اور دفن ہوئے۔

تنبیہ: انبیاء علیہم السلام کی صحبت و مجاورت میزان نجات نہیں ہے۔

مجاورت و مقاربت و معیت و مصاحبت زمانی و مکانی، دنیاوی کافرین و مشرکین و منافقین و ظالمین و غاصبین کو موجب و مستلزم شرف و نجات عقوبت شدیدہ عاقبت سے ابداً و اصلاً ممکن و متصور نہیں ہے، کیونکہ یہ حال حضر و سفر میں قدیم سے ہر زمانہ میں نیک و بد طاہر العین اور نجس العین، انسان اور حیوان انبیاء، کفار کو علی الدوام دنیامیں طوعا ذکر واقع ہوتا ہے چنانچہ معیت الٰہی سے کوئی خالی نہیں ہے بقولہ تعالی ﴿اینما کنتم وھو معکم﴾؛ و آیۃ نجوی چون ﴿مایکون من نجوی ثلاثه الاھو رابعھم﴾ و آیہ در قید خانہ یوسف علیہ السلام لقولہ تعالی ﴿یا صاحبی السجن﴾ و قولہ تعالی ﴿الم ترکیف فعل ربك باصحاب الفیل﴾ اور مثل اسکی آیات دیگر شاہد صریح ہیں پس یہ ثبوت اُس کے ثابت ہوا کہ معیت و مصاحبت و مقاربت حضرات شیخین با سرور انبیاء در حیوہ و بعد مرگ دخول و دفن ہونا بیت الشرف آنحضرت میں بلا اذن لغلبہ و قہر و غصب اصلا و ابدا دلیل شرف و نجات نہیں ہے، سوائے زیادتی اور عقوبت عقبی کے اور شاھد ثانی پندرہ احادیث سے زیادہ متفرق مقام خصوصا ذیل سورہ کوثر کتاب رقاق بخاری میں ضبط اور مثبت ہیں۔

پیغمبر کے سامنے ایک جماعت صحابہ روز قیامت حوض کوثر سے پکڑ کر جہنم میں ڈالی جایئے گی وہ حضرت کہے گا خدایا یہ میرے اصحاب ہیں ندا ہو گا یا نبی تو جانتا نہیں ہے انہوں نے بعد تیرے کیا کیا بدعتیں جاری کئیں اور بمحض مرنے تیری یہ مرتد ہو کر کفر اصلی اپنا اظہار کیا۔ پھر آنحضرت فرمادیں گے دور کرو دور کروانکو کہ پیچھے میرے انہوں نے تغیر دیا دین میرے کو اس جملہ میں سے یہ حدیث ہے قال صلعم:

لیردن علي یوم القیامه رهط من اصحابي انا اعرفهم و هم یعرفوني فیوخدون ذات الشمال من دوني فاقول یا رب اصحابي فیقال لي انك لا تدری ما احدثوا بعدك فلم یدالو مرتدین قهقریا منذ جفارقهم ما قول سحقا سحقا لمن غیر دیني ای بعدا بعدا قاله ابن عباس انتهي

پس مگر یہ احادیث بخاری صحیح ہیں تو کہو اصحاب کفر و ارتداجو ماخوذ بحضور نبوی ہوں وہ کتنی اور کون ہیں مجلد سادس بخاری غزوہ حدیبیہ میں والد علاابن مسیب سے روایت لکھی ہے کہ میں نے براہ بن عازب کو گوارا باد دیا کہ تم اجلہ اصحاب نبوی سے ہو براء نے جواب دیا ای پسر برادر کیا مبارکباد دیتی ہو کیا تم نہیں جانتے ہو کہ ہم صحابہ نے بیعۃ رضوان کے بعد کیا کیا بدعتیں دین اسلام میں ایجاد اور احداث و جاری کیں۔

پس ساتھ اقرار براابن عازب کے جو اجلہ اہل بیت رضوان سے ہے واضح اور ثابت ہوا کہ ہم اصحاب بیعت رضوان سے بعد موت نبی کے کفر اور ارتداد صادر ہوا اور اگر تفصیل جماعہ مبتدعین صحابہ دیکھا چاہو تو کتاب "عمر و جاحظ" اور "ابن ابی الحدید" اور "فصول اولیات مشائخ ثلثہ" "تاریخ الخلفاء" "سیوطی و ابن سعد کو ملاحظہ کر دیہ سب ائمہ اہل سنت ہیں مر ویہ بخاری یہ ہے:

قال البراء بن عازب فقلت طوبي لك صحبت رسول الله و بایعته تحت الشجره فقال لي یابن اخي انّك لا تدری ما احدثنا بعده انتهي اعاذنا الله والمومنین جمیعا من طمع الدنیا و بیع الاخرة بقلیل من متاع الدنیا

اور ادلہ کثیرۃ اس باب میں ہیں لیکن بسبب تعلل و عدم گنجایش اس وریقہ کی ثبت نہ ہوئی اور جس کو قلیل قیل و قال کفایت نکرے اسکو ادلہ کثیرہ ہی مفید نہ ہونگی۔

فاالله یهدینا الي التحقیق و الدلیل و یحفظنا من الضلاله والتضلیل و نحمده لربنا الجمیل و الصلوة علي نبینا الجلیل والائمه الهداء الي سواء السبیل تمت هذه الورقه بالایجازو الاختصار بکمال التعجیل في ساعة واحدة سنه 1313 20شوال فعلیه الانکال

ہدایات ناصریہ

تالیف: آیت اللہ سید ناصر حسین ناصر الملت
مرتب: میر اکبر علی خلف میر احمد علی مرحوم دھلوی
تاریخ: ۷ اصفر المظفر ۱۳۲۲ھ۔

- تمثال مؤلف کتاب "ہدایات الناصریہ"
- مؤلف کے بارے میں
- کتاب کے بارے میں
- نسخہ عکسی کتاب
- متن کتاب
- کتاب "ہدایات الناصریہ" پر ایک تحقیقی نظر

آیت اللہ سید ناصر حسین ''ناصر الملۃ''

(۱۲۸۴-۱۳۶۱ھ-ق)

(فرزند صاحب عبقات الانوار سید میر حامد حسینؒ)

✍ از قلم: طاہر عباس اعوان

مؤلف کے بارے میں

ناصر الملت اور کنتوری خاندان، اور موسوی سادات کی ھند میں ہجرت اور علامہ مفتی قلی خان متوفی ۱۲۶۰ھ۔ علامہ اعجاز حسین، علامہ میر حامد حسین صاحب عبقات الانوار متوفی ۱۳۰۶ھ۔ اور خود جناب ناصر الملت اور انکی اولاد کے متعلق ہم اس وقت مفصل بحث کریں گے جب اس خاندان کے متعلق میراث برصغیر کا خصوصی شمارہ چاپ کریں گے ان اشاءاللہ، سر دست ناصر الملت کے ساتھ آپکے والد اور دادا کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

علامہ مفتی محمد قلی کنتوری نیشاپوری علیہ الرحمۃ (۱۱۸۸۔ ۱۲۶۰ھ۔ق)

خاندان کنتور کے شجرہ میں حضرت علامہ محمد قلی علیہ الرحمہ کا اسم گرامی سید السادات کی نسل کے تیرہویں طبقہ میں ملتا ہے آپ کا پورا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تک حسب ذیل ہے۔

سید محمد قلی بن سید محمد حسین بن سید حامد حسین بن سید زین العابدین بن سید محمد بن سید محمد بن حسین بن سید حسین بن سید جعفر بن سید علی بن سید کبیر الدین بن سید شمس الدین بن سید جمال الدین بن سید السادات ابو المظفر علاء الدین حسین اعلیٰ بزرک بن سید عزالدین محمد بن سید شرف الدین ابو طالب بن سید محمد المحروق بن سید حمزہ بن سید علی بن سید ابو محمد بن سید جعفر سید مہدی بن سید ابو طالب بن سید علی بن سید حمزہ بن ابو القاسم حمزہ بن حضرت امام موسیٰ علیہ السلام۔

آپ کی ولادت ذیقعدہ ۱۱۸۸ء ہجری میں بمقام کنتور ہوئی آپ کے والد ماجد بھی ایک ذی علم بزرگ تھے۔ اور فضلاء عصر میں سے شمار ہوتے تھے ان کے زیر سایہ آپ نے تربیت پائی کتب درسیہ مختلف فضلائے زمانہ سے پڑھیں، لیکن علوم دینیہ حضرت غفران مآب علیہ الرحمۃ سے حاصل فرمائے اور اجتہاد و

تحقیق کے بلند درجات خصوصاً علم کلام میں بے نظیر اور شہرۂ آفاق ہوئے۔ تحصیل علوم کے بعد آپ میرٹھ میں منصب عدالت پر مقرر ہو کر صدر الصدور ہوئے اور عرصہ دراز تک وہیں رہ کر کاعدالت انجام دیتے رہے، آخر عمر میں لکھنو مراجعت فرمائی اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے، یہاں تک کہ ۹ محرم ۱۲۶۰ ہجری میں انتقال فرمایا اور حسنیہ غفران مآب میں مدفون ہوئے۔ آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں لیکن چند مشہور اور لاجواب تصنیفیں جس سے آپ کی عظمت و جلالت نمایاں ہوتی ہے یہ ہیں۔ فتوحات حیدریہ، تاریخ کنتور، عدالت علویہ، سیف ناصری، تقلیب المکائید، برہان السعادۃ، تشیید المطاعن، مصارع الافہام، تقریب الافہام، رسالہ تقیہ وغیرہ۔

علمائے کبار نے آپ کے علم اور آپ کے تصانیف عالیہ کی بڑی مدح ثناء فرمائی ہے آپ نے اپنے بعد تین فرزند چھوڑے جو دنیائے علم میں بڑے نامور ہوئے۔ ایک مولانا سراج حسین صاحب قبلہ دوسرے مولانا اعجاز حسین صاحب قبلہ اور تیسرے حضرت فردوس مآب علامہ حامد حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہم۔

حضرت علامہ میر حامد حسین نیشاپوری لکھنوی (۵ محرم ۱۲۴۶۔۱۸ سفر ۱۳۰۶)

جناب فردوس مآب حضرت علامہ سید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ حضرت علامہ محمد قلی صاحب علیہ الرحمہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ولادت ۵ محرم ۱۲۴۶ھ میں بمقام میرٹھ ہوئی تعلیم کا ابتدائی حصہ اپنے والد ماجد سے حاصل کیا لیکن چودھویں برس سایہ پدری سر سے اُٹھ گیا تو اس زمانہ کے مشاہیر علماء جناب مفتی سید محمد عباس صاحب قبلہ شوستری جناب سید العلماء علامہ سید حسین علیین مکان صاحب قبلہ اور جناب سلطان العلماء آیۃ اللہ سید محمد صاحب قبلہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے شرف تلمذ حاصل کیا اور بہت جلد اخذ و تحصیل کی حدیں ختم کر کے منصب اجتہاد پر فائز ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے اپنے والد ماجد کی ان تصنیفوں کو اُٹھایا جو ابتک شائع نہیں ہوئی تھیں ،فتوحات حیدریہ ،رسالہ تقیہ ،اور تشیید المطاعن کے مسودات بے ترتیب پڑے تھے عرصہ تک ان کی ترتیب و تالیف تصحیح و تنقیح میں مشغول رہے بالآخر برسوں کی کاوش کے بعد اس مہم کو سر کیا اور وہ کتابیں

شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہوئیں، اسی دوران میں مخالفین کی جانب سے ایک کتاب منتہی الکلام شائع ہوئی اور بہانگ دہل یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس کا جواب قیامت تک شیعوں کے امکان سے باہر ہے۔ اس زمانہ میں سلطنت اودھ کے حالات نہایت ابتر ہو رہے تھے اسلئے مشاہیر علماء اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکے مگر آپ نے یہ بار اپنے سر اُٹھایا اور چند ماہ کے عرصہ میں کتاب استقصاء الافحام تصنیف فرما کر منتہی الکلام کی دھجیاں اُڑا دیں مخالف وموافق سب محو حیرت ہو گئے، یہ وہ کتاب ہے جس کا طرف مقابل سے آج تک کوئی جواب نہ لکھا جا سکا۔

اس کے بعد آپ نے ایک اور مبسوط کتاب شوارق النصوص پانچ ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی، جس نے دوست و دشمن سب سے خراج تحسین حاصل، اس کی دو جلدین چند سال قبل قم سے چھپ چکی ہیں۔ پھر اور چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف ہوتی رہیں۔ مگر سب سے آخر میں جو کتاب آپ نے تصنیف فرمائی یعنی عبقات الانوار اس نے تو ہندوستان سے لیکے عرب تک آپ کے علم و فضل کا لوہا منوا دیا۔ یہی وہ عظیم ایشان کتاب مستطاب ہے جس نے آپ کو ان اساطین وارکان مذہب کی صنف میں لا کے کھڑا کر دیا ہے جن پر دین کا دارو مدار ہے اور جن کی عدیم المثال تصنیفیں مذہب شیعہ کی آیت و حجت سمجھی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ تصنیف و تالیف میں آپ نے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی جمع فرمایا جو آجتک آپ کی یادگار ہے ١٢٨١ھ میں جب آپ حج و زیارات عتبات عالیات سے مشرف ہوئے تو عراق و حجاز کے مشہور کتب خانوں کی تفصیلی سیر کی اور ایک نادر ذخیرہ کتب اپنے ہمراہ لائے۔

جس میں بیشتر کتابیں ایسی تھیں جو خاص اپنے دست مبارک سے آپ نے اصل نسخوں سے نقل فرمائی تھیں سفر سے مراجعت کے بعد پھر آپ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے اور ساری زندگی اسی شغل میں گزار دی۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے چار پانچ گھنٹوں آپ کے تمام ضروریات میں صرف ہوتے تھے باقی کل وقت اسی مشغلہ میں گزرتا تھا بیٹھے بیٹھے جب تھک جاتے تھے تو لیٹ کر کتب بینی یا تحریر کا کام انجام دیتے تھے۔ مشہور ہے کہ بکثرت مطالعہ سینہ پر کتاب رکھے رہنے سے صدر مبارک پر گھتہ پڑ گیا تھا مختصر یہ کہ آپ فنا فی العلم ہو گئے تھے۔ آخر عمر اس شدید محنت و مشقت کے باعث آپ کی

صحت خراب ہو گئی اور گونا گون امراض میں مبتلا ہو گئے، مگر اس پر بھی آپ کے مشاغل میں فرق نہ آیا جب بوجہ ضعف آپ خود لکھنے سے قاصر ہو جاتے تھے تو املاء کے ذریعہ دوسروں سے لکھواتے۔ چنانچہ وفات سے ایک روز قبل تک آپ کی یہ علمی خدمات جاری رہیں اور وفات کے روز بھی آپ گھر میں نہیں بلکہ کتب خانہ ہی میں تھے اور وہیں ۱۸ سفر ۱۳۰۶ھ ۔ق۔ کو انتقال فرمایا۔

آپ کے تصانیف عالیہ کثیرہ میں سے چند حسب ذیل ہیں استقصاء الافحام، شوارق النصوص، عبقات الانوار، کشف المعضلات فی حل المشکلات، العضب البتار مبحث آیۃ الغار، افحام اہل المین فی رد ازالۃ الغین، النجم الثاقب فی مسئلہ الحاجب، الدرر السینہ فی المکاتیب والمنشات العربیہ۔ زین الوسائل الی تحقیق المسائل ، الذرائع فی شرح الشرائع، اسفار الانوار عن وقائع افضل السفار وغیرہ، ان میں سے اکثر کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں اور ہر کتاب آپ کے فضل و کمال میں تین آیت ہی آپ کی وفات ۱۸ صفر ۱۳۰۶ھ کو ہوئی اور امامباڑۂ غفران مآب ؒمیں دفن ہوئے آپ نے اپنے بود دو فرزند چھوڑے جو علمی جلالتوں کے اعتبار سے آپ کی پوری یادگار تھے، ایک مولانا ذاکر حسین صاحب قبلہ مرحوم، دوسرے سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ۔

اس سلسلے کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی کے ایک عالم جلیل القدر کی تحریر کے ایک حصہ کا ترجمہ بھی پیش کر دیا جائے جس سے اس خاندان عالی شان کی رفعت و عزت اور خاصکر حضرت علامہ محمد قلی ؒ اور جناب فردوس مآب اعلی اللہ مقامہما کی عظمت و جلالت بخوبی نمایاں ہو جاتی ہے۔

سرکار علامہ الحاج شیخ محمد مہدی ملقب بہ شمس العلماء اعلی اللہ مقامہ جو اس صدی کے بڑے مشہور عالم جلیل المنزلت تھے اپنے بعض مامورین کو اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:

> **"تم جاسکتے ہو یا نہیں اگر جاسکتے ہو تو ضرور جاؤ وہاں ایک خاندان سادات اولعزم کا ہی علامہ سید محمد قلی اعلی اللہ مقامہ کے فرزند مولانا سید اعجاز حسین اور سید علامہ سید حامد حسین اور ان کے فرزند مولانا سید ناصر حسین ایدہ اللہ یہ خانوادہ اولاد رسول میں سے ایک بڑا گھرانا ہے اور جو خدمت اس خاندان نے مذہب حقہ اثنا عشری کی ہے وہ ایسی یو کہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ علامہ حلی اور علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہم کے بعد کو**

ئی اس منصب جلیل پر فائز نہیں ہوا میری خواہش یہ ہے کہ میری نیابت میں علامہ حامد حسین ان کے برادر محترم اور ان کے والد کی قبروں کی زیارت کرنا اور میری طرف سے سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید پڑھنا اور ان بزرگوں کی قبروں کے پاس میرے اور میری اولاد کے لئے دعا کرنا۔"

اس تحریر کے بعد حضرت علامہ محمد قلی اور جناب فردوس مآب اعلی اللہ مقامہما کے متعلق اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب بخوبی واضح ہو گیا کہ ان بزرگوں کی علمی دنیا میں کیا حیثیت اور شان تھی اور علماء کبار ان کی کیا منزلت سمجھتے تھے،

علامہ سید ناصر حسین ناصر الملت نیشاپوری لکھنوی (۱۹ جمادی الآخر ۱۲۸۴۔۱۳۶۱ھ۔ق)

اوپر کے بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ سرکار مرحوم کس باپ کے بیٹے کس دادا کے پوتے اور کس دو دمان عالیشان کے چشم و چراغ تھے، لیکن چونکہ یہ مقالہ آپ ہی کی ذات والا صفات کے ساتھ مخصوص اور معنون ہے اس لئے آپ کا تذکرہ فی الجملہ تفصیل سے ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

ولادت

آپ کی ولادت باسعادت ۱۹ جمادی الآخر ۱۲۸۴ھ بروز پنجشنبہ اول وقت نماز بمقام لکھنو میں ہوئی یہی تاریخ حضرت اسحاق پیغمبر کی پیدائش کی تھی اس لئے آپ کے عم محترم جناب مولانا سید اعجاز حسین صاحب قبلہ مرحوم سے تاریخ کی رعایت سے آپ کا نام اسحاق رکھا، مگر والد نامدار نے جیسے ہی آپ کی ولادت کی خوشخبری سُنی بے ساختہ زبان سے نکلا میرا نام حامد حسین ہی اس بچے کا نام ناصر حسین ہونا چاہیے۔

تعلیم

آپکے والد چار سال گزرتے ہی پانچویں برس یعنی ماہ رمضان ۱۲۸۸ھ میں آپ کی تعلیم شروع کرادی، مولوی لطف حسین صاحب نامی ایک بزگوار جو افاضل میں شمار ہوتے ہیں اور اچھی استعداد رکھتے تھے آپ کی تعلیم پر مقرر ہوئے، تھوڑے ہی عرصہ میں ابتدائی تعلیم کے تمام مراحل ختم ہو گئے، اب

ثانوی تعلیم کا وقت آیا تو حضرت فردوس مآب نے آپ کو اپنے آستاد حضرت علامہ مفتی سید محمد عباس صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ (۱۲۲۴۔۱۳۰۶ھ۔ق) کے حلقہ تلمذ میں داخل کر دیا۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ ایک بڑی جامع الکمال ہستی تھے، فقہ، تفسیر، اصول حدیث، تاریخ، ادب، کلام وغیرہ تمام علوم متداولہ میں آپ کو دستگاہ کامل حاصل تھی اور اردو وفارسی عربی تینوں زبانوں کے آپ بڑے زبردست شاعر اور صاحب دیوان تھے، مختلف علوم میں آپ کے تصنیفات آج تک ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مقبول خاص وعام ہیں۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس جامعیت اور کمال کے لوگ بس خال ہی خال گزرے ہیں۔ جیسے حضرت مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ تھے، اور یہی وجہ ہے کہ سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ اپنے اس تلمذ پر فخر وناز فرماتے تھے اور اکثر بر سر ممبر ذکر آجاتا تھا تو آپ حضرت مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ کی شان میں ایسے کلمات ارشاد فرماتے تھے جن سے ان کی بے عظمت و جلالت نمایاں ہوتی تھی۔ مفتی صاحب کے ساتھ ساتھ فردوس مآب نے اپنے فرزند کی تعلیم وتربیت کو اپنی نگرانی میں کامل کیا اور اس طرح کچھ ہی مدت میں وہ تمام مرحلے بھی ختم ہو گئے جن کے بعد انسان اجتہاد کی منزل پر پہونچ جاتا ہے۔

طریقہ تکمیل دروس

حضرت فردوس مآبؒ نے اپنے فرزند کی تعلیم کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ جن مسائل کی تعلیم اسی طریقہ خاص جو انھوں نے ایجاد فرمایا تھا دے چکتے تھے تو خود طالبعلم بن کر بیٹھ جاتے تھے اور آپ سے فرماتے تھے کہ اب آپ درس دیجئے اور میں پڑھتا ہوں تب آپ بھی "الامرُ فوق الادب" کے مصداق بے تکلف مطالب و نکات علمیہ اس طرح بیان فرماتے تھے جیسے کوئی متبحر استاد اپنے حلقہ تلامذہ میں بیان کرتا ہے۔ اثناء بیان میں جابجا حضرت فردوس مآبؒ متلمذانہ اعتراضات بھی کرتے جاتے تھے اور آپ اُستادانہ انداز میں ان کے تشفی بخش جوابات دیتے جاتے تھے۔

اجتہاد

یہی وہ تربیت تھی جس نے آپ کو فضل و کمال کے ان اعلیٰ مراتب پر پہنچادیا جن کی تمنا آپ کے لئے حضرت فردوس مآبؒ کے دل میں تھی، آخر جب حضرت فردوس مآب نے اپنے سند معیار پر بھی آپ کو ہر طرح کامل واکمل پایا تب اجتہاد کی سند عطا فرمائی، چنانچہ تیرہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے یعنی ۱۳۰۰ھ میں جبکہ آپ کی عمر مبارک سولہ سال سے زیادہ نہ تھی آپ منصب اجتہاد و افتاء پر فائز ہو چکے تھے۔

خطاب صدر المحققین

حضرت فردوس مآب نے اپنی ذمہ داریوں کا بہت کچھ بار آپ کے کاندھوں پر ڈال دیا، چنانچہ جسقدر بھی مسائل حضرت فردوس مآب کے پاس بغرض افتاء آتے تھے اب ان سب کی جوابدہی آپ ہی کے ذمہ ہو گئی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر جو چیز خاص طور سی آپ کے ذمہ عائد ہوئی وہ تصنیف و تالیف میں حضرت فردوس مآبؒ کی امداد اور معاونت تھی۔

حضرت فردوس مآب عبقات الانوار کی تصنیف میں اب آپ سے پوری مدد لینے لگے، چنانچہ آپکی مشہور تالیف سبایک الذھبان، جو علم رجال میں بڑی مبسوط تالیف ہی جسکی ۴۸ جلدیں ہیں آپ کے اسی روز معاونت امداد کی یادگار ہے اس کتاب کا ایک اچھا خاصہ حصہ حضرت فردوس مآب کی زندگی ہی میں آپ نے تیار کر لیا تھا، یوہیں فہرست انساب سمعانی بھی آپ کی اسی زمانہ کی تالیف ہی اس کے علاوہ اصل کتاب عبقات الانوار پر بھی آپ نے قلم اٹھایا اور کئی سو صفحے اس طرح لکھ ڈالے کہ خود حضرت فردوس مآبؒ محو حیرت ہو گئے، یہی وہ کارہائے نمایاں تھے جنھیں دیکھ کر حضرت فردوس مآب باغ باغ ہو گئے اور ان بیش بہا خدمات کے صلہ میں خوش ہو کر ازراہ قدردانی آپ کو "صدر المحققین" کا جلیل القدر خطاب عطاء فرمایا۔

والد کے بعد میدان عمل

تکمیل کے بعد پانچ سال تک حضرت فردوس مآب کے زیر سایہ رہ کر تمام مشاغل اور خاص کر عبقات کی تصنیف میں آپ انکا ہاتھ بٹاتے رہے جب ۱۸ سفر ۱۳۰۶ ہجری میں فردوس مآب نے رحلت فرمائی تو آپ کی

عمر مبارک کا اسوقت صرف بائیسواں سال تھا۔ باوجود اس کے ان کی ذمہ داریوں کا تمام بار گراں پوری طرح آپ نے اپنے دوش پر اٹھالیا بلکہ آگے بڑھے تو آپ کی ذمہ داریاں اور مصروفیات ان سے کہیں زیادہ بڑھ گئیں جو حضرت فردوس مآب کی ذات کے ساتھ مخصوص تھیں۔

حضرت فردوس مآب نے تو تصنیف و تالیف کے پیچھے گویا دنیادی تھی اور معاشرتی زندگی کو یکلخت ترک فرمادیا تھا آنا جانا تو درکنار گھر پر بھی بالعموم ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن آپ نے اس عہد پر نگاہ ڈالی تو رنگ زمانہ بدلا ہوا نظر آیا نظام ملکی متغیر ہو جانے سے حالات کروٹ لے رہے تھے، ملت حیران و سرگردان کو کسی مظبوط ناخدا کی ضرورت تھی لہذا آپ نے بضرورت وقت حضرت فردوس مآب کی زاویہ نشین والی روش کو خیر باد کہا اور خدا کا نام لیکر اصلاح قومی کے میدان میں قدم اٹھادیا آپ کی مصروفیتں بے اندازہ تھیں مگر آپ کا نظام کار ایسا تھا کہ تمام امور کو باحسن وجوہ انجام دیتے تھے۔ اور اس طرح برصغیر کے دیگر علماء و مجتھدین کے ساتھ مل کر ملت کی راہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

قومی و ملی خدمات

زمانہ اور قوم کی خستہ حالی نے جہاں آپ کے دل میں درد پیدا کیا وہاں آپ کے اور معاصرین کے دلوں میں بھی احساس کی لہر دوڑ دی چنانچہ جزبہ عمل نے آپ کو اور آپ کے معاصرین کو قوم کی اصلاح کے لیے ایک ساتھ اٹھایا اور تعاون و اشتراک عمل کی برکتوں نے آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کیا اس سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے آپ کی مقدس زندگی کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔ شیعہ کانفرنس؛
۲۔ شیعہ یتیم خانہ؛
۳۔ شیعہ کالج؛
۴۔ شیعہ عربی کالج؛

۵۔ دارالتصنیف؛
۶۔ علماء سابقین کی یاد گار کا اھتمام جیسے مزار شہید ثالث قاضی نوراللہ شوشتری کی تعمیر نو؛
۷۔ احیاامر اہل بیت اور مجالس و محافل کا اھتمام؛
۸۔ اصلاح رسوم؛
۹۔ توسیع عزاداری؛
۱۰۔ مدح صحابہ کے خلاف محاذ حسینی؛
۱۱۔ علمی وادبی خدمات؛
۱۲۔ جامعیت در علوم اور آپکی شخصیت دیگر دانشمندوں کی نگاہ میں۔

علوم وفنون مین آپ کو جو دستگاہ حاصل تھی کوئی بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا متداولہ علوم کا تو کہنا ہی کیا۔ منطق، فلسفہ، لغت، ادب، فقہ، اصول، کلام، تاریخ، حدیث، تفسیر، غرض جس علم کو دیکھیے اس میں آپ بادشاہ تھے غیر متداولہ علوم جن کے صحیح طور پر جاننے والے اب مفقود یا قریب بہ فقدان ہو چکے ہیں مثلاً علم الحروف، علم الرمل، علم الجفر، علم الکیمیا، اس کے علاوہ علم طب میں بھی آپ کو کافی مدخلیت تھی اور اکثر وبیشتر آپ اپنا علاج خود فرماتے تھے۔ البتہ بعض اطباء سے مشورہ فرما لیتے تھے اب ان سب چیزوں سے قطع نظر کر کے سیاسی دنیا میں آیئے تو یہاں بھی آپ کی وہ عظمت ومنزلت ظاہر ہوتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سر سید رضا علی بالقابہ جن کا شمار ھندوستاں کے مایہ ناز مدبرین میں ہوتا ہے اپنے تعزیت نامے مین جو آپ کی وفات کے موقع پر انھوں نے بھیجا تھا آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

۱۹۳۹ء میں جناب مرحوم کی خوبیوں سے واقف ہونے کا تھوڑا سا موقع مجھے ملا وہ وقت تمام شیعوں کے لیے سخت امتحان کا تھا۔ جب مرحوم کے ارشاد کے بموجب مجالس شوریٰ میں میں نے شرکت کی اس عالم دار گیر میں جو سکون بلند نظری فراخ دلی عالی حوصلگی اور اصابت رائے میں نے جناب مرحوم کی ذات میں پائی اس کی مثال پولٹیکل مسائل پر مباحثہ کے وقت میں نے بہت اونچے پولٹیکل حلقوں میں بھی نہیں پائی جناب مرحوم ہر مسئلہ کی تائید ومخالفت میں مختلف اور متضاد دلائل سننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے مگر

تمام پہلوئوں پر غور کرنے کے بعد جس منزل پر پہونچتے تھے پھر اسپر اس طرح جے رہتے تھے جیسے دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہمالیہ اپنی بنیاد پر قائم ہے۔ خود اظہار رائے میں کبھی سبقت نہ فرماتے تھے بلکہ حاضرین کے صلاح ومشورے کو بڑے غور وتوجہ سے سنتے تھے میں نے کبھی جناب مرحوم کو مضطرب نہیں پایا۔

آپ کی جامعیت علوم کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا یہی وہ چیز تھی جس نے ھندوستاں سے لے کر عراق ایران اور مصر تک آپ کے فضل وکمال کے جھنڈے گاڑ دیے اور بڑے بڑے علماء کا آپ کو مرجع بنا دیا جیسا کہ مولانا انیس احمد عباسی ایڈیٹر اخبار حقیقت اپنے اخبار کی اشاعت مجریہ: رجب ۶۱ھ کے ایڈٹرویل میں آپ کے سانحہ وفات پر اظہار رنج والم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا ناصر حسین صاحب مرحوم کے علم وکمال کا شہرہ صرف ھندوستان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ عراق وایران اور مصر کے علماء اکثر اھم اور پیچیدہ علمی ومذھبی مسائل میں ان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر اعاظم علماء اسلام کی بے شمار تحریروں میں سے بطور نمونہ چند کا مختصر اقتباس ہدیہ قارئین کیا جائے جن سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں آپ کیا وقعت وعظمت تھی۔

عراق کے مجتہد اعظم سرکار میرزا محمد تقی شیرازی علیہ الرحمہ جن کے احکام پر عراق سے لیکر ایران تک اور رعیت سے لیکر بادشاہ تک ہر شخص سر اطاعت خم کرتا تھا اپنے ایک مکتوب گرامی میں ااپ کو تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی امداد وحمایت سے ہر قسم کی بلائوں سے محفوظ رکھے اور حضرت حجتہ عجل اللہ ظہورہ کی نظر خاص جناب پر پڑتی رہے اور دین کی بنیادوں کو مضبوط کرتے رہیں اور دین مبین کی اشاعت میں آپ کی تائید ہوتی رہے۔"

حجتہ الاسلام سید اسماعیل علیہ الرحمہ آقای صدر کے نام سے مشہور ہیں ایک گرامی نامہ تحریر فرماتے ہیں:

"کاش یہ حقیر جناب کی خدمت میں حاضر ہوتا اور جناب کے علمی و عملی فیوض اور مواعظ ونصائح وفضائل ومناقب سے مستفید ہوتا رہتا۔"

جناب مولانا مولوی حسین میاں صاحب دام مجدہ سجادہ نشین پھلواری شریف آپ کی وفات کے موقع پر اپنے تعزیت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت ناصر الملتہ کی وفات ھندوستان، عراق اور دیگر تمام ممالک اسلامیہ میں صف ماتم، علم کا آفتاب غروب ہو گیا صد افسوس آپ کے کتبخانہ کا ایک ایک گوشہ ہر کتاب کا ایک ایک ورق اور ہر نادر نسخہ کی ایک ایک سطر حضرت کی آنکھوں کی روشنی تھی ان کے تشریف لیجانے سے بینائی علم کو مسند صاحب مسند کو اور فضیلت صاحب فضل کو ڈھونڈھ رھی ہے آہ کیا زمانہ پھر ایسی شخصیت پیدا کرے گا؟ مجھے یاد ہے حضرت قبلہ و کعبہ والد ماجد نور اللہ مرقدہ کے زمانہ قیام لکھنو میں حضرت ناصر الملتہ طیب اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا، مجھ پر بڑی شفقت فرمائی میں حنفی المذہب المشرب ہون فقہ حنفی کا وقار میرے دل ودماغ میں پیوست ہے، مگر میں اس تحریر کے ذریعہ اقرار کرتا ہوں کہ حضرت ناصر الملتہ بڑے فقیہ تھے ایسے فقیہ اور بصیرت رکھنے والے مشکل سے ہون گے میری نظر میں تو اس وقت نہیں میں نے ان کی شخصیت کو عراق میں اور ایران کے بندر بوشہر پر جانا۔"

دیگر خصوصیات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کے آخری حصہ میں اب کچھ اور چیزوں کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو آپ کی ذات والاصفات کے ساتھ مخصوص نظر آتی ہیں۔

ذہن وحافظہ

ان اہم اور خصوصی چیزوں میں جو آپ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھیں آپ کی قوت ذہن اور حافظہ بھی تھیں جس نے آپ کو سینکڑوں ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں میں ممتاز کر دیا

بالخصوص قوت حافظہ جس کی نظیر صدیوں تک نہیں ملتی، اس سلسلہ میں بے شمار قصے خاص و عام کی زبانوں پر ہیں، قرآن مجید اور نہج البلاغہ دونوں آپ کے حافظ میں تھے۔

اسی طرح بڑی بڑی مبسوط مفصل کتابیں جیسے تاریخ طبری اور طبری کی تفسیر، شیعون کی کتب اربعہ و بحارالانوار اور وسایل الشیعہ سنیوں کی صحاح ستہ سنن اور مسانید وغیرہ ان کے بارے میں آپکو یہ بتادینا کچھ دشوار نہ ہوتا تھا کہ یہ مضمون فلاں کتاب کی فلاں جلد باب اور فصل میں ہے یا یہ کہ وہاں نہیں ہے یا یہ کہ یہ مضمون فلاں سنہ کی طباعت میں تھا اور فلاں سنہ سے نکالا گیا (یہ اسلئے کہ مصری مطبوعات میں کچھ عرصہ سے ترمیم و تنسیخ اور قطع وبرید کا التزام کرلیا گیا ہے) یہ کہ یہ مضمون کن کن کتابوں میں کہاں کہاں ہے اور کن کن فقہا اور متکلمین نے کس کس جگہ (پر مقام استدلال میں پیش کیا ہے، اسی طرح اردو فارسی اور عربی کا جو شعر ایک مرتبہ آپ کے سمع و نظر سے گزر جاتا پھر وہ زندگی بھر یاد رہتا تھا مختصر یہ کہ آپ کی ذات گرامی ایک زندہ دائرۃ المعارف (انسایکلوپیڈیا) تھی یہی سبب تھا کہ بڑے بڑے علما کا آپ مرجع قرار پاگئے اور عراق ایران اور مصر تک کے علما آپ سے اپنی مشکلات حل کرتے تھے۔

مطالعہ کتب

کتب بینی کا شوق تو آپ کو زمانہ اخذ و تحصیل ہی تھا کتب درسیہ کے پڑھنے پڑھانے سے جس حد و وقت بچتا تھا وہ سب اسی میں صرف کیا جاتا تھا، لیکن تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس کام کو فریضہ قرار دے لیا گیا جاڑہ گرمی برسات سال کے بارہ مہینے روزانہ ۱۰ بجے دن سے لے ۴ بجے شام تک آپ کتب خانہ مین رہ کے کتب بینی یا تصنیف کے کام میں مصروف رہا کرتے تھے صرف جمعہ کے روز اور ولادت و شہادت معصومین کی تاریخوں میں آپ کتابخانہ نہیں تشریف لے جاتے تھے۔

وفات سے سات، آٹھ روز قبل تک باوجودیکہ مزاج ناساز گار تھا آپ برابر کتبخانہ جاتے رہے جب مرض موت نے بالکل صاحب فراش بنادیا تب کتبخانہ جانا موقوف ہوا شوق کتب بینہ کا یہ عالم تھا کہ شب کو بغیر مطالعہ کئے نیند نہیں آتی تھی جب کبھی بیمار ہوتے تھے اور مطالعہ سے مجبور ہوتے تھے تو کتاب پڑھوا

کرسنا کرتے تھے، آپکا تذکرہ لکھنے والے بعض افراد کے بقول آپ کے کتبخانہ میں مختلف علوم وفنون کی ہزارہا کتابیں ہیں اور ان میں سے مشکل سے ایسی چند کتابیں نکلیں گی جن پر آپ کے حواشی ثبت نہ ہوں اور نہ جس کتاب کو دیکھا جائے خواہ وہ کسی علم وفن کی ہو اسپر جابجا آپ کے دست مبارک کے لکھے ہوئے گرانقدر حواشی نظر آتے ہیں۔

کتب خانہ ناصریہ

یہ کتب خانہ آپ کے اب واجداد کی یادگار ہے اور علوم اسلامیہ کے ذخائر میں ایک نادر ذخیرہ ہے جس پر ہندوستان جتنا بھی فخر کرے کم ہی اسلئے کہ یہاں بعض بعض وہ کتابیں ہیں جو دنیا میں اب کہیں نہیں پائی جاتیں یہ ذخیرہ ابتداءً حضرت علامہ محمد قلی علیہ الرحمہ نے جمع کیا، اسکے بعد حضرت فردوس مآب نے اس میں قابل قدر اضافہ کیا، انھوں نے بڑی کدوکاوش اور تفحص و تلاش سے نادر نادر کتابیں فراہم کیں اس سلسلہ میں انہیں نہ صرف مال کثیر صرف کرنا پڑا بلکہ خود ممالک اسلامیہ کے کتب خانوں کی چھان بین اور اپنے دست مبارک سے نقل و کتابت کی زحمتیں بھی برداشت کرنا پڑیں، ان کے وقت وفات تک اس کتب خانہ میں دس ہزار کتابیں تھیں آپ کی باری آئی تو آپ نے اس کتب خانے کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچادیا اسلئے کہ اب اس کتب خانہ میں آپ کی بدولت تقریباً اکتالیس ہزار کتابیں بحمد اللہ موجود ہیں یوں تو اس کتب خانہ کی خصوصیت اور وجہ امتیاز ہی مولوی انیس احمد صاحب عباسی ایڈیٹر اخبار حقیقت اپنے اخبار ۲۱ رجب ۶۱ھ میں آپ اور آپ کے کتبخانہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> **"ان کے علمی کمالات کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو جو اس سے واقف ہے کہ ان کے اوقات زندگی کس طرح آخر دم تک تحصیل علم اور علمی خدمات میں صرف ہو رہے تھے ان کا شوق مطالعہ کسی خاص علم و فن کی اور ہر مذاق کی سینکڑوں کتابیں مولانا مرحوم کے حاشیوں کے ساتھ موجود ہیں چنانچہ آج سے تیس پینتیس سال قبل جب مصر کے مشہور عالم اور رسالہ المنار کے**

اڈیٹر علامہ رشید رضا ،ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ کی صدارت کرنے کے لئے تشریف لائے تو آپ کتبخانہ ناصریہ کو دیکھنے کے لیے بھی گئے اور یہاں کے علمی ذخائر دیکھ کر آپ اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے علامہ شبلی نعمانی مرحوم سے فرمایا کہ اگر میں ہندوستان سے بغیر اس کتبخانہ کو دیکھے واپس چلا جاتا تو میرا یہان آنا ہی بیکار ہو جاتا، مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس نے ایکدفعہ کہا تھا کہ لکھنو کے علمی مراکز ہونے کا سب سے بڑا ثبوت مولانا ناصر حسین صاحب کا نایاب کتب خانہ ہے اس کتبخانہ کو دیکھنے کے بعد ہی مولانا مرحوم کے ذوق کتب بینی اور ان کے شجر علمی کی وسعت بے پایان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"

تصنیف و تالیف

۱) المفردفی مسئله وجوب السورة؛ نماز میں سورہ الحمد کے بعد سورہ پڑھنا واجب ہے یا نہیں اس مسئلہ پر یہ کتاب لکھی گئی جس میں آپ کے فقہی تحقیقات کے جوہر کھلے ہیں یہ آپ کی سب سے پہلی تصنیف ہی جس پر حضرت مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ اور جناب علامیر حامد حسین نے آپ کو اجازہ اجتہاد عطا فرمایا ہے۔

۲) اسباغ النائل فی تحقیق المسائل؛

۳) انشاء؛

٤) المنشائت العربیه؛

۵) دیوان الشعر؛

٦) الخطب؛

۷) الموعظ؛

۸) مسند فاطمه بنت الحسین؛ جگر پارہ حضرت سید الشہداعلیہ السلام مکرمہ حضرت فاطمہ بنت الحسین سلام اللہ علیہا سے جو جو حدیثیں ماثور ہیں ان سب کو اس کتاب میں ایک جگہ مع تشریعی حواشی کے

ساتھ جمع کر دیا گیا ہے کتاب فن حدیث میں ایک نادر تالیف ہی جس سے آپ کی وسعت نظر اور تجربے پایان کا پتہ چلتا ہے۔

۹) نفحات الازهار فی مناقب الائمة الاطهار؛ مناقب اہلبیت علیہم السلام میں بڑی مبسوط کتاب ہے جسکی ۱۶ ضخیم جلدیں ہیں۔

۱۰) فهرست انساب سمعانی؛ یہ فہرست اس زمانہ کی یادگار ہے جب آپ نے تصنیف و تالیف کے کاموں میں حضرت فردوس مآب کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تھا۔

۱۱) سبایک الذهبان؛ یہ فن رجال کی بڑی مبسوط تالیف ہے جس کی ۴۸ جلدیں ہیں اور یہ بھی آپ کی تحقیقی عرق ریزیوں کا آئینہ ہے یہ بھی اس زمانہ کی تالیف ہے جب شروع شروع میں آپ والد کی تصنیف و تالیف میں امداد فرماتے تھے، اس کتاب میں تمام کتب رجال سے ہزار ہا راویوں کے حالات جمع کئے گئے ہیں گویا یہ کتاب فن رجال کا ایک وسیع خزانہ ہے۔ اس کا عکس مشہد مقدس میں کتابخانہ امام رضا میں موجود ہے۔

۱۲) اثبات رد الشمس لعلی علیه السلام؛

۱۳) النجاح؛ مسئلہ عقد ام کلثوم پر یہ ایک مختصر مگر بڑا کار آمد اور بیش بہا رسالہ ہے یہ بھی آپ کے عنفوان شباب کی یادگار ہے۔

۱٤) افحام الاعداء والخصوم فی تكذيب عقد ام كلثوم؛ مسئلہ عقد ام کلثوم پر یہ کتاب آخری عمر کی کتاب ہے، ہی اور بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے۔

۱۵) عبقات الانوار؛ تحفہ اثناعشریہ کے باب امامت کے جوب میں، اس کتاب کو میر حامد حسین نے شروع کیا تھا اور حدیث ولایت، حدیث نور، حدیث طیر، حدیث غدیر، چار حدیثوں پر سات جلدیں تحریر ہوئیں مگر اسکے بعد جناب فردوس مآب کی حیات نے وفا نہ کی کتاب ان کے وقت وفات ۱۳۰۶ھ تک نا تمام رہی۔ لیکن خدا کے فضل کا کیا کہنا ایسے باپ کو ایسا بیٹا دیا جو علم و تحقیق و فضل و کمال میں اس سے بھی آگے بڑھ گیا سرکار مرحوم نے عبقات کے متعلق وہی نصب العین اور وہی لائحہ عمل برقرار رکھا جس پر جناب فردوس مآب نے سات جلدیں لکھی تھیں۔

آپ نے حدیث منزلت، حدیث تشبیہ، حدیث مدینتہ العلم، اور حدیث ثقلین، چار حدیثوں پر آٹھ ضخیم جلدیں تحریر فرمائیں اور اسی آن بان اور علمی و تحقیق شان کے ساتھ جو حضرت فردوس مآب کی تھی یہاں تک کہ انداز تحریر بھی وہی بیدار کر دیا، اس بارے میں ابتداً اکثر بڑے بڑے اہل علم کو شبہہ تھا، لیکن جب ان کے سامنے آپ اور فردوس مآب دونوں کی عبارتیں رکھ دی گئیں تو وہ امتیاز نہ کر سکے کہ آپ کی عبارت کون سی ہے اور فردوس مآب کی تحریر کون سی ہے بہر حال آپ کی زندگی بھی ختم ہو گئی اور کتاب ابھی تک ناتمام ہے۔

ممالک اسلامیہ کے بڑے بڑے اہل نظر اور ماہرین فن نے اس کتاب کو دیکھ کر یہ کہہ دیا ہے کہ ایسی تحقیقی کتاب آج تک علمی دنیا کی نگاہوں سے نہیں گزری تھی مصر۔ شام۔ حجاز۔ عراق۔ ایران۔ اور افغانستان چاروں طرف اس شہرہ آفاق کتاب کا ڈنکا بج رہا ہی۔

اللہ ری عالی ظرفی وبلند نفسی سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ کی اگرچہ آپ نے حضرت فردوس مآب سے زیادہ ہی مجلدات اس کتاب کے تحریر فرمائے مگر تمام مجلدات کو انہیں کے اسم گرامی سے معنون رکھا اور بھولے سے بھی کہیں پر اس کے سلسلہ میں اپنا نام نہیں آنے دیا چنانچہ بیرونی دنیا آج تک یہی سمجھتی ہے کہ تمام مجلدات حضرت فردوس مآب ہی کی تصنیف ہیں۔

وفات

بہر حال علم و عمل کا یہ آفتاب جمعرات یکم رجب ۱۳۶۱ھ۔ق، کو غروب ہو گیا پچیس تیس ہزار افراد نے جنازہ میں شرکت کی اور بعد تجہیز و تکفین محمد سعید سعید الملۃ نے نماز پڑھائی اور حسب وصیت مرحوم کی نعش مطہر کربلائے امین الدولہ بہادر میں سونپ دی گئی۔ اور بعد میں شہید ثالث کے جوار میں آپکو منتقل کر دیا گیا۔

وصایا

آپ نے اپنا وصیت نامہ وفات سے برسوں قبل تیار کر لیا تھا یہ وصیت نامہ بہت سے وصایا پر مشتمل ہے یہاں چند وصیتیں بیان کی جاتی ہیں۔

ا۔ میرے ورثا اعقاب اور احباب خوف اور اتباع احکام الٰہی اختیار کریں اور میرے فراق میں جزع و فزع نہ کریں بلکہ صبر سے کام لیں۔

۲۔ میرے مرنے کے بعد مجھے کسی نئے لقب یا خطاب سے یاد نہ کریں بلکہ وہی الفاظ جو میری زندگی میں میرے لیے استعمال ہوتے تھے میرے بعد بھی استعمال ہوں۔

۳۔ اگر میری موت لکھنوء میں واقع ہو تو میری میت کو دریا پر غسل نہ دیں بلکہ کربلائے امین الدولہ بہادر میں غسل دیں اور وہیں سونپ دیں اور چند روز کی سپردگی کے بعد آگرہ لے جا کر مزار شہید ثالث علیہ الرحمہ میں اس طرح دفن کریں کہ قبر زمین سے بلند نہ ہو کہ زائرین مزار اقدس کے تکلیف کا باعث بنے۔

۴۔ فاتحہ خوانی اور اسکے مراسم میں اقتصاد کا لحاظ رکھیں اور وہی عنوان پیش نظر رہے جو جناب فردوس مآب کی فاتحہ خوانی میں رہا لکھنوء یا کنتور کے مراسم ہرگز نہ بجالا ئیں اگر میرے لیے ابدی ثواب کی غرض سے مجلسیں کریں تو اس میں بھی اخلاص سادگی اور اقتصاد کو پیش نظر رکھیں۔

۵۔ میرے حالات کے تذکرہ میں مبالغہ سے کام نہ لیں اور جب کبھی میرا تذکرہ کریں تو آخر میں ایک مرتبہ سورہ فاتحہ اور تین مرتبہ سورہ توحید پڑھ کے اس کا ثواب مجھے بخشیں۔

اسی طرح اور بہت سے وصایا آپ نے کئے ہیں جن سے آپ کے نفس کی پاکیزگی اور آپ کی عظمت و جلالت مرتبہ واضح ہوتی ہو۔

آخر میں قارئین کرام سے یہ استدعا ہے کہ سرکار مرحوم کے حسب وصیت ایک مرتبہ سورہ حمد اور تین مرتبہ سورہ توحید کی تلاوت فرما کے اس کا ثواب حضور مغفور کی روح کو ایصال فرمائیں۔[1]

نوٹ: بھٹی صاحب کی کتاب کے علاوہ باقی سب مذکورہ کتابوں میں تینوں شخصیات کا جدا جدا تذکرہ موجود ہے۔

[1] مزید تفصیل کے لیے رجوع کریں: تذکرہ ناصر الملۃ، مرزا احمد حسن الکاظمینی؛ مطلع انوار، سید مرتضی حسین صد الافاضل مرحوم؛ تذکرہ بی بہا، سید محمد حسین ناگانوی مرحوم؛ نذھۃ الخواطر، عبد الحیی ندوی؛ نجوم السماء، سید محمد علی کشمیری، تکملہ نجوم السماء، سید محمد مھدی کشمیری؛ طبقات اعلام الشیعہ، قرن ۱۴، ۱۳، آقای بزگ تھرانی؛ فوائد الرضویہ، شیخ عباس قمی؛ طبقات الفقھاء، زیر نظر آیۃ اللہ جعفر سبحانی دامت برکاتہ؛ طبقات المتکلمین، جمعی از مؤلفین زیر نظر آیۃ اللہ جعفر سبحانی دامت برکاتہ؛ فقہاے پاک و ہند قرن ۱۳، ج۳، ص ۲۷۰، محمد اسحاق بھٹی۔

کتاب کے بارے میں

یہ عظیم رسالہ جو چودہ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جس کا فوٹو ہم نے اس مجلہ میں آپ کی خدمت پیش کیا ہے، روز رشن کی طرح واضح ہے کی اس رسالہ میں موجود سوالوں کے تمام جوابات بر صغیر کے عظیم المرتبت مجتھد حضرت آیت اللہ العظمی جناب سید ناصر حسین ناصر الملت (۱۲۸۴۔۱۳۶۱ھ۔ق) کے قلم سے تحریر ہوئے ہیں۔

یہ سوالات مجالس سید الشھداعلیہ السلام میں پڑھی جانے والی بعض روایات و رسومات سے متعلق ہیں ،جنکو علماء اعلام عموما پڑھنے سے منع کرتے ہیں کہ یہ روایات درست نہیں ہیں ،ان موضوعات پر اگرچہ جناب ناصر الملتؒ سے پہلے بھی بعض بزرگ علماء نے قلم اٹھایاہے لیکن بر صغیر میں جناب ناصر الملت کی مرجعیت کی وجہ سے یہ موضوع مزید مورد توجہ واقع ہوا، اور جب سے یہ رسالہ تحریر ہوا ہے، موقعہ و محل کی مناسبت سے علماء کرام وصاحبان قلم اس رسالہ سے استدلال کرتے رہے ،اور اس طرح حق و حقیقت کے متلاشیوں کی یہ کتاب روز تالیف سے آج تک رہنماء بنی ہوئی ہے۔

ایک شبہ

جناب قبلہ سید حسین عارف نقوی دامت برکاتہ کہ جن کا ملت تشیع پر بہت احسان ہے، نے ا اس کتاب کے بارے میں یہ تحریر فرمادیا کہ یہ کتاب، (ہدایات ناصریہ) ناصر حسین جونپوری صاحب کی ہے۔ بس اسی ایک جملہ کو دلیل سمجھ کر بعض افراد نے اس رسالہ کو جناب ناصر الملت کے ہونے سے انکار کر دیا، اور ملت کے بزرگ علماء اعلام کو جو اس رسالہ سے بعض اوقات استدلال کرتے ہوئے اپنے مطلب کی تائید پیش کرتے تھے۔ انکے رد میں یہ لکھنا شروع کر دیا کہ پہلے آپ اس کتاب کو ناصر الملت کا ہونا ثابت کر کے قوم پر احسان کریں اور پھر اس کتاب سے استدلال کریں ،کیونکہ یہ کتاب ناصر الملت کی نہیں بلکہ ناصر حسین

جونپوری مرحوم کی ہے۔ لہٰذا محقق سید شاکر حسین امروہوی صاحب مجاہد اعظم و نجفی صاحب مدظلہ صاحب سعادت دارین کے بارے میں اس انداز سے تحریر کیا ہے۔ سعادت الدارین کے مصنف... نے امام حسین کی دو بیٹیاں ثابت کرنے کے لیے جہاں ہر حیلہ اختیار کیا ہے... سب سے زیادہ زور ناصر الملت کے حوالہ ہدایات ناصریہ پر دیا ہے... جس بنیاد پر ہر دو حضرات نے یہ عمارت تعمیر کی تھی وہ بنیاد ہی غلط ہے، ہدایات ناصریہ ناصر الملت کا رسالہ ہی نہیں ہے مجاہد اعظم کے مؤلف تو وفات پا چکے ہیں انکے چربہ نویس زندہ ہیں، وہ ثابت کریں تو قوم پر احسان ہو گا کہ ناصر الملت کا رسالہ، ہدایات ناصریہ، یہ واقعی انہی کا لکھا ہوا ہے۔[1]

حقیر نے جب یہ جملہ پڑھا تو تعجب کیا کیوں کہ اصل کتاب کا عکس میرے پاس موجود تھا اور کتاب کی داخلی و خارجی شہادتیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ یہ جوابات جناب ناصر الملت مرحوم کے ہیں۔ بہر حال ہم ان شاء اللہ اس تحریر کے ذریعے اس کتاب کو ناصر الملت کا ہونا ثابت کریں گے۔ تا کہ یہ شبہ مزید آگے نہ بڑھ سکے۔ لہٰذا اجمالاً چند دلائل تحریر کیے جا رہے ہیں کہ یہ کتاب ناصر الملت مرحوم کی ہی ہے۔

ردشبہہ

پہلی دلیل: (لکھنؤ کا سفر)

مرتب رسالہ جناب علی اکبر دہلوی نے تصریح کی ہے کہ ان سوالوں کے جوابات کی خاطر میں نے لکھنؤ کا سفر کیا، اس حوالہ سے دہلوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

> **حقیر فقیر طالب حق غلام آل طٰہ و یٰسین علی اکبر دہلوی نے اسی غرض خاص کے لئے لکھنو کا سفر کیا، اور علمائے اعلام لکھنو کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا جناب مولانا ناصر دین مبین آیت اللہ فی العالمین سند المتکلمین استاد المجتہدین جناب مولوی سید**

---

[1] ماہنامہ۔ پیام زینب سلام اللہ علیہا ،۱۴۲۸ھ۔ق۔ ۲۰۰۷ء اشاعت خصوصی برای شام بمناسبت چہلم سید الشہدا علیہ السلام ص۵۶و۱۵۔

ناصر حسین صاحب قبلہ عم فیضہ ،نے جو کچھ تحریر فرمایاواسطے فائدہ عام کے اشاعت کرنا ضروری سمجھ کر بذریعہ طبع اشتہار عام دیا،امید ہے کہ مجالس مصائب میں اب مومنین ضرور ان ہدایات مجتہد صاحب کی پابندی فرماویں گے،اور غلط اور خلاف مضامین کے بیان کرنے سے اور دیگر امور منیع کے ارتکاب سے محترز رہیں گے۔[1]

تقریب استدلال

اولاً؛اس زمانہ میں ان القاب سے لکھنو میں فقط جناب ناصر الملت ہی مراد ہیں نہ کوئی اور، کیونکہ اس نام کی ایسی کوئی دوسری اتنی قد آور شخصیت اس زمانہ میں لکھنو میں ناصر الملت کے علاوہ موجود ہی نہ تھی۔

ثانیاً؛یہ تصریح موجود ہے کہ لکھنو کا سفر کیا گیا ہے۔ جبکہ ناصر حسین جونپوری اولاً تو اس تاریخ کو زندہ نہ تھے، جسے ہم بعد میں ثابت کریں گے، دوم یہ کہ وہ خود جونپور ہی میں مدرسہ کے مدیر تھے اور وہیں فوت ہوئے اور اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہیں۔

دوسری دلیل:(سوالات کی تاریخ)

سائل جناب میر اکبر علی خلف میر احمد علی دہلوی، نے ۱۴ سوال کے آخر میں تصریح فرمائی ہے کہ یہ سوال ۷ اصفر المظفر ۱۳۲۲ھ ق۔ کو پوچھے گئے ہیں، اس بات سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ اس سے مراد جناب ناصر حسین ناصر الملت ہی ہیں۔ کیونکہ تمام ارباب تراجم نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ جناب ناصر حسین جونپوری (۱۲۵۴ میں پیدا ہوئے اور ۱۴ رجب المرجب ۱۳۱۳ھ۔ق) میں یعنی ان سوالات سے ۹ سال قبل جونپور میں فوت ہو چکے تھے۔[2]

---

[1]۔ہدایات ناصریہ ص ۲۔

[2]۔ مزید تفصیلات کے لیے رجوع فرمائیں: تجلیات معروف بہ تاریخ عباس ج ۲ ص ۲۸۱ ذیل ذکر تلامذہ مفتی عباس؛ تذکرہ بی بہا ص ۴۲۱؛ مطلع الانوار ص ۶۵۷؛ اعیان الشیعہ ج ۱۰ ص ۲۰۱؛ کشف الاسرار فی شرح الاستبصار ج ۱ ص ۴۰۵؛ طبقات اعلام الشیعہ نقباء البشر ج ۵ ص ۴۸۹۔

جناب حسین عارف نقوی دامت برکاتہ کی کتاب برصغیر کے امامیہ مصنفین ج۲ص ۲۵۴ اسی کتاب ہدایات ناصریہ کی معرفی کرتے وقت نقوی صاحب نے تاریخ وفات یہی ۱۳۱۳ھ تحریر فرمائی ہے۔

تیسری دلیل:(سوالات کی تاریخ کی تائید)

اس بات کی دلیل کہ یہ سوالات جناب ناصر حسین جونپوری کے وفات کے بعد ہوئے ہیں یہ ہے کہ جناب ناصر الملت نے ۱۴ چودھویں سوال کے آخر میں قاری کو رسالہ لولو والمرجان کی طرف ارجاع دیا ہے اور محدث نوری کے نام کے ساتھ رح لکھا ہے اصل عبارت یہ ہے:

اس کے متعلق جو افادات جناب ثقۃ الاسلام آیت اللہ فی الانام جناب مرزا حسین النوری الطبرسی رح نے رسالہ لولووالمرجان میں مرقوم فرمائی ہیں وہ قابل مراجعت وعمل ہیں۔

تقریب استدلال

محدث نوری کے ساتھ لفظ رح آیا ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ محدث نوری کا انتقال /۱۳۲۰ھ۔ق میں ہوا ہے۔یعنی ان کے انتقال کے دو سال بعد یہ سوالات وجوابات ہورہے ہیں اور جون پوری مرحوم محدث نوری سے پہلے انتقال فرما چکے تھے۔

چوتھی دلیل:(کتاب لولووالمرجان کا حوالہ)

۱۴ چودھویں سوال کے جواب میں کتاب،لولو والمرجان کا حوالہ دیا گیا ہے،اور خود یہ کتاب محدث نوریؒ نے روز جمعہ ۱۰ ذالحجۃ ۱۳۱۹ھ۔ق کو تالیف کی ہے،یعنی جناب جونپوری کی وفات کے ۶ چھ سال بعد یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

پانچویں دلیل:(ناصر الملت مرحوم کی مہر شریف)

سب سے روشن اور واضح دلیل کتاب کے آخر میں جناب ناصر الملت مرحوم کی مہر ثبت ہے جس میں یہ عبارت تحریر ہے:

«لا اله الا الملك بالحق المبين،عبده ناصر حسين بن علامه حامد حسين الموسوی النيشاپوری»

جبکہ ناصر حسین جونپوری مرحوم کے والد کا نام سید مظفر حسین ہے۔

چھٹی دلیل:(کتاب کا ناصر الملت کی زندگی میں چھپ جانا)

رسالہ ہدایات ناصریہ جناب ناصر حسین ناصر الملت کی حیات یعنی ۱۳۲۲ھ میں چھپ چکا تھا،اور ناصر الملت کی زندگی ہی میں علماء جناب کا نام لے کر اس کتاب سے استدلال کرتے تھے،جیسے کتاب،مجاھد اعظم ص،۲۴۵،۳۲۱،۳۴۹چاپ جدید یہ کے مؤلف جناب علامہ سید شاکر حسین امروہوی کہ جو ناصالملت کے ہم عصر ہیں کتاب محرم ۱۳۶۱ھ میں تحریر ہوئی ہے،اور ناصر الملت کا انتقال بروز جمعرات یکم رجب ۱۳۶۱ھ،ہوا ہے۔

اس کتاب میں بار بار ناصر الملت کو مولانا سید ناصر حسین مجتہد العصر لکھنو لکھا گیا ہے،لیکن اس مدت میں کسی موقع پر یہ نہیں دیکھا گیا کہ جناب نے اس نسبت کو اپنی طرف سے رد کیا ہو،اور اسی طرح کتاب نزھۃ المشتاق کہ جس میں رد شادی قاسم کے فتاوی موجود ہیں اس میں بھی آیت اللہ العظمی سید اسماعیل صدر نے اس مسئلہ میں اھل ہندوستان کو جناب ناصر الملت کی بات ماننے کا حکم دیا ہے۔

ہمارے خیال میں حق و حقیقت کے روشن ہونے کے لیے اتنا بہت کچھ ہے،مزید بحث ہم اس وقت کریں گے جب ہدایات ناصریہ کو جداگانہ کامل تحقیقات کے ساتھ چھاپ کرائیں گے ان شاءاللہ۔

لہذا جب اس کتاب کی تالیف ہی جونپوری صاحب کی وفات کے ۹سال بعد ہوئی ہے،اور ناصر الملت مرحوم نے اپنے والد کے نام کی بھی تصریح فرمادی ہے،اب بھی اگر اس کتاب کو جونپوری صاحب کی تالیف کہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ مستند حوالہ جات کے ساتھ۔

اولاً؛ ۱۳۲۲ھ تک جونپوری کا زندہ ہونا، **ثانیاً؛** مہر کے جعلی ہونا، **وثالثاً؛** ناصر حسین جونپوری کے والد کا نام حامد حسین موسوی النیشاپوری ہونا ثابت کرے۔

نوٹ:

۲۰۱۰ء میں حقیر نے کتابوں کی خریداری کے لیے اسلام آباد اور پشاور کا سفر کیا اور اسی سفر کے دوران محسن تشیع جناب علامہ آفتاب حسین جوادی دامت برکاتہ اور محقق عالی قدر سرمایہ ملت تشیع سیادت مآب جناب سید حسین عارف نقوی دامت برکاتہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ دوران گفتگو اسی ہدایات ناصریہ کا ذکر چھڑا۔ حقیر کے موبائل میں اصل کتاب کا عکس موجود تھا جب ان بزرگواروں کو دکھایا اور مذکورہ بالا باتیں ذکر کیں تو خود جناب حسین عارف نقوی صاحب مدظلہ نے بندہ حقیر کو حکم دیا تھا کہ ان دلائل کو تحریر کر کے چھپوائیں، تاکہ حقیقت روشن ہو سکے۔

نسخہ عکسی کتاب "ہدایات الناصریہ"

الوقف لله

هذا بيان للناس وهدى وموعظة للمتقين

هدايات ناصريه

۱۳۲۲

در مطبع یوسفی دهلی طبع شد

۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصائب جناب سید الشہدا علیہ السلام میں گریہ و زاری باعث اجر جمیل او ثواب عظیم ہے اور جن مضامین کی بابت یقیناً علم ہو یا ظن غالب ہو کہ خلاف حق ہیں انکو مصائب امام حسین علیہ السلام سمجھنا خلاف عقل ہے بلکہ ایسے مضامین کا پڑھنا سننا او رسنانا محنت برباد گنہ لازم کا مصداق ہے اور بہت سے مضامین واقعہ کربلا کے متعلق ایسے مشہور ہیں جن میں عرصہ سے اشتباہ او رخلجان واقع تھا کہ علماء محققین کی تحریر و تقریر سے انکا غلط یا ضعیف ہونا پایا جاتا ہے او رحضرات ذاکرین بغرض رونق مجالس بہت شد و مد سے بقول شخصے نمک مرچ ملا کر انکو بیان کرتے ہیں اور عام مومنین انکو واقعی او رصحیح جانکر اسکے منکر کو خارج مذہب قرار دیتے ہوں تو عجب نہیں اور انکا امور مذکورہ کی بابت اسقدر اصرار ہے کہ شاید مسائل اصول دین پر بھی ایسا اصرار نہو او ران پر گریہ و زاری کو باعث اجر و ثواب کا سمجھتے ہیں لہذا احقر فقیر طالب حق غلام آل طہ و یٰسین سید اکبر علی دہلوی نے اسی غرض خاص کے لیئے لکھنو کا سفر کیا او رعلمائے اعلام لکھنو کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا جناب مولانا ناصر دین مبین آیۃ اللہ فی العالمین سند المتکلمین سناد المجتہدین جناب مولوی سید ناصر حسین صاحب قبلہ عمہ فیضہ نے جو کچھ تحریر فرمایا او سکی فائدہ عام کے اشاعت کرنا ضروری سمجھکر بذریعہ طبع اشتہار عام دیا امید ہے کہ مجالس مصائب میں اب مومنین ضرور ان ہدایات مجتہد صاحب کی پابندی فرماوینگے او رغلط او رخلاف مضامین کے بیان کرنے سے او ر دیگر امور منہیہ کے ارتکاب سے محترز رہینگے -

۳

کیا فرماتے ہین علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل مندرجہ ذیل مین

(۱) **سوال** جناب امام حسین علیہ السلام کی مجالس عزا مین گریہ و بکا کے لئے کسی قسم کا باجہ بجانا حلال ہے یا حرام؟

الجواب و باللہ التوفیق یقیناً حرام ہے اور بالخصوص ایسے محل مین جرم ارتکاب باجہ بجانے کا وزر عظیم رکھتا ہے واللہ العالم

(۲) **سوال** ضعیف روایتون کا باوجود علم ضعف ہو جانے یا کسی عالم کے ٹوک دینے کے بغرض گریہ و بکا پڑھنا جائز ہے یا نہین؟

الجواب و باللہ التوفیق اُن روایات ضعیفہ کا پڑھنا جو مظنون الکذب ہون ہرگز جائز نہین ہے واللہ اعلم

(۳) **سوال** باطل اور غلط روایتون کا پڑھنا اور آئمہ معصومین علیہم السلام اور اُنکے عزیزان خاص مثل جناب زینب خاتون و ام کلثوم و جناب فاطمہ و سکینہ خاتونون سے منسوب کر دینا کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب و باللہ التوفیق باطل اور غلط روایتون کا پڑھنا خواہ وہ منسوب بآئمہ معصومین علیہم السلام ہون یا منسوب اُنکے عزیزان خاص سے ہون یا کسی اور کی طرف منسوب ہون کسی طرح جائز نہین ہے اور نسبت امر باطل کی حضرات معصومین علیہم السلام کی طرف بہ نسبت اُنکے غیر کے زیادہ تر سبب ذنب و وبال ہے اور چونکہ نسبت نقص یا باطل کی حضرات معصومین علیہم السلام کی طرف موجب توہین اُنکے لیئے ہوتی ہے لہذا اس قسم کے افتراوات کا اُن حضرات سے منسوب کرنا مخرج عن الایمان بلکہ مخرج عن الاسلام ہے اعاذنا اللہ من ذلک

۴

وہو العاصم۔

(۴) **سوال** عقد قاسم ابن الحسن علیہ السلام کا میدان کربلا مین ہونا صحیح ہے یا ضعیف یا افترائے محض؟

الجواب وباللہ التوفیق قصہ عقد حضرت قاسم بن الحسن علیہما السلام بے اصل محض ہے واللہ اعلم۔

(۵) **سوال** جناب فاطمہ صغرےٰ کا مدینہ مین رہنا بوجہ مرض صحیح ہے یا ضعیف یا کذب صریح؟ جناب امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادیان کے تھین؟

الجواب وباللہ التوفیق روایات مستفیضہ متکاثرہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ جناب فاطمہ صغرےٰ ہمراہ جناب سید الشہداء علیہ السلام معرکہ کربلا مین موجود تھین اور انکا مدینہ مین رہنا بوجہ مرض کے کسی ضعیف روایت مین بھی نہین دیکھا ہان بحار الانوار مین ایک روایت مشتمل بر ذکر غراب ایسی پائی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ صغرےٰ مدینہ مین تھین لیکن یہ روایت غراب نہو ہے جیسا کہ مجلسی علیہ الرحمہ نے خود اسکی تصریح جلاء العیون مین فرمادی ہے چنانچہ بعد اس روایت کے ذکر کے تحریر فرماتے ہین "واین حدیث خالی از غرابتے نیست بجہت مخالفت باخبار دیگر" بالجملہ چونکہ یہ روایت ماخوذ ہے منتخب طریحی خوارزم حنفی سے او ضعیفۃ السند ہے اور مخالف روایات کثیرہ معتبرہ ہے لہذا قابل قبول نہین ہوسکتی اور جناب سید الشہداء علیہ السلام کی صاحبزادیان بنا بر قول مشہور دو تھین ایک حضرت فاطمہ صغرےٰ دوسری حضرت سکینہ واللہ اعلم

(۶) **سوال** جناب سکینہ خاتون نے زندان شام مین انتقال فرمایا ہے

۵

یا کسی اور لڑکی نے - یا یہ روایت انتقال مصنوعی ہے ؟

الجواب وباللہ التوفیق جناب سکینہ کا زندان شام مین انتقال کرنا بالکل غلط ہے اور طرق معتبرہ سے ثابت ہے کہ آپ بعد جناب سید الشہدا علیہ السلام ایک مدت تک زندہ رہین البتہ کتاب منتخب فخر الدین بن طریح نجفی مین ایک روایت ایسی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب امام حسین علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے جنکا سن تین برس کا تھا زندان شام مین انتقال فرمایا اور چونکہ اصل روایت مین ان صاحبزادی کا کوئی نام مذکور نہین ہے لہذا بالتعیین نہین کہا جا سکتا کہ انکا کیا نام تھا لیکن ممکن ہے کہ نام انکا زینب ہو اسلئے کہ بنا بر ایک قول کے جناب سید الشہدا علیہ السلام کے تین صاحبزادیاں تھین ایک فاطمہ دوسری سکینہ تیسری زینب اور چونکہ جناب فاطمہ و سکینہ کا بعد جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ایک مدت تک موجود رہنا ثابت ہے اور انکے بعض حالات طرق موثوق بہا مین وارد ہین اور حضرت زینب بنت الحسین علیہ السلام کا کوئی حال ثابت نہین لہذا اقرب قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی نے زندان شام مین انتقال کیا وہ حضرت زینب بنت الحسین علیہ السلام تھین اور کچھ عجب نہین کہ شام مین جو روضہ حضرت زینب کا مشہور ہے وہ یہی زینب بنت الحسین علیہ السلام ہون نہ حضرت زینب بنت علی علیہ السلام کیونکہ حضرت زینب بنت علی علیہ السلام کا بعد اسیری شام سے مدینہ کی طرف مراجعت کرنا ثابت ہے اور بار دیگر حسب طلب یزید پلید ملعون شام کی طرف جانا اور وہان انتقال کرنا جیسا کہ بعض روضہ خوانون نے بعض روایات مختلفہ افترا کیا ہے غلط محض ہے اور بعض علما معاصرین اہل عراق

۶

جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ کتاب منتخب مین روایت وفات رقیہ بنت الحسین علیہ السلام مذکور ہے اور روضہ انکا شام مین موجود ہے عند التحقیق اشتباہ در اشتباہ ہے اور چونکہ مقام مقتضی بسط کا نہین ہے لہذا انکے کلام پر بہ تفصیل کلام کرنے سے اعراض کیا جاتا ہے واللہ اعلم۔

(۷) **سوال** ہندہ زوجہ یزید کون تھی آسے اہلبیت رسالت سے کیا تعلق تھا۔ اسکا زندان شام مین آنا صحیح ہے یا نہین اسکے بطن سے کوئی اولاد تھی یا نہین؟

الجواب وباللہ التوفیق بحار الانوار مین منقول ہے کہ ہند زوجہ یزید لعنۃ اللہ عبداللہ بن عامر بن کریز کی دختر تھی اور قبل یزید کے وہ زوجہ امام حسین علیہ السلام کی تھی اور اسکا مجلس یزید مین نکل آنا تو روایات معتبرہ مین وارد ہے لیکن زندان شام مین اسکا کسی روایت معتبرہ مین مذکور نہین ہے اور بنا بر تصریح مورخین مخالفین مثل طبری و ابن الاثیر یزید ملعون کا ایک لڑکا بطن ہند بنت عبداللہ بن عامر سے تھا جسکا نام عبداللہ تھا اور لقب اسکا اسوار تھا اور وہ فن تیر اندازی مین بہت ماہر تھا واللہ اعلم

(۸) **سوال** شیرین کون تھی؟ ہمراہ جناب امام حسین علیہ السلام کا اسکے یہاں جانا صحیح ہے یا غلط؟

الجواب وباللہ التوفیق شیرین کے جناب شہربانو کا حال مطلقاً کتب معتبرہ مین نہین ہے اور شیرین کا قصہ جس طرح مراثی ہندیہ مین نظم ہے وہ بالکل غیر معتبر ہے اور صاحب روضۃ الشہدا نے جس طرح اسکو لکھا ہے وہ بھی معتبر نہین ہے واللہ اعلم۔

(۹) **سوال** شہریار کون تھا؟ اسکا کربلائے معلی مین بعد شہادت جناب سید الشہدا علیہ

۷

آتا جیسا کہ ذاکرین پڑھتے ہین صحیح ہے یا غلط ؟

الجواب وباللہ التوفیق شہر بار کا حال مطلقاً کتب معتبرہ مین نہین ہے اور اُسکا قصہ جسطرح روضہ خوان پڑھتے ہین وہ بالکل غلط اور سر بسر خلاف اقوال مسلمہ مورخین فریقین ہے واللہ اعلم۔

(۱۰) **سوال** شاہ حلب کی دختر سے جناب علی اکبر کا خطبہ ہونا کیا اصل رکھتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق قصہ مذکورہ غلط محض اور دروغ بے فروغ ہے اور اوّلی التتبع کتب معتبرہ تواریخ و سیر پر ظاہر ہے کہ حلب عہد خلیفہ ثانی مین مفتوح ہوا اور وہ ملک شام مین واقع ہے اور شام کا حاکم عہد خلیفہ ثانی سے معاویہ بن ابی سفیان رہا ہے اور مثل دیگر بلاد شام حلب اُسی کے تصرف مین تھا اور اُسکی طرف سے حسب دستور وہان بعض حکام و عمّال رہا کرتے تھے اور یہی کیفیت حلب کی آخر زندگی معاویہ تک رہی تا اینکہ عہد یزید علیہ اللعن ہوا پس وہ شاہ حلب کہان تھا جس کی دختر کے ساتھ عقد حضرت علی اکبر علیہ السلام کا قرار پائے بالجملہ یہ قصہ فرضی محض ہے واللہ اعلم۔

(۱۱) **سوال** جناب شاہ زنان شہر بانو کا انتقال کب اور کہان ہوا ؟

الجواب وباللہ التوفیق کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شہر بانو والدہ ماجدہ جناب امام زین العابدین علیہ السلام نے قریب ولادت جناب امام زین العابدین ع انتقال فرمایا اور کتاب مناقب ابن شہر آشوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب شہر بانو واقعہ کربلا مین غرق فرات ہو گئین اور ان دونون روایتون مین کلام حسب تحقیق بسط و تفصیل کا مقتضی ہے اور وہ یہان مناسب نہین ہے واللہ اعلم

۸

(۱۲) **سوال** جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ یا جناب امیر المومنین علیہ السلام یا جناب امام حسین علیہ السلام کے لشکر مین کسی قسم کے باجہ کا ہونا ثابت ہے یا نہین ؟ مشرکین وکفار ومنافقین کے لشکرون مین تو باجہ ضرور ہوتا تھا ؟

الجواب وباللہ التوفیق ان حضرات کے لشکر مین کسی باجہ کا ہونا ثابت نہین ہے واللہ اعلم۔

(۱۳) **سوال** روز عاشورہ کیا دن تھا معصوم کی روایت سے جو ثابت ہوا ہو وہ ارشاد ہو ؟

الجواب وباللہ التوفیق فعلاً میری نظر مین کوئی روایت ایسی جو منتہی معصوم علیہ السلام کی طرف ہو تعیین روز عاشورا مین نہین ہے لیکن دیگر روایات سے جو منتہی غیر معصوم کی طرف ہوتی ہین یہ ثابت ہوتا ہے کہ روز عاشورا روز جمعہ تھا اور یہ امر موافق استخراج حسابی کے بھی ہے اور اس باب مین جو اختلاف ہے اوسکی تحقیق و تنقیح کے لئے بھی بسط مقال چاہئے واللہ اعلم۔

(۱۴) **سوال** خدا ورسول وائمہ ہدیٰ وعلماء دین پر افترا کرنا کیا حکم رکھتا ہے بینوا توجروا رحمکم اللہ

۲۳ شوال ۱۳۵۰ھ

المستفتی بندہ میر اکبر علی خلف میر احمد علی صاحب غفر اللہ [illegible]

جواب یہ امر عظیم گناہان کبیرہ سے ہے اور نہایت موجب وبال ہے اور اس کے متعلق جو افادات جناب ثقۃ الاسلام آیۃ اللہ فی الانام جناب میرزا [illegible] نے رسالہ لولو و مرجان مین مرقوم فرمائی ہین وہ قابل حجت و عمل ہین و فی ذلک کفایۃ [illegible] قاطبۃ المومنین لذالک [illegible] الموفق - ناصر حسین الموسوی غفر اللہ له اصلح اعماله -

متن کتاب

مصائب جناب سید الشہدا علیہ السلام میں گریہ وزاری باعث اجر و جمیل اور ثواب عظیم ہے،اور جن مضامین کی بابت یقیناً علم یا ظن غالب ہو کہ خلاف حق ہیں ان کو مصائب امام حسین علیہ السلام سمجھنا خلاف عقل ہے، بلکہ ایسے مضامین کا پڑھنا سننا اور سنانا محنت برباد گنہ لازم کا مصداق ہے، اور بہت سے مضامین واقعہ کربلا کے متعلق ایسے مشہور ہیں جن میں عرصہ سے اشتباہ اور خلجان واقع تھا، کہ علماء محققین کی تحریر و تقریر سے انکا غلط یا ضعیف ہونا پایا جاتا ہے اور حضرات ذاکرین بغرض رونق مجالس بہت شد و مد سے بقول شخصی نمک مرچ ملا کر ان کو بیان کرتے ہیں اور عام مومنین ان کو واقعی اور صحیح جان کر اسکے منکر کو خارج مذہب قرار دیتے ہوں، تو عجب نہیں، اور ان کو امور مذکورہ کی بابت اس قدر اصرار ہے کہ شاید مسائل اصول دین پر بھی ایسا اصرار نہ ہو، اور ان پر گریہ وزاری کو باعث اجر و ثواب کا سمجھتے ہیں۔

لہذا حقیر فقیر طالب حق غلام آل طہ ویسین علی اکبر دہلوی نے اسی غرض خاص کے لئے لکھنو کا سفر کیا، اور علمائے اعلام لکھنو کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا جناب مولانا ناصر دین مبین آیۃ اللہ فی العالمین سند المتکلمین استاد المجتہدین جناب مولوی سید ناصر حسین صاحب قبلہ عم فضیہ، نے جو کچھ تحریر فرمایا واسطے فائدہ عام کے اشاعت کرنا ضروری سمجھ کر بذریعہ طبع اشتہار عام دیا، امید ہے کہ مجالس مصائب میں اب مومنین ضرور ان ہدایات مجتہد صاحب کی پابندی فرماویں گے، اور غلط اور خلاف مضامین کے بیان کرنے سے اور دیگر امور منیع کے ارتکاب سے محترز رہیں گے، کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

سوال نمبر ۱:۔ جناب امام حسین علیہ السلام کی مجالس عزا میں گریہ وبکا کے لئے کسی قسم کا باجہ بجانا حلال ہے یا حرام؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق: یقیناً حرام ہے اور بالخصوص ایسے محل متبرک میں ارتکاب باجہ بجانے کا وزر عظیم رکھتا ہے، واللہ العالم

سوال نمبر ۲:۔ ضعیف روایتوں کا باوجود علم ضعف ہو جانے یا کسی عالم کے ٹوک دینے کے بغرض گریہ وبکا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ وباللہ والتوفیق: ان روایات ضعیفہ کا پڑھنا جو مظنون الکذب ہوں ہرگز جائز نہیں ہے واللہ العالم۔

سوال نمبر ۳:۔ باطل اور غلط روایتوں کا پڑھنا اور آئمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے عزیزان خاص مثل جناب زینب خاتون، اور ام کلثوم، وجناب فاطمہ، وسکینہ خاتون، سے منسوب کر دینا کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:۔ وباللہ والتوفیق۔ باطل اور غلط روایتوں کا پڑھنا خواہ وہ منسوب بہ معصومین علیہم السلام ہوں، یا منسوب ان کے عزیزان خاص سے ہوں، یا کسی اور کی طرف منسوب ہوں۔ کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اور نسبت امر باطل کی حضرات معصومین علیہم السلام کی طرف بہ نسبت ان کے غیر زیادہ تر سبب وزر وبال ہے، اور چونکہ نسبت بعض اباطیل کی حضرات معصومین علیہم السلام کی طرف موجب توہین ان کے لئے ہوتی ہے، لہذا اس قسم کے افتراءات کا ان حضرات سے منسوب کرنا مخرج عن الایمان بلکہ مخرج عن السلام ہے، اعاذنا اللہ من ذلک وہو العاصم۔

سوال نمبر ۴:۔ عقد حضرت قاسم ابن الحسن کا میدان کربلا میں ہونا صحیح ہے یا ضعیف ہے یا افترائے محض ہے؟

جواب:۔ واللہ باللہ التوفیق۔ قصہ عقد حضرت قاسم ابن الحسن علیہما السلام بے اصل محض ہے۔ واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۵:۔ جناب فاطمہ صغراء کا مدینہ میں رہنا بوجہ مرض صحیح ہے یا ضعیف یا کذب صریح؟ جناب امام حسین علیہ الاسلام کی صاحبزادیاں کے تمہیں؟

جواب:۔ واللہ التوفیق۔ روایات مستفیضہ متکاثرہ معتبرہ سے ثابت ہے۔ کہ جناب فاطمہ فاطمہ صغریٰ ہمراہ جناب سید شہداء معرکہ کربلا میں موجود تھیں، اور ان کا مدینہ میں رہنا بوجہ مرض کے کسی ضعیف

روایت میں بھی نہیں دیکھا، ہاں بحارالانوار میں ایک روایت مشتمل بر ذکر غراب ایسی پائی جاتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ صغریٰ مدینہ میں تھیں، لیکن یہ روایت غراب غریب ہے، جیسا کہ مجلسی علیہ رحمہ نے خود اس کی تصریح جلاء العیون میں فرمادی ہے۔

چنانچہ بعد اس روایت کے ذکر کے تحریر فرماتے ہیں:

«این حدیث خالی از غرابتی نیست بجهت مخالفت بااخبار دیگر»

بالجملہ چونکہ یہ روایت ماخوذ ہے مقتل اخطب خوارزم حنفی سے اور ضعیفۃ السند ہے، اور مخالف روایات کثیرہ معتبرہ ہے لہذا مقبول نہیں ہو سکتی، اور جناب سید شہداء علیہ الاسلام کی صاحبزادیاں بنابر قول مشہور دو تھیں ایک حضرت فاطمہ صغریٰ اور دوسری حضرت سکینہ واللہ اعلم۔

سوال نمبر۶:۔ جناب سکینہ خاتون نے زندان شام میں انتقال فرمایا ہے یا کسی اور لڑکی نے۔ یا یہ روایت انتقال مصنوعی ہے؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق۔ جناب سکینہ انتقال کرنا زندان شام میں بالکل غلط ہے اور طریق معتبرۃ سے ثابت ہے کہ آپ بعد جناب سید شہداء علیہ السلام ایک مدت تک زندہ رہیں، البتہ کتاب منتخب فخر الدین بن طریح نجفی، میں ایک روایت ایسی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب امام حسین علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے جس کا سن تین برس کا تھا زندان شام میں انتقال فرمایا، اور چونکہ اصل روایت میں ان صاحبزادی کا کوئی نام مذکور نہیں ہے لہذا بایقین نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا کیا نام تھا لیکن ممکن ہے کہ نام ان کا زینب ہو، اس لئے کہ بنابر ایک قول کے جناب سید شہداء کے تین صاحبزادیاں تھیں۔ ایک فاطمہ دوسری سکینہ تیسری زینب اور چونکہ جناب فاطمہ وسکینہ کے بعد جناب سید شہداء علیہ السلام کے ایک مدت تک موجود رہنا ثابت ہے اور ان کے بعض حالات طرق موثوق بہا۔ میں وارد ہیں اور حضرت زینب بنت الحسین علیہ السلام کا کوئی حال ثابت نہیں، لہذا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی نے زندان شام میں انتقال کیا وہ حضرت زینب بنت الحسینؑ تھیں، اور کچھ عجیب نہیں کہ شام میں جو روضہ حضرت زینب کا مشہور ہے وہ یہی زینب بنت الحسینؑ ہوں، نہ حضرت زینب بنت علی علیہ السلام۔

کیونکہ حضرت زینب بنت علی علیہ السلام کا بعد اسیری شام سے مدینہ کی طرف مراجعت کرنا ثابت ہے، اور بار دیگر حسب الطلب یزید ملعون شام کی طرف جانا، اور وہاں انتقال کرنا جیسا کہ بعض روضہ خوانوں نے بعنوانات مختلفہ افتراء کیا ہے۔ غلط محض ہے، اور بعض علماء معاصرین اہل عراق نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ کتاب منتخب میں روایت وفات رقیہ بنت الحسینؑ علیہ السلام مذکور ہے، اور روضہ ان کا شام میں موجود ہے، عند التحقیق اشتباہ در اشتباہ ہے، اور چونکہ مقام مقتضی بسط کا نہیں ہے لہذا ان کے کلام پر یہ تفصیل کلام کرنے سے اعراض کیا جاتا ہے، واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۷:۔ ہندہ زوجہ یزید کون تھی اسے اہلبیت رسالت سے کیا تعلق تھا۔ اس کا زندان شام میں آنا صحیح ہے یا نہیں اس کے بطن سے کوئی اولاد تھی یا نہیں؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق۔ بحارالانوار میں منقول ہے کہ ہندہ زوجہ یزید لعنہ اللہ عبد اللہ بن عامر بن کریز کی دختر تھی، اور قبل یزید کے وہ زوجہ امام حسین کی تھی، اور اس کا مجلس یزید میں نکل کر آنا تو روایات معتبرہ میں وارد ہے، لیکن زندان شام میں اس کا کسی روایت معتبر میں مذکور نہیں ہے، اور بنابر تصریح مورخین مخالفین مثل طبری وابن الاثیر یزید ملعون کا ایک لڑکا بطن ہندہ بنت عبد اللہ بن عامر سے تھا جس کا نام عبد اللہ تھا اور لقب اس کا اسوار تھا، اور وہ فن تیر اندازی میں بہت ماہر تھا واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۸:۔ شیرین کون تھی، سر جناب امام حسین علیہ السلام کا اس کے پاس جانا صحیح ہے یا غلط؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق شیرین کنیز جناب شہربانو کا حال مطلقا کتب معتبر میں نہیں ہے، اور شیرین کا قصہ جس طرح مراثی ہندیہ میں نظم ہے، وہ بالکل غیر معتبر ہے اور صاحب روضۃ الشہداء جس طرح اس کو لکھا ہے وہ بھی معتبر نہیں ہے واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۹:۔ شہریار کون تھا اس کا کربلائے معلی میں بعد شہادت سید الشہداء علیہ السلام آنا جیسا کہ ذاکرین پڑھتے ہیں صحیح ہے یا غلط؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق شہریار کا حال مطلقا کتب معتبر میں نہیں ہے، اور اس کا قصہ جس طرح روضہ خوان پڑھتے ہیں وہ بالکل غلط اور سراسر خلاف واقعات مسلمہ مورخین فریقین ہے واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۱۰:۔ شاہ حلب کی دختر سے جناب علی اکبر کا خطبہ ہونا کیا اصل رکھتا ہے؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق: قصہ مذکورہ غلط محض اور دروغ بے فروغ ہے، اور ادنی تتبع کتب معتبرہ تواریخ وسیر پر ظاہر ہے، کہ حلب عہد خلیفہ ثانی میں مفتوح ہوا اور ملک شام میں واقع ہے، اور شام کا حاکم عہد خلیفہ ثانی سے معاویہ بن ابی سفیان رہا ہے، اور مثل دیگر بلاد شام حلب اسی کے تصرف میں تھا، اور اس کی طرف سے حسب دستور وہاں بعض حکام وعمال رہا کرتے تھے، اور یہی کیفیت حلب کی آخر زندگی معاویہ تک رہی، تا اینکہ عہد یزید علیہ لعن ہوا، پس وہ شاہ حلب کون تھا جس کی دختر کے ساتھ عقد حضرت علی اکبر کا قرار پائے بالجملہ یہ قصہ افترائے محض ہے واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۱۱:۔ جناب شاہ زناں شہربانو کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق: کتاب عیون الاخبار الرضا علیہ السلام سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شہربانو والدہ ماجدہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے قریب ولادت جناب امام زین العابدین علیہ السلام انتقال فرمایا اور کتاب مناقب ابن شہر آشوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب شہربانو واقعہ کربلا میں غرق فرات ہو گئیں، اور ان دونوں روایتوں میں کلام بحیثیت تحقیق بسط وتفصیل کا مقتضی اور وہ یہاں مناسب نہیں ہے واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۱۲:۔ جناب رسول خدا ﷺ یا جناب امیر المومنین علیہ السلام یا جناب امام حسین علیہ السلام کے لشکر میں کسی قسم کے باجہ کا ہونا ثابت ہے یا نہیں، مشرکین وکفار ومنافقین کے لشکروں میں تو باجہ ضرور ہوتا تھا؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق؛ ان حضرات کے لشکر میں کسی باجہ کا ہونا ثابت نہیں واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۱۳:۔ روز عاشورہ کیا دن تھا۔ معصوم کی روایت سے جو ثابت ہوا ہو وہ ارشاد ہو؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق: فعلا میری نظر میں کوئی روایت ایسی جو منتہی معصوم کی طرف ہو تعین روز عاشورا میں نہیں ہے، لیکن دیگر روایات سے جو منتہی غیر معصوم کی طرف ہوتی ہیں یہ ثابت ہوتا ہے، کہ روز

عاشوراروز جمعہ تھا،اور یہ امر موافق استخراج حسابی کے بھی ہے،اور اس باب میں جو اختلاف ہے اس کی تحقیق و تنقیح کے لئے بسط مقال چاہئے واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۱۴:۔ خدا اور سول وآئمہ ہدیٰ وعلماء دین پر افتراء کرنا کیا حکم رکھتا ہے۔ بینوا وتوجروا۔ رحمکم اللہ المشفقیٰ بندہ میر اکبر علی خلف میر احمد علی صاحب العرف بہ میر چھوٹم صاحب مرحوم دہلوی محررہ ۷،اصفر المظفر ۱۳۲۲ھ۔

جواب:۔ یہ امر عظیم گناہان کبیرہ سے ہے اور نہایت موجب وزر وو بال ہے،اور اس کے متعلق جو افادات جناب ثقۃ الاسلام آیت اللہ فی الانام جناب میرزا حسین النوری الطبرسی (رح) نے رسالہ لولو والمرجان میں مرقوم فرمائی ہیں وہ قابل مراجعت و عمل ہیں،وفق اللہ قاطبۃ المؤمنین لذلک وھو الموفق۔

ناصر حسین الموسوی غفر اللہ لہ واصلح اعملہ۔

۔مہر شریف۔

«لااله الاالملك بالحق المبين ،عبده ناصر حسين بن علامه حامد حسين الموسوى النيشا پورى»

میراث برصغیر
(شش ماہی)

کتاب ہدایات ناصریہ
پر ایک تحقیقی نظر

تحقیق : طاہر عباس اعوان بن غلام عباس اعوان

سوال نمبر ۴:۔ عقد حضرت قاسم ابن الحسن علیہما السلام کا میدان کربلا میں ہونا صحیح ہے یا ضعیف ہے یا افترائے محض ہے؟

جواب:۔ وباللہ التوفیق۔ قصہ عقد حضرت قاسم ابن الحسن علیہما السلام بے اصل محض ہے۔ واللہ اعلم۔

سوال چہارم کے بارے میں علماء اعلام کے تائیدی بیانات

مسئلہ عقد شہزادہ قاسم بن امام حسن علیہما السلام مدت مدید سے معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے، اس کے اثبات اور نفی پر متعدد کتب ورسائل طرفین کی طرف سے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن اکثر علماء نے اس کے عدم اثبات پر تصریحات فرمائی ہیں، لہذا یہاں اجمالی طور پر جناب آیت اللہ ناصر حسین ناصر الملت کے قول کی تائید میں بعض اعلام کی تصریحات پیش کی جاتی ہیں، تاکہ متلاشیان حق وحقیقت پر بات روشن ہو جائے۔

تین بنیادی مباحث

اس مسئلہ پر کی جانے والی بحث کو ہم تین بنیادی ابحاث میں تقسیم کرتے ہیں:

پہلی بحث؛ شادی حضرت قاسم بن امام حسن علیہما السلام کو قبول نہ کرنے کی وجوہ کیا ہیں؟

دوسری بحث؛ وہ علماء اعلام و مجتہدین کون ہیں اور انکی کتب کے اسماء کیا ہیں کہ جنہوں نے نفی عقد قاسم بن امام حسن مجتبی علیہما السلام پر قلم اٹھایا ہے؟

تیسری بحث؛ اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوے، اس موضوع پر لکھی جانے والی بعض مستقل کتابوں کے نام اور اس حوالہ سے بعض علماء اعلام کی اصل عبارات کو ذکر کیا ہیں۔

پہلی بحث: انکار کی وجوہات

شہزادہ قاسم بن امام حسن علیہما السلام کی شادی کو قبول نہ کرنے کی علماء نے درجہ ذیل وجوہات ذکر کی ہیں:

پہلی وجہ:

ملا حسین کاشفی صاحب "روضۃ الشہداء" کہ جو دسویں صدی ہجری قمری کے مشکوک المذہب عالم ہیں، کیونکہ ان کے حالات زندگی میں یہ بات تحریر ہوئی ہے کہ جب ہراۃ جاتے ت واپنے آپ کو سنی ظاہر کرتے اور جب ایران کے شہر سبزوار آتے تو اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتے۔ محدث نوری نے "لولوو المرجان" میں، شہید مرتضی مطہری نے "حماسہ حسینی" میں، آیت اللہ ظہور الحسن نے "تقریر حاسم" میں و دیگر اعلام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ کاشفی سے پہلے اس روایت کو کسی نے بھی ذکر نہیں کیا اور اس نے بھی اس روایت کی نہ کوئی سند پیش کی اور نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا۔ لہذا ایک ہزار سال تک اس روایت کو کسی محقق مؤرخ کا نقل نہ کرنا اس کے عدم ثبوت پر دال ہے۔

دوسری وجہ:

امام حسین علیہ السلام کی دو بیٹیاں تھیں اس سے زیادہ کوئی معتبر قول موجود نہیں ہے۔ جناب سکینہ علیہا السلام اور جناب فاطمہ علیہا السلام۔ امام حسین علیہ السلام کی دوسری بیٹی جناب فاطمہ علیہا السلام اپنے شوہر امام حسن علیہ السلام کے بیٹے حسن مثنیٰؑ کے ساتھ کربلاء میں موجود تھیں اور ان کی اولاد بھی ہوئی جس سے آج تک طباطبائی سادات کا سلسلہ نسب چل رہا ہے۔

جن میں آیت اللہ العظمی سید مہدی بحر العلوم طباطبائی (متوفی ۱۲۱۶ھ۔ق) آیت اللہ العظمی سید حسین بروجردی طباطبائی، آیت اللہ العظمی سید محسن الحکیم طباطبائی، آیت اللہ العظمی سید محمد حسین طباطبائی صاحب "تفسیر المیزان" اور اسی طرح دیگر سادات طباطبائی امام حسین علیہ السلام کی اسی دختر نیک اختر جناب فاطمہ کبریٰ سلام اللہ علیہا کی اولاد میں سے ہیں اور کراچی میں مدفون "حضرت عبد اللہ شاہ غازیؒ" کہ جن کا مزار معروف ہے اور مرجع خلائق ہیں اور صبح شام کراچی میں ساحل سمندر پر سنی شیعہ ان کی زیارت کر رہے ہیں۔ یہ سید بزرگوار بھی دو عدد واسطوں کے ساتھ اسی فاطمہ کبری علیہا السلام اور ان کے شوہر حسن مثنیٰ علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا شجرہ نسب اس طرح ہے۔ سید عبد اللہ شاہ غازی بن سید محمد نفس زکیہ بن سید عبد محض بن حسن مثنیٰ بن امام حسن مجتبیٰ بن امام علی ابن ابی طالب علیہم السلام۔

تیسری وجہ:

اگر ضعیف قول کی بنا پر امام کی تیسری دختر فاطمہ صغریٰ ماں بھی لی جاے تو وہ مدینہ میں تھیں ،لہذا ان سے عقد ہونا ممکن نہیں ہے اور اس طرح اگر امام کی چوتھی دختر بنام زینب ،مان لی جائے تو جنہوں نے بھی امام علیہ السلام کی اس بچی کا ذکر کیا ہے ،وہ اس بات کی تصریح کرتے ہیں ، کہ یہ بچی بچپن میں وفات پا چکی تھیں ،لہذ امام علیہ السلام کی ایسی کوئی دختر موجود نہیں ہے ، کہ جو کربلاء میں شادی کے قابل ہو۔لہذا اب عقد شہزادہ قاسم علیہ السلام کے قائلین کی ذمہ داری ہے کہ وہ امام کی کسی ایسی بچی کا ثبوت پیش کریں جو کربلا میں بھی موجود ہو اور شادی کے بھی قابل ہو معتبر حوالہ جات کے ساتھ۔

چوتھی وجہ:

علماء اعلام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ کسی قسم کا کوئی مادی و معنوی فائدہ اس عقد سے حاصل نہیں ہوا اور ایسا بے فائدہ کام امام کی شان کے خلاف ہے۔ کیونکہ اوامر شریعت اور عقلاء کے نزدیک ثمرات مادی و معنوی عقد یہ ہیں:

۱) دفع شہوت ہو؛ ۲) تکثیر نسل؛ ۳) محض محرمیت: بخاطر فواید اخروی یا دنیوی۔

اس حوالہ سے آیت اللہ سید ظہور الحسن لکھنوی صاحب ''تقریر حاسم'' فرماتے ہیں:

باید دانست که غرض عقلا در مسئله مزاوجت چیست،آنچه به حکم عقل و شرع معلوم می‌شود چند سبب دارد،یکی دفع شهوت که حال اغلب عوام است،یا تکثیر نسل است که بنائی خواص است،یا آنکه محض محرمیّت است،در این مطلب یا اغراض دنیوی ملحوظ است یا اغراض اخروی، پس قدری بسط داده شده تا اینجا و غرض اخروی مثلا آنکه عامی علویه را به عقد خود در می‌آورد و صرف نظر از اغراض مذکوره بلکه صرف نسبت به حضرت ختمی مآب ﷺ یا غیر علویه نکاح نکاح علوی در می‌آید محض انساب به حضرت صدیقه یا آنکه غرض از مزاوجت صرف دنیا است... الخ[1]

---

[1] ۔ تقریر حاسم ص ۱۷ بحوالہ عبائر الانوار ص ۵۶، اجوبہ المسائل الدینیہ شمارہ ۷ دورہ ۵ ص ۱۱۵۔

عاشورہ کے دن اس عقد کا وقوع میں آنا عقل کے خلاف ہے ایسی تزویج جسکا کوئی ثمرہ دینی و دنیاوی مادی و معنوی مترتب نہ ہو عقلاء کے نزدیک فعل عبث ہے چہ جائیکہ معاذاللہ امام علیہ السلام ایسا فرمائیں۔

اور یہی بات دیگر اعلام نے بھی تحریر کی ہے۔

پانچویں وجہ:

اکثر علماء فریقین کے اقوال سے شہزادہ قاسم علیہ السلام کے قصّہ عقد کا بے بنیاد ہونا ثابت ہوتا ہے اور بہت سے موثق مورخین نے اس کے بطلان اور واقعیت سے دور ہونے کی تصریحات کے علاوہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تحریر فرمائی ہیں۔

چھٹی وجہ:

جیسا کہ تحریر کیا جاچکا ہے کہ فاطمہ کبریٰ سلام اللہ علیہا کا عقد تو حسن مثنیٰ علیہ السلام سے ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اگر امام علیہ السلام کی کوئی بیٹی شادی کے قابل کربلا میں موجود تھی اور امام علیہ السلام نے یہ شادی کرنی ہی تھی تو عاشورہ سے قبل اور حضرت قاسم کے دیگر برادران سے کیوں نہ کی کہ جو شادی کے قابل تھے اور جناب قاسم سے عمر میں بڑے تھے؟ شادی کے قابل بچی کا عقد نکاح ۱۲ یا ۱۳ سالہ نابالغ بچے سے کیا معنی رکھتا ہے؟ لہٰذا ہم اس بات کے قائل ہیں کہ یہ واقعہ حقیقت سے دور ہے۔

ساتویں وجہ:

بعض قائلین عقد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس شادی کے متعلق امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی۔ اس حوالہ سے عرض یہ ہے کہ امام حسن مجتبی علیہ السلام کی اس شادی کے متعلق اولاً تو ایسی کوئی وصیت معتبر اسناد سے ثابت نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ۱۵ بیٹے ہیں اور شہزادہ قاسم علیہ السلام تقریباً جناب عبید اللہ علیہ السلام کے علاوہ سب سے چھوٹے ہیں اور امام حسن علیہ السلام کی شہادت (یعنی ۵۰ھ۔ق) کے وقت شہزادے کی عمر ۲ یا ۳ بنتی ہے اور اکثر قائلین

شادی امام حسین علیہ الاسلام کی چار بیٹیوں کے معتقد ہیں، یہ وصیت باقی فرزندان کے لیے کیوں نہیں کی گی؟ آیاامام معصوم سے اپنے فرزندوں میں یہ تفریق ممکن ہے؟اگر جواب مثبت ہے تواس تفریق کی فقط حضرت قاسم علیہ السلام کے ساتھ عقد کرنے کی معقول وجہ کیاہے،جو دوسرے فرزندان امام حسن علیہ السلام میں نہیں پائی جاتی تھی۔

آٹھویں وجہ:

امام کی سب سے بڑی بیٹی فاطمہ ہے،انکی والدہ کے بارے میں دو قول ہیں،ایک قول غیر معروف بلکہ تحقیق کی کسوٹی پر بالکل مسند اور بغیر مدرک کے یہ ہے کہ آپکی والدہ جناب شہربانو والدہ امام زین العابدین علیہ السلام تھیں،"عیون اخبار الرضاعلیہ السلام کی روایت کے مطابق امام رضاعلیہ السلام نے فرمایا کہ امام چھارم کی ولادت کے بعد بی بی شہربانو سلام اللہ علیہانے مزید دس روز قید حیات رہیں،اس اعتبار سے بی بی فاطمہ امام چھارم کی ابوینی ہمشیرہ ہیں،لہذا اگر یہ قول درست مان لیا جائے کہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی والدہ جناب شہربانو سلام اللہ علیہاہے توعقلا ونقلا آپ امام سے بڑی ہیں،امام کی عمر کربلاء میں کم از کم ۲۳ سال کی تھی،لہذابی بی کی عمر کربلاء میں کم از کم ۲۴ سال ہونی چاہے،معصومین کے گھرانیں میں اس عمر تک بلاوجہ لڑکیوں کا مجردی کی زندگی بسر کرنا،انکی سیرت وتعلیمات کے خلاف ہے۔

دوسری روایت کے مطابق جسے تمام ارباب سیر وانساب نے تحریر کیاہے کہ بی بی کی والدہ ام اسحاق ہیں اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت شدہ ہے کہ ام اسحاق سلام اللہ علیہاپہلے امام حسن مجتبی علیہ السلام کے حرم میں تھیں،امام حسن علیہ السلام کی شہادت ۵۰ ہجری میں ہوئی۔امام حسین علیہ السلام نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد بی بی ام اسحاق علیہاالسلام سے عقد کیا تھا۔

لہذااس قول کے مطابق امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے وقت امام حسین علیہ السلام کی کوئی بیٹی تھی ہی نہیں،لہذاجن صاحبان نے تعین کر کے امامؑ کی وصیت میں "فاطمہ"کانام لکھاہے،یہ تمام روایات مقطوع الکذب ہیں۔

یہ وہ وجوہات تھیں جنہیں علماء اعلام نے اپنی اپنی کتب میں تحریر کیا اور ہم نے اپنے الفاظ ان کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے مذکورہ وجوہات اور اس طرح کی دوسری بہت سی وجوہات کی بنا پر اکثر علماء اعلام اور مجتہدین کرام اس عقد کو قبول نہیں کرتے بلکہ بعض اس کا پڑھنا حرام سمجھتے ہیں۔

دوسری بحث: انکار کرنے والے علماء اور ان کی کتب

وہ علماء کرام جنہوں نے حضرت قاسم بن امام حسن علیہما السلام کی کربلاء میں شادی کا انکار کیا ہے:

۱) علاّمہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی ۱۱۱۰ھ) کتاب: "جلاء العیون۔"

۲) آیت اللہ العظمیٰ علاّمہ عبد اللہ مامقانیؒ کتاب: "تنقیح المقال، ج ۲۔"

۳) خاتم المحدثین شیخ عباس قمیؒ، کتاب: "منتہی الامال ج ۱، ص ۷۰۰۔"

۴) آیت اللہ العظمیٰ شیخ محمد تقی تستریؒ کتاب: "قاموس الرجال، ج ۷، ص ۳۵۷ اور ج ۸، ص ۶۴۴۔"

۵) آیت اللہ العظمیٰ سید کاظم طباطبائیؒ صاحب عروۃ الوثقیٰ، "نزھۃ المشتاق فی فتاوی علماء عراق، ص ۵"

۶) آیت اللہ العظمیٰ آقای اخوند کاظم خراسانیؒ صاحب کفایۃ الاصول، ایضاً ص ۶۔

۷) آیت اللہ العظمیٰ عبد اللہ مازندرانیؒ، ایضاً ص ۷

۸) آیت اللہ العظمیٰ آقای حسین مازندرانی: ایضاً

۹) آیت اللہ العظمیٰ غلام حسین حائری اصفہانی: ایضاً

۱۰) آیت اللہ العظمیٰ آقای اسماعیل صدر: ایضاً و مجاہد اعظم، ص ۳۶۱۔

۱۱) استاد المحدثین حسین نوری طبرسیؒ (متوفی ۱۳۲۰ھ) کتاب: "لولو والمرجان، ص ۱۴۵۔"

۱۲) آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئیؒ اپنے فتاوی کی کتاب: "صراط النجاۃ، ج ۲، ص ۴۴۱۔"

۱۴) آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ مرزا جواد تبریزی "صراط النجاۃ، مسئلہ: ۱۳۹۰۔"

۱۵) آیت اللہ العظمیٰ سید ابو تراب موسوی نجفی "بحوالہ مجاہد اعظم، ص ۳۱۶۔"

۱۶) آیت اللہ العظمیٰ سید علی حائری لاہوری (متوفی ۱۳۶۰ھ) "بحوالہ سعادۃ الدارین، ص ۳۹۲۔"

۱۷) آیۃ اللہ العظمیٰ محمد فاضل لنکرانی کتاب: "جامع المسائل، ص ۶۲۵۔"

۱۸)رہبر معظم آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای دامت برکاتہ "مصائب امام حسینؑ،ص۱۵،غلام علی رجائی بحوالہ حضرت قاسم بن حسن علیہاالسلام۔"

۱۹) آیت اللہ العظمی سید ریحان اللہ موسوی الطہرانی "بحوالہ مجاہد اعظم،ص۳۱۶۔"

۲۰) آیت اللہ سدابوالحسن عرف ابوصاب لکھنوی "بحوالہ مجاہد اعظم،ص۳۱۷۔"

۲۱)علامہ سید عبد المجید حسینی شیرازی "ذخیرۃ الدارین،ص۱۵۴۔"

۲۲)علامہ ربانی گلپایگانی "منہاج الدموع ص۳۲۱۔"

۲۳)علامہ سید عبدالرزاق مقرم نجفی،"مقتل حسینؑ ص۲۶۴ وسکینہ بنت الحسینؑ ص۱۱۴۔"

۲۴)علامہ ذبیح اللہ محلاتی،"فرسان الہیجاء ج۲ ص۳۱۔"

۲۵) آقای خسرو تقدسی نیا،"۲۷پرش ص۱۴۶"

۲۶) آیت اللہ علامہ سید ظہورالحسن، کتاب:"التقریر الجاسم لقصۃ عقد القاسم۔"

۲۵) آیت اللہ سید قاضی طباطبائی،"تحقیق اربعین"

۲۶) محقق محمد حسن خان،"خیرات حسان،ج۳،ص۷۔"

۲۷) شیخ محمد حسن ابن عبداللہ ہشترودیؒ،"محن الابرار ترجمہ بحار الانوار،ج۲،ص۲۰۵۔"

۲۸)حجۃ الاسلام آقای محمد جواد نجفی،"ستارگان درخشان،ج۵،ص۱۶۶۔"

۲۹) آیت اللہ علامہ شہید مرتضی مطہریؒ"حماسہ حسینی،ج۱،ص۲۸"

۳۰)علامہ قزوینی،"تظلم الزہراء،ص۲۳۸۔"

۳۱)مؤرخ شہیر تقی سپہر،"ناسخ التواریخ،ص۲۷۱۔"

۳۲)مؤرخ و محقق فرھاد مرزا،"قمقام ذخار"

۳۹)علامہ عماد زادہ،"زندگانی امام حسینؑ ص۴۸۸۔"

۴۰) آیت اللہ شیخ محمد حسین نجفی،"سعادۃ الدارین،ص۳۹۵۔"

۴۱)علامہ سلیمان تنکابانی،"اکلیل المصائب،ص۱۰۵۔"

۴۲)علامہ محمد باقر مدرس، "شہر حسینؑ"
۴۳)حجۃ الاسلام محمد مہدی فقیہ گیلانی، "الرحم الطیب یا تذکرہ بی بی شہر بانو سلام اللہ علیہا"
۴۴)......:۱۴۷ شہداء کربلاء
۴۵)حجۃ الاسلام سید علی بن الحسینؑ الہاشمی النجفی، "ثمرات الاعواد، ج۱، ص۱۸۵۔"
۴۶) آیت اللہ سید محمد علی شہرستانی مرعشی، "سوال جواب"
۴۷)جواد محدثی، "فرہنگ عاشوراء، ص۱۰۰۔"
۴۸)حسن جلالی عزیزیان، "عاشق ترین پروانہ قاسم بن امام حسنؑ، ص۵۔"
۴۹)گلی زادہ، " حضرت قاسم بن حسن امام حسن بن حسنؑ"
۵۰)حجۃ الاسلام عقیقی بخشاشی، "روضۃ الشھداء مقدمہ"
۵۱)علامہ سید احمد الفالی مرحوم، "اجوبۃ المسائل الدینیہ، ص۱۱۳ تا ۱۲۰۔"
۵۲)مؤرخ و محقق سید شاکر حسین امروہوی، "مجاہد اعظم، ص۲۶۴ تا ۳۱۸۔"
۵۳المرجعیۃ الدینیہ۔
۵۴)علامہ سید جعفر مرتضی عاملی، "کربلاء فوق الشبہات ص۵۴، ۵۰"
۵۵)علامہ جناب سید محمد جواد ہندی، "بحوالہ مجاہد اعظم، ص۳۱۶۔"

تیسری بحث: نفی عقد شہزادہ قاسم علیہ السلام میں لکھی جانے والی مستقل کتابیں اور بعض علماء کی تصریحات:

الف)وہ کتب جو مستقل نفی عروسی حضرت قاسم بن امام حسنؑ پر لکھی گئیں:
۱۔نزھة المشتاق فی فتاوی علماء عراق: مؤلف حکیم میرزا محمد صادق۔
۲۔الاجوبہ السدیدہ عن الاسئلۃ الجدیدہ:مؤلف حکیم میرزا محمد صادق، تاریخ تالیف ۱۳۲۶ھ۔ق
اس کتاب میں رد عروسی حضرت قاسمؑ کے حوالے سے مندرجہ ذیل مجتہدین کے فتوے ذکر کئے گئے ہیں:

۱) آیت اللہ میرزا محمد حسین نجفی مرحوم؛
۲) آیت اللہ سید کاظم طباطبائی صاحب عروۃ الوثقی؛
۳) آیت اللہ آقای اخوند کاظم خراسانی صاحب "کفایۃ الاصول"؛
۴) آیت اللہ سید اسماعیل صدر۔

ابتدا: بسملہ وخطبہ امابعد پس ارباب ایمان وایقان پر مخفی ومحتجب نہ رہے کہ جب مسئلہ عروسی قاسم سلام اللہ علیہ کے مطلق رسالہ نزھۃ المشتاق تحریر کیا اور بہت سے مقامات سے رسوم غیر مشروعہ جو اس قصے کی بنا پر رائج تھے اٹھا دے گئے۔[1]

"الذریعة فی تصانیف الشیعه" میں غالباً اسی کتاب کا نام یہ لکھا ہے:

الفتاوى الجديدة في المسئلة السديدة،او فتاوى علماء هوتكذيب لقصة عرس القاسم.[2]

ہاں! اگر آقای بزرگ تہرانیؒ کی پیش کردہ یہ کوئی اور کتاب ہے تو عدم دسترسی کی وجہ سے مؤلف کا نام معلوم نہیں ہے۔

۳۔ دوغازہ شاهد در نفی عروسی حضرت قاسم بن امام حسنؑ: مؤلف حاجی سید آل محمد، یہ پورا رسالہ ہم نے اسی مجلہ میراث برصغیر شمارہ ۳ میں درج کیا ہے، ان کی دوسری کتاب اسی موضوع پر یہ ہے۔

۴۔ بیان حاسم در نفی عروسی حضرت قاسم بن امام حسنؑ: مولف حاجی سید آل محمد۔[3]

---

[1] ۔ برصغیر کے امامیہ مصنفین ج۲ ص ۲۶۵۔
[2] ۔ الذریعہ ج۱۶ ص ۱۰۱۔
[3] ۔ مطلع الانوار ص ۱۴۱ تذکرہ علماء امروہہ ص ۳۴۔

۵۔ التقرير الحاسم لقصة عقد القاسم علیہ السلام: مؤلف آیت اللہ علامہ سید ظہور الحسن[1]

۶۔البیان المبرھن: مولف سید محمد علی شہرستانی مرعشی (متوفی ۱۳۴۴ھ ق) آقای سید احمد الفالی مرحوم نے اس کتاب سے نقل کرتے ہوے لکھا ہے کہ یہ کتاب ہند سے پوچھے جانے والے سوال کے جواب میں لکھی گئی ہے:

ولایخفي ان المرحوم العلامه السيد محمد علي الشهر الستاني وسئل هذا السؤال بعينه من شيعة الهند فاتي في برسالة مستقله في الجواب.

اس حوالہ سے آقای احمد الفالی نے آقای شہرستانی کا موقف ان الفاظ میں تحریر فرما:

آقای شہرستانی نے شدت کے ساتھ عقد حضرت قاسم علیہ السلام والے قضیہ کو رد کیا ہے۔

اور کتاب "منتخب طریح" کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ مؤلف نے اس کتاب کو جوانی میں لکھا تھا اور پھر جب اس کے خرافات پر مطلع ہوا تو کتاب کو کالعدم قرار دے دیا یہ ہے نص عبارت:

وقال العلاّمه المرحوم السيد محمد علي شهر الستاني في رسالته التي كتبها في جواب عن هذه المسئله،وقد نقل بعض الأعلام عن الشيخ الطريح انه قد صنف منتخبه في أول شبابه ثم لما أكمل وراى اشماله على الخرافات غسله واخبر النّاس بذالك...[2]

یعنی علامہ مرحوم سید محمد علی شہرستانی نے اسی مسئلہ کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

---

[1] ۔یہ ۱۵۰ صفحہ کی کتاب ہے بہت جلد انشاء اللہ مرکز احیاء آثار برصغیر اسے مشتاق ہاتھوں تک پہنچائے گا،فانتظر و فاني معكم من المنتظرين

[2] ۔ اجوبہ المسائل الدینیہ شمارہ ۵ دورہ ۷ ص ۱۱۷ ص ۱۱۹۔

بعض اعلام نے شیخ طریحی نے نقل کیا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے ابتداء جوانی میں تحریر فرمائی تھی۔ لیکن جب علم کی بلندیوں تک پہنچے تو دیکھا کہ اس کتاب میں تو خرافات موجود ہیں۔ اس لیے اسے پانی سے دھو دیا اور لوگوں کو اس بارے میں اطلاع دے دی کہ اب اس کتاب کے مندرجات کو میری طرف نسبت نہ دی جائے۔

اسی قسم کی بات قم کے عظیم محقق تاریخ جناب حجۃ الاسلام آقا شیخ یوسف غروی مدظلہ العالی نے آقای طریحی کے نجف میں رہنے والے بعض نوادگان سے نقل کی ہے، البتہ حقیر کے سامنے اسکے ناقل برادر بزرگوار جناب حجۃ الاسلام والمسلمین محمد طاہر عباس آف لاہور ہیں۔

۷۔سفک المهج لضعاف الحجج فی نفی عقد قاسم: سید حسین علی جونپوری[1]

۸۔دفع المغالطه فی مسائلة عروسی حضرت قاسم بن امام حسن علیہ السلام: حکیم محمد کاظم لکھنوی اردو۔[2]

ب) نفی عروسی حضرت قاسم بن امام حسن علیہما السلام کی کربلاء پر علماء اعلام کی تصریحات

۱۔علامہ محمد باقر مجلسیؒ، صاحب کتاب بحار الانوار (۱۰۳۷۔۱۱۱۰ھ ق):

قصه دامادی او درکتب معتبره بنظرفقیرنرسیده است.[3]

۲۔علاّمہ سید عبد المجید بن محمد رضا حسینی شیرازی صاحب ذخیرۃ الدارین (متوفی ۱۳۴۵ھ۔ق) شہزادہ قاسمؑ کی شہادت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

---

[1] ۔الذریعہ ج۱۲ص۱۹۱۔

[2] ۔الذریعہ ج۸ص۲۳۱۔

[3] ۔جلاء العیون ص۳۰۲۔

اقول: وانه نقل في الكتب المعتبرة مبارزة القاسم يوم الّطف كما ذكرنا آنفا تفصيله من طريق المخالف والموالف ولم يذكر في تلك الكتب تزويجه في وقعة الّطف،إلاّ في المنتخب فانه ذكر قصة تزويجه نقلاً عن الغير فقال: ان هذه القضية لم نظفربها في الكتب المعتبرة والروايات المعتمدة،فكانه لم يعتمد علي ذلك النقل ونحن ايضاً قد تصفحنا بمقدار وسعنا،عن ما نقل ولم نجد فيه مايعتمد عليه من الآثار المثبته لتلك القضية وذلك الفاضل ايضاً لم ينسبه إلي احد بل نسبه الي قيل ولايثبت به شئ انتهي[1]

۳۔علاّمہ الشیخ عبداللہ مامقانیؒ صاحب تنقیح المقال(۱۲۹۰۔۱۳۵۱ھ ۱۸۷۳۔۱۹۳۳م) فرماتے ہیں:

صرح جمع من اهل السيربانه كان صغير لم يبلغ الحلم،واما ما ارسله في المنتخب من ارسال قصة تزويجه فلم اقف ولا سائر اهل التتبع علي ذالك في شئ من كتب السير والمقاتل المعتبرة[2]

۴۔آقای علی ربانی گلپایگانی فرماتے ہیں:

ابداً از اخبار وتاريخ بدست نمی‌آيد كه در كربلا برای حضرت قاسم دامادی واقع شده باشد. پس اين شهرت عروسی قاسم در كربلا و انتساب دادن حجره‌ای را در خيمه‌ای كربلا به جحله قاسم بدون اصل و خارج از تحقيق است.[3]

۵۔عبد صالح حاج شیخ عباس قمیؒ صاحب "مفاتیح الجنان"(۱۲۹۴۔۱۳۵۹ھ۔ق) نفی عروسی حضرت قاسم علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں:

---

[1]۔ذخیرۃ الدارین فیما یتعلق بمصائب الحسینؑ واصحابہ طبع قم ص۲۸۸ وطبع نجف ص۱۵۴۔

[2]۔تنقیح المقال ج۲ ترجمہ حضرت قاسم بن امام حسن شمارہ۹۵۵۹،مطبع مرتضویہ فی النجف ۱۳۵۰ھ۔

[3]۔منہاج الدموع ص۳۲۱۔

مخفی نماند که قصه دامادی جناب قاسم علیه السلام در کربلاء و تزویج او فاطمه بنت الحسین علیه السلام را صحت ندارد،چه آنکه در کتب معتبره بنظر نرسیده،وبعلاوه آنکه حضرت امام حسین علیه السلام را دو دختر بوده[۱]

۶۔ مؤرخ و محقق علامہ عبد الرزاق مقرم صاحب ''مقتل حسین'' فرماتے ہیں:

كل ما يذكر في عرس القاسم غير صحيح لعدم بلوغه سن الزواج ولم يرد به نص صحيح من المؤرّخين.[۲]

۷۔ جناب ذبیح اللہ محلاتی صاحب فرسان الہیجاء

عروسی حضرت قاسم بن امام حسن علیہ السلام ابدا اصل ندارد چندان که کتب معتبره و روایات معتمده را سیر کردیم اثر و اطلاعی از این عروسی قاسم بدست نیاوردیم و آنچه در السنة سند برای خود درست کردند که طریحی در منتخب گفته ایشان این مطلب را که از غیر نقل می‌کند می‌فرماید: «**ان هذه القضية لم نظفربها فی الكتب المعتبرة و الروايات المعتمدة**» و شک نیست که این عبارت به تمام صداقت دلالت دارد که خود طریحی هم اعتماد باین نقل ندارد و گفتن او بلفظ قیل واضح است که این مطلب در آثار مثبته و کتب معتبره وجود ندارد،و شکی نیست که فاطمه بنت الحسین زوجه حسن مثنی بود و شوهرش در کربلا حاضر بود چگونه ممکن است این نقل اصلی داشته باشد و امام حسین علیہ السلام در کربلا دختر دیگری نداشت که نام او فاطمه بوده باشد.[۳]

۱۔ منتہی الامال چاپ جدید جلد ۱ ص ۷۰۰۔
۲۔ مقتل حسین ص ۲۶۴۔
۳۔ فرسان الہیجاء محلاتی جلد ۲ ص ۳۱۔

۸۔ آیۃ اللہ شیخ محمد تقی تستری صاحب "قاموس الرجال" شہزادہ حضرت قاسم بن امام حسنؑ کا مقتل تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

وما اشتهر من تزوجه قصة وليس للحسينعليه السلام الا فاطمة واحدة وقد زوجها قبل من اخيه الحسن مثني.[۱]

۹۔ جناب خسرو تقدسی نیا، نے اپنی کتاب ۲۷ پرسش پیرامون حماسہ کربلا کے ص۱۳۶ تا ۱۴۸ پر میدان کربلا میں حضرت حضرت قاسم بن امام حسن بن امام حسن شادی کے نہ ہونے پر مفصل بحث کی ہے۔

۱۰۔ آیۃ اللہ علامہ شہید قاضی طباطبائیؒ:

لکھتے ہیں کہ جب میں اربعین کی تحقیق سے فارغ ہوا تو ایک فاضل آدمی نے درخواست کی کہ قصہ عروسی حضرت قاسم بن امام حسنؑ کے بارے میں کچھ تحریر فرمائیں تو میں نے اسکی درخواست قبول کی اور چند سطریں پیش کر رہا ہوں:

ترجمہ: پہلی بات یہ ہے کہ عروسی قاسمؑ کا موضوع منتخب کے علاوہ کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہے، اور صاحب منتخب نے بھی بالتصریح تحریر فرمایا ہے کہ اس نے بھی کسی معتبر کتاب میں نہیں دیکھا، لہذا انہوں نے بھی یہ فرماکے اسے اعتبار سے ساقط کر دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سید الشہداءؑ کی کوئی بیٹی ہی کربلا میں شادی کے قابل نہیں تھی۔[۲]

۱۱۔ محمد حسن خان اعتماد السلطنہ، صاحب خیرات حسان

۱۔ قاموس الرجال ج۷ ص۳۵۷ مطبع قم ۱۳۸۶ھ۔

۲۔ تحقیق اول اربعین، ص۶۸۳ (قارئین کرام یاد رہے کہ ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان کتاب بنام "تحقیق اول اربعین" فقط اس موضوع پر تحریر کی گئی ہے کہ کربلا کا لٹا ہوا قافلہ شام کی قید کے بعد پہلے چہلم کو کربلا واپس آیا ہے۔ لہذا تمام ان افراد کے قول کو رد کیا ہے کہ جو لکھتے ہیں کہ قافلہ کربلاء نہیں آیا یا دوسرے سال واپس آیا ہے۔ محققین اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ (فیہ شفاء للناس)

آنچه مابین عوام الناس اشتهار گرفته که حضرت فاطمه بنت الحسینؑ را در کربلا با حضرت قاسم بن حسنؑ عقد بستند هر کس منشاء این شهرت کاذبه را بخواهد بترجمه سکینه بنت الحسین از جلد ثانی خیرات حسان برد.[1]

فاضل معظم خیرات حسان میں حالات حضرت سکینہ بنت الحسین علیہا السلام پر بحث کرنے کے بعد آخر میں اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں:

نگارنده را هیچ شک نیست در اینکه داستان عروسی حضرت قاسم بن حسنؑ و فاطمه بنت الحسینؑ که از مشهورات بلا اصل است،و علامه مجلسیؒ با همه تتبع و احاطه تخریج و تصحیح آن نفرده و محققین از علماء متأخرین منع شدید از مذاکره آن می‌کند.[2]

۱۲۔ محن الابرار ترجمہ بحار الانوار، چاپ تہران رحلی،

مترجم می‌گوید: چون حکایت عروسی قاسم و رود زبان مرثیه خوان و عوام مردم ما است لذا اول تحقیق کلام در اینجا بشود،جناب امام حسنؑ را سیزده پسر داشت از جمله ایشان حسن بن حسنؑ بود.

اسکے بعد حسن مثنی کی شادی کا ذکر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

این روایت را مصنف در جلد اول این جلد عاشر بحار نقل کرده است،و از این روایت مشخص و معلوم گردید که جناب فاطمه دختر جناب امام حسینؑ زن حسن بن حسنؑ بود،مصنف در باب عدد اولاد جناب امام

---

[1] خیرات حسان ج۳ص۷۔

[2] ہمان؛ ج۲ص۷۶تا۸۵۔

حسین علیہ السلام دو تا دختری برای آنحضرت روایت کرده است،که نام یکی سکینه علیہا السلام و دیگری فاطمه علیہا السلام بود.

اور بنابر احتمال تیسری و چوتھی دختر کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

بنابراین روایات ظاهر همان فاطمه در کربلا حاضر بود زن حسن بن حسن است،و علاوه بر این مانند مصنف که در تتبع اخبار و در خبرداری از احادیث و آثار اهل بیت اخیار علیہم السلام جناب احمد مختار سر آمد علماء... ابرار و ممتاز همه اهل روزگار است،و استاد این فن و ماهر این علم است در کتاب جلاء العیون خود فرموده است که عروسی جناب قاسم درکتب معتبره بنظرحقیر نرسیده است.

اسکے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

باوجود این هیچ فائده در چنین تزویج بنظر نمی‌آید،و اتفاق افتادن زفاف از جناب در مانند چنین روز مصیبت و محنت از جمله مستبعدات عقلیه و نقلیه می‌باشد،و الله العالم بحقیق الامور...[1]

۱۳۔ رہبر معظم آیۃ اللہ السید علی الخامنہ ای مد ظلہ فرماتے ہیں:

نباید بوی ذلت و خاکساری نسبت به آئمه علیہم السلام و شجاعان کربلا در اشعار استشمام شود،بعضی از روضه‌های که خلاف است و مشکوک است،انسان باید حتی المقدور از خواندن آنها خود داری کند،برای مثال روضه حضرت قاسم علیہ السلام چیزی است که قطعا یا به احتمال زیاد رد آن ثابت شده است،دختر امام حسین علیہ السلام به نام فاطمه علیہا السلام مشخص است که چه کسی است،چند سال عمر

---

[1] محن الابرار ترجمہ مقتل بحار الانوار ج۲ ص۲۰۵ تا ۲۰۶۔

کرده،چند فرزند داشته،و پدرش هم مشخص بود،سادات ابن حسنؑ هم مشخص هستند،و چیز مبهمی در تاریخ وجود ندارد،بیاییم و پسر سیزده ۱۳ساله امام حسنؑ را در کربلا داماد کنیم،این چیزی است که غیر قابل قبول است.[1]

۱۴۔ آیۃ اللہ شیخ جعفر شوشتری صاحب خصائص حسینیہؒ:

یہ فقیہ بلند پایہ ومرد عظیم عزاداری میں ہونے والی بعض غلط رسومات کو دیکھ کر ناصر الدین شاہ قاجار بادشاہ ایران سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

موارد وهن و خرافی را از تعزیه‌ها حذف کنند،و این گونه صحنه‌ها را به نمائش نگذارند،اگر این کارها میسر نمی باشد،حد اقل دستور دهید تعزیه عروسی قاسم را که خیل مستهجن است از برنامه حذف کنند.[2]

۱۵۔ غلام رضا گلی زادہ مد ظلہ:

آقای گلی زادہ نے حضرت قاسم بن امام حسنؑ کے حالات زندگی پر مفصل کتاب تحریر فرمائی ہے، جس میں ص۹۷ تا ۱۰۱ تک عروسی حضرت قاسم بن امام حسنؑ کے ابطال پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، فرماتے ہیں:

در برخی منابع غیر مستند که متأسفانه عده‌ای بر آنها اعتماد کرده و پاره آن متون تاریخی و مقاتل کربلا راه یافته و مرثیه سرایان،و تعزیه نویسان،آنها را مأخذ و منبع خویش قرارداده‌اند.[3]

اور پھر اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے شادی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

---

[1]۔ مصائب امام حسینؑ ص۱۵ غلام علی رجائی بحوالہ حضرت قاسم بن امام حسنؑ، گلی زادہ۔

[2]۔ حضرت قاسم بن امام حسنؑ گلی زادہ ص۱۰۱،و مجموعہ مقالات دومین کنگرہ امام خمینیؒ،و فرہنگ عاشورہ جلد ۱ ص۳۷۷۔

[3]۔ ص۹۷۔

علماء شیعه و محققان تاریخ کربلاء رخداد این ماجرا – عروسی حضرت قاسم بن امام حسن– را مورد تاَمل دانسته و تعبیراتش را با وهن و خرافات توأم تلقی کرده‌اند.[1]

۱۶۔ حجۃ الاسلام والمسلمین پیشوائی مدظلہ:

آقای پیشوائی سے سوال ہوا کہ: آیا جریان عروسی حضرت قاسم درکربلا حقیقت دارد یاخیر؟

جواب: «حقیقت نداشته است،این از تحریف‌های آشکاری است،که در تاریخ عاشورا اضافه شده است،تا آنجا که بررسی هانشان می‌دهد،اولین کسی که این جریان را وارد تاریخ کرده،ملا حسین کاشفی بوده،که کتاب «روضة الشهداء»،را نوشته است،دقیقاً مشخص نیست که این شخص شیعه بوده یاسنی،بعضی‌ها می‌گویند: وقتی که هرات می‌رفته سنی می‌شده و وقتی به سمنان و دامغان می‌رسید،شیعه می‌شده است.»[2]

۱۷۔ حجۃ اللہ اسلام محمد جواد نجفی صاحب "ستارگان درخشان" تحریر فرماتے ہیں:

مؤرخین مینویسند امام حسینؑ فقط دو دختر داشته،یک سکینه و دیگری فاطمه که زوجه حسن مثنی بود،... پس اینکه می‌گویند امام حسین فاطمه دختر خود را به حضرت قاسمؑ داد اصلی ندارد، و چنانچه گفته شود: امام حسین یک دختر بنام فاطمه مدینه داشت و صحیح باشد باز هم ربطی به حضرت قاسم که در کربلا بود ندارد.[3]

---

[1]۔ حضرت قاسم بن حسن ص ۱۰۳

[2]۔ تحریف ھای عاشوراء (سلسلہ نشست ھای کانون گفتمان دینی شمارہ ۱۹ ص ۱۵ سال ۸۰ ش) گفتگو با حجت الاسلام والمسلمین پیشوائی۔

[3]۔ ستارگان درخشان جلد ۵ ص ۱۶۶۔

۱۸۔محمد سلیمان تنکابنی صاحب ''قصص العلماء''(متوفی ۱۳۰۲ھ ق)

«و اما این قول که فاطمه دختر امام حسین علیه السلام عروس قاسم بن حسن همراه او بود،و از قاسم حمل داشت،و پسری از او متولد شد،مسمی به قاسم ثانی که در جبال شمیران طهران مزار معروفی دارد،این نیز بسیار ضعیف است زیرا که:

اولاً؛ عروسی قاسم در روایات شیعه وارد نیست.

ثانیاً؛ قاسم یازده ساله بوده،و احتمال توالد و تولد در او ندارد.

ثالثا؛ گوینده این سخن مسموع القول و معتمد و محل اعتناء علماء اعلام نیست.

رابعاً؛ اینکه در روز عاشورا باز کیفیات مع هوده جای مواقعه و مباشرت قطعا نبوده.

خامساً؛ این قول اینکه با آنچه شیخ مفید رحمه الله که از اعیان علماء امامیه است در کتاب ارشاد ذکر کرده منافات دارد،و آن اینکه حسن بن حسن مجتبی معروف به حسن مثنی در نزد عمه خود حضرت سید الشهداء علیه السلام به خواستگاری فرستاد،آنجناب فرمود که من برای تو دختر خود فاطمه را اختیار کردم،که او را دوست دارم،و به اسم ما در من فاطمه نامیده‌ام،پس فاطمه را بعقد او در آورد و حضرت سید الشهداء علیه السلام دختر دیگر بنام فاطمه ندارد،چنانچه سابق در ضمن اولاد آنحضرت مذکور شد،و اینکه می‌گویند: فاطمه صغری در مدینه ماند،و بیمار بود اصلی ندارد.»[1]

---

[1] اکلیل المصائب فی مصائب الاطائب ص ۱۰۵ تصحیح و تحقیق دکتر محمد رضا افتخار زاده ناشر دفتر نشر معارف اسلامی قم۔

۱۹۔ آیۃ اللہ سید ظہور حسینؒ نے اس موضوع پر دو مستقل کتابیں تحریر فرمائی ہیں، بہترین اسلوب تحقیق کے ذریعہ اس قصہ کو رد کیا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب "تقریر الحاسم لقصہ عقد القاسم" ہے جسکا اقتباس ہم یہاں پر تحریر کر رہے ہیں:

بظاہر اس قصہ کی ابتدا روضۃ الشہداء سے معلوم ہوتی ہے... مگر اس روایت کا ،بطلان بھی خود صاحب روضۃ الشہداء کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے، اور جس سے دروغ گورا حافظہ نباشد کی پوری تصدیق ہوتی ہے، اس عبارت میں ملائے کاشفی نے حضرت قاسم کی دامادی کو بیان کیا ہے، مگر حضرت کی دختر کا نام معین نہیں کیا، لہٰذا اس تعین میں خود انہی کے کلام کی طرف رجوع کرنا چاہئے، چنانچہ انہوں نے حضرت سید الشہداء کی اولاد دختری میں، فقط فاطمہ اور سکینہ کو بیان کیا ہے، اور فاطمہ کے زوجہ حسن مثنیٰ ہونے کی تصریح کر دی ہے، جیسا کہ کتاب مذکور کے صفحہ ۴۳۰ ذکر اولاد حضرت سید الشہداءؑ میں لکھتے ہیں:

«او را چهار پسر و دو دختر بوده»

اور اسی صفحہ کی آخری سطر میں لکھتے ہیں:

«و چون فاطمه علیہا السلام خواهر زین العابدین علیہ السلام هم از شهر بانو بوده، و به حسن بن حسن داده‌اند پس اولاد حسن مثنی را پیغامبری و بادشاهی جمع باشد.»

ان عبارتوں پر نظر کرنے سے صاحب روضۃ الشہداء کے بیان کا متناقض اور قصہ مذکورہ کا موضوع و بے اصل ہونا کسی طرح پوشیدہ نہیں رہ سکتا، اسلئے کہ عبارت مذکورہ سے حضرت کی اولاد دختری کا فاطمہ و سکینہ میں انحصار اور فاطمہ کا زوجہ حسن مثنیٰ ہونا ثابت ہوتا ہے...

صاحب منتخب کا اس قصہ کو تحریر کرنا کئی وجوہ سے قابل استدلال نہیں:

۱۔ انہوں نے لفظ رُوی یا نُقل درج کیا ہے، جس سے ان کے نزدیک اس روایت کا ضعیف یا مشکوک الصحت ہونا ثابت ہے، اسلئے کہ لفظ رُوی، یا نقل، یا جائت الروایۃ، یا وُرِد کذا، وغیرہ کا استعمال خبر ضعیف یا مشکوک الصحۃ میں کیا جاتا ہے، اور یہ مسئلہ علمائے فریقین کا متفق علیہ ہے۔

۲۔ صاحب منتخب نے غالباً اس قصہ کو روضۃ الشہداء سے نقل کیا ہے، جیسا کہ سید العلماء نے مجالس مفجعہ میں فرمایا ہے کہ "فکن ذکرها فخرالدين في جامعه وكان ماخذه تاريخ الحسين الكاشفي" چونکہ بیان روضۃ الشہداء کی تردید کی جا چکی ہے، اس لئے جب اصل نامعتبر ہے، تو فرع کے نامعتبر ہونے میں کہاں تک رہا۔

۳۔ بالفرض یہ روایت منتخب میں روضۃ الشہداء سے ماخوذ نہ ہو، تب بھی کوئی عاقل اس کو صحیح نہیں مان سکتا، اس لئے کہ منتخب کی عبارت جو مجالس مفجعہ سے نقل کی گئی ہے ایسے اشعار پر مشتمل ہے جو حضرت قاسم کی جلالت قدر کے سراسر منافی ہیں، کیونکہ ان اشعار میں ایسے عاشقانہ مضامین مذکور ہیں، جن کو عاشق سرگشتھ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، خاص طور پر جناب سید الشہداء اور اہل بیت اطہار کے سامنے، ایسے اشعار کا زبان پر جاری کرنا نہایت بے شرمی بے باکی اور جسارت ہے، جس کے لوث و آلودگی سے حضرت قاسم کا دامن طہارت مبرا اور منزہ ہے۔

۴۔ ان اشعار میں ایسے عیوب اور نقائص موجود ہیں، جو کسی طرح اہل زبان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ اشعار کسی قاعدے سے بھی درست نہیں، اس مطلب کو وہ لوگ بہتر جان سکتے ہیں جو فن عروض میں فی الجملہ مہارت رکھتے ہیں، کاص

طور پر مصرع "یاطول حزنی وقلبی فیک افکار" کا مضحکہ شواکل ہونا محتاج بیان نہیں اس لئے کہ لفظ افکار جو کلمہ فارسی ہے کسی عرب اہل زبان کا کام نہیں۔

۵۔ اس داستان میں زوجہ قاسم کا تمام اہل بیت کے سامنے قاسم کے دامن کو پکڑلینا، جانب میدان جانے سے مانع ہونا، ان کے فراق میں جزع وفزع کرنا، یوم حشر کی معرفت کیلئے قاسم کا قطعہ آستین کو ان کے حوالہ کر دینا، اور اہل بیت کا اس فعل کے بعد بشدت گریہ وزاری کرنا، مذکور ہے، مگر ایسے افعال کا سب بزرگوں کے سامنے فاطمہ بنت الحسینؑ اور قاسم ابن الحسنؑ دونوں بزرگواروں کی جلالتِ قدر اور حیائے فطری کے بالکل منافی ہے۔[1]

آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں کہ صاحب "ریاض الشہادۃ" کی عبارت سے چند وجوہ استدلال درست نہیں ہے:

پہلی وجہ

صاحب ریاض نے قاسم کا عقد فاطمہ بنت الحسین کے ساتھ ہونا بیان کیا ہے، حالانکہ حضرت کی اولاد میں فاطمہ صرف ایک ہی تھیں، اور ان کا عقد قبل واقعہ کربلا مدنیہ منورہ میں حسن مثنیٰ کے ساتھ ہو چکا تھا، اسی طرح فاطمہ بنت الحسین اور حسن بن حسن کا کربلا میں بمعیت جناب سید الشہداء موجود ہونا، اور حسن بن حسن کا رہائی پاکر مدینہ کو مراجعت کرنا، علمائے فریقین کی تصریحات سے ثابت ہے، بلکہ خود صاحب ریاض الشہادۃ نے واقعہ کربلا کے بعد تا مدت دراز زندہ رہنا تحریر کیا ہے، چنانچہ ریاض الشہادۃ جلد دوم صفحہ ۲۷۱ میں مرقوم ہے:

حسن زخم بسیار در جهاد برداشت و بیهوش در معرکه افتاد تا آن که نزاع منقضی شد آن وقت او را اسیر نموده بردند و او ماند و عمری بسیار کرد اولاد بسیار از و بهم رسید.

---

[1] تقریر الحاسم لقصہ عقد القاسم ص۹ تا ۱۶۔

۲) صاحب ریاض الشہادۃ نے اس روایت کو روضہ الشہداء اور منتخب الطریحی سے نقل کیا ہے اور ان کی تردید کی جا چکی ہے۔

۳) ان کی عبارت منقولہ کے فقرے: «لذا به همین طریق که در آن دو کتب به نظر رسیده نقل می‌شود.» **میں قصہ مذکورہ کے روضۃ الشہدا اور منتخب سے بدون تصرف اور بے کم و کاست نقل کرنے کا اظہار کیا ہے، درحالیکہ ان کی عبارت میں کئی ایسے امور ہیں جو روضہ اور منتخب میں بالکل نہیں مثلاً وصیت امام حسن علیہ السلام میں بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کا بالتخصیص نامزد ھونا حالانکہ روضۃ الشہدا اور منتخب الطریحی میں کسی بیٹی کا نام نہیں خصوصاً روضۃ الشہداء میں وصیت مذکورہ کا دوسرے مقام پر بھی اجمالاً تذکرہ ہوا ہے مگر وہاں بھی دختر مشارالیہا کا کوئی نام نہیں بیان کیا گیا۔**

چنانچہ روضۃ الشہداء میں یہ عبارت درج ہے:

> و نقلی هست که ام کلثوم را گفت: ای خواهر نامدار من و یادگار ما در بزرگوار من فرزندم قاسم را حاضرگردان،ام کلثوم بفرمود تا قاسم را حاضر به آوردند،حسن او را در پر گرفت در روی بر روی وی نهاده بهائی هائی بگریست،بعد از آن دست قاسم بگرفت،و بدست حسین داد و گفت: ای برادر فلانه دختر ترا نامزد پسرخود قاسم کردم چون وقت آید بوئی سپاری.[1]

امام حسین کا قبل عقد خطبہ پڑھنا حالانکہ روضہ اور منتخب میں خطبہ پڑھنے کا قطعاً ذکر نہیں ہے، عقد مذکور کا مہر شہادت پر واقع ہونا درآنحالیکہ روضہ اور منتخب میں اس عجیب و غریب مطلب کا کہیں وجود نہیں، اس کے علاوہ اس مطلب کی لغویت صاف ظاہر ہے، کیونکہ شریعت مطہرہ میں مہر شہادت پر عقد درست نہیں، پھر اس کا حضرت کی طرف منسوب کرنا کس قدر بے ادبی اور جسارت ہے، مادر قاسم کا وقت

---

[1] روضۃ الشہداء، مطبوعہ بمبئی باب ششم فضائل حضرت امام حسن صفحہ ۲۳۲۔

عقد موجود نہ ہونا اور بعد وقوع اس پر اطلاع پانا حالانکہ روضہ اور منتخب میں مادر قاسم کا عند العقد موجود ہونا مذکور ہے، زنان حرم کا فاطمہ کو زینت کرنا اس کا بھی روضہ اور منتخب میں اصلاً تذکرہ نہیں ہے، اس مطلب کو بھی صاحب ریاض نے دوسرے مطالب کی طرح اپنی طرف سے مستزاد کیا ہے، بہر حال وجوہ مذکور پر نظر کرنے سے صاحب ریاض الشہادۃ کے کلام کا ساقط از اعتبار ہونا کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتا۔

اس کے علاوہ روضۃ الشہداء اور منتخب طریحی کی عبارتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ میں جناب امام حسن کا جناب سید الشہداء کی جن صاحبزادی کو حضرت سے نامزد کرنے کا ذکر ہوا ہے وہ صاحبزادی حضرت امام حسن کے زمانہ حیات میں موجود تھیں، چنانچہ روضۃ الشہداء کے باب ششم کی عبارت منقولہ کا فقرہ:

«ای برادر فلانہ دختر ترا نامزد پسرخود قاسم کردم چون وقت آید بوئی سپاری.»

اس مطلب پر بصراحت دلالت کرتا ہے، اور منتخب کی عبارت: «ومسك بيدابنة الّتي كانت مسماة للقاسم» سے بھی ان صاحبزادی کا حضرت امام حسن کی حیات میں موجود ہونا اور آنحضرت کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا مستفاد ہوتا ہے، حالانکہ خود صاحب روضۃ الشہداء کی عبارت سے جناب سید الشہداء کی اولاد میں کوئی صاحبزادی ایسی نہیں معلوم ہوتیں جو حضرت امام حسن کے عہد میں قاسم سے نامزد ہونے کی صلاحیت رکھتی ہوں، اس مطلب کی توضیح یہ ہے کہ صاحب روضہ نے اپنی کتاب کے خاتمہ میں جناب سید الشہداء کی اولادِ دختری کو صرف دو صاحبزادیوں میں منحصر کیا ہے جن سے فاطمہ اور سکینہ مراد ہیں ان دونوں صاحبزادیوں میں سے فاطمہ کا عقد حسن مثنیٰ کے ساتھ ہونا خود صاحب روضۃ الشہداء نے کئی مقام پر بیان کیا ہے اور سکینہ بنت الحسین کا عقد عبداللہ بن حسن کے ساتھ واقع ہونا آئندہ مذکور ہوگا، چونکہ حسن مثنیٰ اور عبداللہ دونوں کا معرکہ کربلا میں موجود ہونا مسلّم و محقق ہے لہٰذا فاطمہ یا سکینہ کا قاسم سے نامزد ہونا محض بے معنی ہے۔

فاطمہ بنت الحسین کا حضرت امام حسن کی حیات میں موجود نہ ہونا ثابت ہے، اس لئے کہ فاطمہ بنت الحسین کی مادر گرامی ام اسحٰق سے جنہیں حضرت امام حسن کی زوجیت کا شرف حاصل تھا اور حضرت امام حسینؑ نے بڑے بھائی کی شہادت کے بعد حسب وصیت عقد کر لیا تھا، اس حساب سے امام حسنؑ کی شہادت سے فاطمہ کی ولادت کا کم سے کم دس مہینہ دس روز یا تیرہ مہینہ دس روز بعد واقع ہونا ثابت ہوتا ہے جب یہ صورت ہے تو حضرت امام حسنؑ کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے، اور چونکہ سکینہ بنت الحسینؑ فاطمہ سے چھوٹی تھیں اس لئے امام حسنؑ کا ان کو نامزد قاسم کرنا بدرجہ اولیٰ معقول نہیں ہو سکتا، بہرحال ان دونوں صاحبزادیوں کا حضرت امام حسنؑ کی حیات میں حضرت قاسم بن امام حسن سے نامزد ہونا کسی طرح درست نہیں۔

صاحب روضۃ الشہداء نے کتاب مذکور کے باب اول میں حضرت کی ایک دختر ہفت سالہ کا بحالت بیماری مدینہ میں رہ جانا بھی نقل کیا ہے اور یوں تحریر فرماتے ہیں:

«در اخبار آمده که چون شهزاده حسین عليه السلام از مدینه بیرون آمده عزیمت کوفه نمود او را دختری بود هفت ساله و بجهت رنجوری که او را عارض شده بود نتوانست که با خود همراه برد، در خانهٔ ام المومنین ام سلمه عليها السلام بگذاشت.»[1]

اس کے بعد غراب کی حکایت غریبہ بیان کی ہے، بہرحال اگر روایت روضۃ الشہداء کے سقم و فساد سے قطع نظر کی جائے تب بھی اس دختر ہفت سالہ کو نامزد قاسم کرنا دو وجہ سے درست نہیں ہو سکتا۔ اول یہ کہ دختر مذکورہ کی ولادت تقریباً سنہ ۵۴ ہجری میں قرار پائی ہے، جس کی بنا پر ان کا سن واقعہ کربلا کے وقت ہفت سالہ قرار پا سکتا ہے حالانکہ حضرت امام حسنؑ نے سنہ ۵۰ ہجری میں رحلت فرمائی تھی، خود صاحب روضہ نے بھی حضرت کی شہادت سنہ ۵۰ ہجری میں واقع ہونا تحریر کیا ہے، چنانچہ کتاب مذکور کے خاتمہ مقصد اول میں مرقوم ہے:

---

[1] روضۃ الشہداء مطبوعہ بمبئی باب اول صفحہ ۲۲۔

وفاتش شب شنبه بست دهم صفر سن خمسین من الهجرت.[1]

اس حساب سے دختر مذکورہ کی ولادت کا زمانہ حضرت کی وفات کے زمانہ سے تقریباً چار سال بعد قرار پاتا ہے ،لہٰذا دختر مذکورہ کا امام حسنؑ کی حیات میں موجود ہونا اور حضرت کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا سراسر فاسد ٹھہرا۔

دوسرے یہ کہ صاحبزادی موصوفہ حسبِ تصریح صاحب روضۃ الشہداء مدینہ میں تھیں تو ان کا عقد کربلا میں روز عاشورا کیونکر صحیح ہو گا۔

ملائے کاشفی نے کنز الغرائب سے ایک اور دختر چہار سالہ کا جناب سید الشہداءؑ کی اولاد میں ہونا نقل کیا ہے، چنانچہ کتاب روضۃ الشہداء کے صفحہ ۴۱۲میں مرقوم ہے:

در کنز الغرائب آورده که یزید اهل بیتعليهم السلام را در درون کوشک خود جائی مقید ساخته بود و امام حسينعليه السلام دختری داشت چهار ساله و بسيار او را دوست داشت.

صاحب منتخب نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن انہوں نے اس صاحبزادی کی عمر تین سال کی لکھی ہے، بہر حال یہ صاحبزادی بھی حضرت امام حسنؑ کی حیات میں موجود نہ تھیں، صاحب روضۃ الشہداء نے ان چار صاحبزادیوں کے علاوہ اور کسی صاحبزادی کا حضرت کی اولاد میں ہونا اصلاً نقل نہیں کیا، اس مختصر بیان سے بھی قصہ دامادی کا بے اصل محض ہونا ثابت ہوتا ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ حضرت امام حسنؑ نے زید اور حسن مثنیٰ اور عبد اللہ یا کسی دوسرے بیٹے کیلئے تو عقد کی وصیت نہ کی اور قاسم کے عقد کے واسطے جو اپنے والد کی وفات وقت بہت ہی صغیر تھے، وصیت فرمائی، اس سے زیادہ حیرت انگیز کہ جن عقدوں کی بابت وصیت نہ تھی ان کو حضرت نے مدینہ میں کر دیا

---

[1] ہمان، ص ۴۲۲۔

،اور جس عقد کے واسطے وصیت تھی اس کو تعویق میں ڈالے رکھا،سب سے زیادہ قابل غور یہ بات ہے کہ اگر فاطمہ کے عقد کی قاسم کے ساتھ وصیت ہوتی تو حضرت ان کا عقد حسن مثنیٰ کے ساتھ کیسے کر دیتے ،پھر ایک شوہر کی موجودگی میں دوسرا عقد کیسا،کس قدر حیرت افزااورافسوسناک بات ہے کہ پڑھنے والے اور اس کی تائید کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اس توہین آمیز افترا کا ذکر (نظماًیانثراً(گستاخی اور بے ادبی کی کس حد تک پہنچاہوا ہے...

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ساتویں محرم کو مہندی کے متعلق خاص طور پر اہتمام کیاجاتا ہے،بفرض محال اگر وصیت کااظہاراوراس پر عمل ہوا بھی تو دسویں کو قریب دوپہر ہوا،ساتویں کو مہندی چہ معنی دارد،اس کے علاوہ یہ رسمیں مہندی،سانچنی وغیرہ وغیرہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ہمسایہ قوموں سے لی ہیں ،عرب میں جہاں اب بھی یہ باتیں نہیں آج سے تیرہ سوبرس پہلے ہونا کس قدر بعید از عقل بالتخصیص ہندوؤں کی ایک رسم کو خاندان رسالت کی طرف منسوب کرنا مسلمانوں کیلئے کس قدر شرمناک اور لایعنی حرکت ہے۔[1]

۲۰۔علاّمہ محقق سید شاکر حسین امروہوی مرحوم

مؤرخ امروہوی نے اپنی کتاب مجاہد اعظم کے صفحہ ۲۶۴ سے ۳۱۸ تک پورے ۵۴ صفحات پر بحث کر کے عقلی اور نقلی دونوں اعتبار سے اس شادی والی روایت کو بھرپور انداز سے رد کیاہے تفصیل کے شائقین اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں،سر دست بعض مطالب یہاں تحریر کیے جاتے ہیں۔فاضل مروہوی تحریر فرماتے ہیں:

> **"ان وضعی اور جعلی روایتوں میں سب سے زیادہ مشہور اور قابل لحاظ دامادی قاسم کی روایت ہے... مگر یہ قصہ محض بے بنیاد ہے،بے اصل اور سراسر بہتان وافترا ہے،قدماء کی تمام کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا،متاخرین نے بھی جس نے**

[1] تقریر الحاسم لقصہ عقد القاسم ص۱۸تا۵۵۔

روایات ووقعات کی صحت وغیر صحت کالحاظ رکھاہے، اس روایت کو نقل نہیں کیا، البتہ آخر زمانہ میں کتاب روضۃ الشہدا سے جو اکاذیب واباطیل کا خزانہ ہے یہ بلا نکلی، اسے ایک نئی اور دلچسپ بات دیکھ کر شیخ فخر الدین طریحی نے اپنی منتخب میں نقل کر دیا، اس کے بعد دوسرے جدت پسند... بلاسوچے سمجھے، اس روایت کو نقل در نقل کرتے آئے، اور یہ کور کورانہ تقلید آئندہ نسلوں کیلئے حجت ہو گی۔"[1]

ایک محققانہ اندازگیری کے مطابق نفی عقد شہزادہ قاسم علیہ السلام پر تقریباً انہی وجوہات کا ذکر کیا ہے۔ جسے ہم نے انکار کی وجوہات کے عنوان سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

مطالب بہت زیادہ ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر فارسی عربی کا جہاں ترجمہ نہیں کیا وہاں دیگر اعلام کی عبارات ابھی موقوف کی جارہی ہیں۔ کتابوں کے نام اور صفحات ہم نے تحریر کر دیے ہیں، شائقین اور محققین رجوع فرمائیں۔

عقد شہزادہ قاسم علیہ السلام کے قائلین کی ادلہ

اس عقد کے اثبات میں پیش کی جانے والی ادلہ فقط تین ہیں:

پہلی دلیل

یہ ٹھیک ہے کہ اگر امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں تعداد دختران ۲ مان لی جائے تو یہ عقد ممکن نہیں ہے۔ لیکن بعض مورخین نے ۳اور ۴ کے اقوال بھی تو تحریر کیے ہیں۔

جواب

اس دلیل کی صحت وسقم کے بارے پانچویں سوال کے جواب کے ضمن میں انجام دی جانے والی تحقیق ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] مجاھد اعظم ص ۲۶۴۔

دوسری دلیل

اس عقد کو بعض علماء نے اپنی کتب میں درج کیا ہے۔

جواب

اس سے تو ہمیں انکار نہیں کہ بعض علماء نے اسے تحریر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ درایت کے اصول پر یہ تحریر پوری اترتی ہے یا نہ؟ ورنہ انہیں کتب میں تو شہزادہ قاسم علیہ السلام کے فاطمہ کبری سلام اللہ علیہا کے بطن سے بیٹے کا بھی ذکر ہے اور ان کی شہادت کی داستان بھی تحریر ہے، ان کی قبر بھی ایران کے شہر تہران کے علاقہ شمران میں بنی ہوئی ہے۔ اگر کتابوں میں ہونا میزان حقیقت ہے تو قائلین عقد اسے کیوں نہیں مانتے اور کیوں نہیں پڑھتے۔ اسکے علاوہ بھی دسیوں ایسی باتیں کتب میں تحریر ہیں جو مسلمات شیعہ کے مخالف ہیں۔

تیسری دلیل

امام حسن علیہ السلام کا وصیت نامہ

جواب

اس وصیت نامے کی رد میں علماء اعلام بالخصوص آیت اللہ سید ظہور الحسن نے مفصل بحث کی ہے۔ یعنی ایسی کوئی وصیت معتبر سند کے ساتھ ثابت ہی نہیں ہے۔

اثبات عقد پر مولانا محمد حسنین سابقی مرحوم کے دو غلط حوالے

سابقی صاحب نے عروسی حضرت قاسم کو ثابت کرنے کے لئے، جہاں غلط حوالہ جات سے تمسک کیا ہے، وہاں انکے کلام میں تضاد بھی موجود ہے۔

پہلا حوالہ

مثلاً لکھتے ہیں کہ شیخ عباس قمی صاحب کتاب "مفاتیح الجنان" نے "نفس المھموم ترجم فارسی، ص ۱۷۱ میں لکھا ہے، ہماری نظر میں جناب قاسم کی شادی کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ [1]

[1]۔ رسوم الشیعہ ص ۱۹۷۔

سابقی مرحوم نے یہاں پر چند غلط بیانیوں سے کام لیا ہے:

اولاً: نفس المھموم عربی کی کتاب ہے، اس کا چند افراد نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ دوسرے افراد کے کے حاشیے کو مصنف کی طرف جان بوجھ کر نسبت دی ہے۔

ثانیاً: شیخ عباس قمی مرحوم نفی عروسی قاسم کے قائل ہیں، جناب لکھتے ہیں:

مخفی نماند که قصه دامادی جناب قاسمعليه‌السلام در کربلاء و تزویج او فاطمه بنت الحسینعليه‌السلام را صحت ندارد،چه آنکه در کتب معتبره به نظر نرسیده،و بعلاوه آنکه حضرت امام حسین علیه السلام را دو دختر بوده۔[1]

دوسرا حوالہ

لکھتے ہیں، مجتہد جلیل القدر آ قا سید علی بن مرزا محمد حسین مرعشی (متوفی ۱۳۴۴ھ) نے عقد جناب قاسم کے اثبات پر کتاب "البیان المبرهن فی عرس القاسم بن الحسن "عربی تالیف فرمائی، ملاحظہ ہو الذریعہ جلد ۳ ص ۱۸۳[2] اس جلیل القدر مجتہد نے اس عقد کے رد پر یہ کتاب لکھی ہے نہ کہ اثبات میں ،اس کی توضیح ہم سابقہ اوراق میں دے چکے ہیں اور علامہ احمد الفالی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ رسالہ ہند سے آنے والے سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے:

ولایخفي ان المرحوم العلامه السید محمد علي الشهر الستاني وسئل هذا السؤال بعینه من شیعة الهند فاتي في برسالة مستقله في الجواب.[3]

اس حوالہ سے دوسری غلط بیانی یہ کی گئی ہے کہ اس کی نسبت بھی صاحب الذریعہ کی طرف دے دی در حالانکہ الذریعہ سے ایسی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی جس سے ثابت ہو کہ یہ کتاب اس مسئلہ کے اثبات پر تحریر ہوئی ہے۔

---

[1] منتہی الامال چاپ جدید جلد ا ص ۷۰۰۔

[2] رسوم الشیعہ ص ۲۰۰۔

[3] اجوبہ مسائل دینیہ نص ۱۱۹۔

تضاد بیانی

ایک طرف تو یہ حضرات اس عقد کے اثبات پر زور دیتے ہیں اور مصائب میں بیان کرتے ہیں کہ بی بی فاطمہ کبری سلام اللہ علیہا نے کربلاء کے جانسوز واقعہ کے بعد اپنی والدہ کے ہمراہ ایران کی طرف سفر کیا اور ایران میں دونوں مخدرات یعنی جناب بی بی شہر بانو سلام اللہ علیہا اور فاطمہ کبری سلام اللہ علیہا کی زیارت گاہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ [1]

لیکن دوسری طرف مجالس میں فیس لی جاسکتی ہے کے عنوان سے بحث کرتے ہیں تو یہاں پر آ کے اسی فاطمہ کبری سلام اللہ علیہا کے عمل سے استدلال کرتے ہیں، اس حوالہ سے سابقی صاحب لکھتے ہیں:

> **شعراء و مصائب خوانان اہل بیتؑ کی جس قدر مالی معاونت کی جائے وہ کم ہے، جیسا کہ خود اہل بیت اطہار کا یہی وطیرہ رہا ہے، جس پر مندرجہ ذیل روایات سے بخوبی روشنی حاصل کی جاسکتی ہے:**
>
> **۱) حضرت فاطمہ کبری بنت امام حسین علیہ السلام نے شاعر اہل بیت کمیت بن اسدی کو تیس، ہزار دینار اور ایک گھوڑا عطا کیا۔** [2]

سابقی صاحب مرحوم ہوگئے ہیں اور اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے والے علی حسین قمی صاحب حیات ہیں اب یہ معمہ وہ حل کریں کہ بی بی فاطمہ کبری بنت امام حسین کربلاء کے بعد ایران آئیں یا مدینہ واپس لوٹیں۔ ہم کچھ لکھیں گے تو شکایت ہوگی۔

مجلہ میں اختصار کی وجہ سے ناصر الملت کے عقد قاسم کی نفی والے جواب کی تائید میں علماء کے بیانات کا سلسلہ ختم کیا جاتا ہے، مزید توضیحات اصل کتاب کی تحقیق کے دوران لکھی جائیں گی۔ ان شاء اللہ

---

[1]۔ تہران میں جس زوجہ قاسم کا مزار ہے اس کا نام "زبیدہ خاتون" لکھا ہوا ہے۔ جبکہ یہ نام امام حسین علیہ السلام کی کسی بھی دختر کا نہیں ملتا۔

[2]۔ رسوم الشیعہ ص۱۸۹۔

سوال پنجم: جناب فاطمہ صغراء کا مدینہ میں رہنا بوجہ مرض صحیح ہے یا ضعیف یا کذب صریح؟ جناب امام حسین علیہ الاسلام کی صاحبزادیاں کتنی تھیں؟

جواب: واللہ التوفیق۔ روایات مستفیضہ متکاثرہ معتبرہ سے ثابت ہے. کہ جناب فاطمہ صغریٰ ہمراہ جناب سید شہداء معرکہ کربلا میں موجود تھیں اور ان کا مدینہ میں رہنا بوجہ مرض کے کسی ضعیف روایت میں بھی نہیں دیکھا، ہاں بحارالانوار میں ایک روایت مشتمل بر ذکر غراب ایسی پائی جاتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ صغریٰ مدینہ میں تھیں، لیکن یہ روایت غراب غریب ہے، جیسا کہ مجلسی علیہ رحمہ نے خود اس کی تصریح جلاء العیون میں فرمادی ہے۔ چنانچہ اس روایت کے تذکرہ کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "این حدیث خالی از غرابتی نیست به جهت مخالفت با اخبار دیگر" بالجملہ چونکہ یہ روایت ماخوذ ہے مقتل اخطب خوارزم حنفی سے اور ضعیفۃ السند ہے، اور مخالف روایات کثیرہ معتبرہ ہے، لہذا مقبول نہیں ہوسکتی، اور جناب سید شہداء علیہ الاسلام کی صاحبزادیاں بنابر قول مشہور دو تھیں ایک حضرت فاطمہ صغریٰ اور دوسری حضرت سکینہ واللہ اعلم۔ (۱)

تائیدات جواب پنجم

اس سوال میں دو مسئلے پوچھے گے ہیں:

۱۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی بیٹیوں کی تعداد؛

۱۔ ھدایات ناصریہ ص ۴۔

۲۔ جناب فاطمہ صغریٰ سلام اللہ علیہا کا مدینہ میں رہ جانا۔
ہم ان دونوں سوالوں کے بارے میں جداگانہ بحث کریں گے تا کہ مطلب واضح ہو سکے:

پہلا مسئلہ: تعداد اولاد امام حسین علیہ السلام

امام حسینؑ علیہ السلام کی تعداد اولاد کے بارے میں اہل سیر و تاریخ میں قدرِ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم نے جس حد تک ممکن تھا تلاش و جستجو کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ امامؑ کی اولاد کے بارے میں پانچ عدد اولاد سے لے کر بارہ عدد تک کے اقوال موجود ہیں۔ کل اقوال کی تعداد ۸ ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد بارے اقوال

پہلا قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۱۲ عدد (آٹھ بیٹے اور چار بیٹیاں)؛
دوسرا قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۱۰ عدد (چھ بیٹے اور چار بیٹیاں)؛
تیسرا قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۱۰ عدد (آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں)؛
چوتھا قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۹ عدد (چھ بیٹے اور تین بیٹیاں)؛
پانچواں قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۸ عدد (چار بیٹے اور چار بیٹیاں)؛
چھٹا قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۷ عدد (پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں)؛
ساتواں قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۶ عدد (چار بیٹے اور دو بیٹیاں)؛
آٹھواں قول: حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کی تعداد ۵ عدد (تین بیٹے اور دو بیٹیاں)۔

لیکن اکثر اہل سیر و تاریخ و علماء علم انساب ۶ عدد کے قائل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ اختلاف امامؑ کی کل اولاد کے بارے میں ہے، جس میں بیٹیاں اور بیٹے شامل ہیں مگر صرف بیٹیوں کے بارے میں کُل تین اقوال ہیں یعنی ۲، ۳، ۴ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے:

پہلا قول:اولاد امام کی تعداد ۱۲عدد ہے:

میرزاابوالفضل تہرانی حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں:

على الجمله مجموع اولاد سيدالشهداء عليه السلام بناء بر جميع روايات دوازده تن بوده‌اند،كه دو نفر يقيناً شهيد شده‌اند... و اقواى اين وجوه همان روايت شيخ مفيد رحمه الله است كه اوثق و ابصر از سائرين است...[1]

یادرہے کہ آقای تہرانی ۱۲عدد کے معتقد نہیں ہیں،بلکہ انہوں نے صرف جمع روایات کی ہے،وہ خود ٦ عدد کو ترجیح دیتے ہیں۔

دوسرا قول:دس عدد اولاد(یعنی چھے بیٹے اور چار بیٹیاں)

وہ علماء اعلام جو امام حسین علیہ السلام کی تعداد اولاد میں عدد دس کے قائل ہے درجہ ذیل ہیں:

۱۔کمال الدین محمد بن طلحہ الشافعی،جو اپنی کتاب مطالب السول میں رقمطراز ہیں:

كان له من اولاد ذكور و اناث عشرة ستة ذكور و اربع اناث

۲۔مقدس اردبیلی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ،اپنی کتاب حدیقۃ الشیعہ میں یہ قول اختیار کیا ہے:

آنحضرت را شش پسر و چهار دختر بود.

پھر سب کے نام لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

وبعضى سه دختر گفته‌اند زينب،سكينه،فاطمه و اين قول اصح است كه زينب نام دو دختر بودند صغرى و كبرى.[2]

یعنی امامؑ کی دس اولادیں تھیں چھ فرزند...چار دختر لیکن بعض نے تین دختر بھی لکھی ہیں اور یہ قول درست ہے کہ امامؑ کی زینب نام کی دو بیٹیاں تھیں زینب صغریٰ وزینب کبریٰ۔

---

[1]۔شفاء الصدور فی شرح زیارۃ العاشور ص۵۳۵۔

[2]۔حدیقۃ الشیعہ ص۵۰۲ چاپ سوم۔

۳) **محمد رضا مدرسؒ** ہے۔ جنہوں نے اسی قول کو اختیار کیا ہے لیکن انہوں نے بھی امامؑ کی چوتھی دختر کا نام نہیں لکھا۔[1]

۴) آقای محسن امین عاملیؒ بھی دس عدد کے قائل ہیں۔[2]

تیسرا قول: دس عدد اولاد (آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں)

آقای سید مہدی رجائی موسوی نے امام حسینؑ کی دس اولادوں کا ذکر کیا ہے ۸ فرزند اور دو دختر، لیکن اگر دقت سے دیکھا جائے تو یہ قول اس بات پر ناظر ہے کہ امامؑ کے چھ فرزند اور دو دختر تھیں، کیونکہ امامؑ کی اولاد ذکور میں سے ایک ابو بکر کو ذکر کیا ہے جسے جعفر بھی کہتے تھے، اور پھر جعفر کا ذکر جدا بھی کیا ہے، اور اسی طرح عبداللہ اور علی اصغرؑ کو جدا جدا تحریر کیا ہے جبکہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے۔ لیکن بہر حال دختران امام ان کے نزدیک دو ہی ہیں۔[3]

انکے بعد والے اہل قلم میں سے جس نے بھی دس عدد والا قول اختیار کیا ہے انہوں نے انہی میں سے بعض کتابوں خصوصا مطالب السؤل کے حوالہ پر اکتفا کیا ہے۔

ان حضرات کی عبارات سے امامؑ کی فاطمہ نام کی دو بیٹیاں اشارۃ و کنایۃ سمجھ میں نہیں آتیں لے دے کے محقق اردبیلیؒ ایسے ملے ہیں جنہوں نے امامؑ کی دو بیٹیوں کے نام زینب کبریٰ و زینب صغریٰ بتائے ہیں، لیکن زینب کبریٰ کے حالات زندگی کی طرف اصلاً اشارہ تک نہیں کیا، اور آقای رجائی تعداد دختری کے حوالہ سے دو بیٹیوں والے نظرے کے حامی ہیں۔

---

[1] ۔جنات الخلود ص ۲۲۔

[2] ۔اعیان الشیعہ ج ۲، امام حسنؑ و امام حسینؑ ص ۱۰۸۔

[3] ۔المعقبون من آل ابی طالب ج ۲ ص ۵۔

چوتھا قول: نوعدد اولاد (چھ بیٹے اور تین بیٹیاں)

اس قول کے قائل علماء اعلام درجہ ذیل ہیں:

۱) علامہ ابن شہر آشوب:

ابن شہر آشوب مناقب میں امام مظلومؑ کی نوعدد اولاد کے قائل ہیں، اس ترتیب کے ساتھ:

۱۔ جناب علی اکبر شہید علیہ السلام؛ ۲۔ جناب علی الامام اوسط علیہ السلام؛

۳۔ جناب علی اصغر علیہ السلام؛ ۴۔ جناب محمد علیہ السلام؛

۵۔ جناب عبداللہ علیہ السلام؛ ۶۔ جناب جعفر علیہ السلام؛

۷۔ حضرت بی بی سکینہ سلام اللہ علیہا (بی بی رباب سلام اللہ علیہا سے)

۸۔ حضرت بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا (بی بی ام اسحاق سلام اللہ علیہا سے)

۹۔ حضرت بی بی زینب (والدہ کا نام نہیں لکھا)[1]

۲) محمد بن عبداللہ بن نصر معروف بہ ابن خشاب بغدادی (متوفی ۵۶۷ھ):

ابن خشاب سید الشہداء علیہ السلام کی اولاد کی تعداد بارے میں لکھتے ہیں:

ولد له ستة بنين وثلاث بنات

حضرت امام حسین علیہ السلام کے بیٹے اور تین بیٹیاں مجموعاً نوعدد تھی جن کی تفصیل درجہ ذیل ہے:

چھے بیٹے: ۱۔ جناب علی اکبر علیہ السلام؛ ۲۔ جناب علی امام اوسط علیہ السلام؛

۳۔ جناب علی اصغر علیہ السلام؛ ۴۔ جناب جعفر علیہ السلام؛

۵۔ جناب عبداللہ علیہ السلام؛ ۶۔ جناب محمد علیہ السلام؛

تین بیٹیاں: ۷۔ جناب زینب علیہا السلام؛ ۸۔ جناب سکینہ علیہا السلام؛

۹۔ جناب فاطمہ علیہا السلام[2]

۳) مؤمن شبلنجی:

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب ج۴ ص۷۷۔

[2] موالید الآئمہ ووفیاتہم، مجموعہ نفیسہ ص۱۷۷۔

مومن شبلنجی نے صاحب "بغیة الطالب لمعرفة اولادعلی ابن ابی طالب علیہ السلام" کا قول نقل کیاہے:

کان له ست بنین و ثلاث بنات،وهم علي اكبر امه ليلي وعلي اوسط وعبدالله وعلي اصغر زين العابدين وزينب وسكينه وفاطمه[1]

۴)ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم طبری الامامی دلائل الامامہ ص ۷۴۔
یہ ہیں وہ علماء جنہوں نے امامؑ کی اولاد نو عدد بتائی ہے اگر کوئی اوراس نظریہ کا قائل ہے تو ان میں سے کسی کی طرف نسبت کیساتھ ،فلا تغفل۔

پانچواں قول: آٹھ عدد اولاد (چار بیٹے اور چار بیٹیاں)

۱) آقای ہادی امینی فرزند عبدالحسین امینی صاحب "الغدیر" نے صاحب "موجز التواریخ" کا قول نقل کیاہے:

یہ صاحب امامؑ کی اولاد کی تعداد ۸ آٹھ عدد بتاتے ہیں، چار فرزند چار دختر چار دختر کے نام یہ ہیں: ۱۔جناب سکینہ سلام اللہ علیہا؛ ۲۔جناب زینب سلام اللہ علیہا؛ ۳۔جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا؛ ۴۔جناب رقیہ سلام اللہ علیہا۔

یہ صاحب اپنے قول میں بالکل منفرد ہیں۔

چھٹا قول: سات عدد اولاد (پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں)

۱)ابن جوزی اور اسکی اتباع کرنے والے:

سات عدد کے قائل ہیں، یہ وہی مشہور و معروف سنی مؤرخ ہے جسکی دیگر علمی، تاریخی، ادبی کتابوں کے علاوہ اور فقط تاریخ مصر چالیس جلدوں پر مشتمل ہے، یہ صاحب اپنی مشہور و معروف کتاب " تذكرة الخواص الآئمه فی خصائص الائمه" میں فرماتے ہیں:

امام کے پانچ فرزند اور دو دختر تھیں دختران میں سکینہ و فاطمہ کا شمار کیاہے۔[2]

---

[1] نورالابصار ص ۱۲۷ طبع مصر۔

[2] تذکرۃ الخواص الآئمہ ص ۲۷۷۔

ساتواں قول: چھ عدد اولاد (چار بیٹے اور دو بیٹیاں)

۱) شیخ مفیدؒ ارشاد فرماتے ہیں:

وکان للحسین ستة اولاد: ۱) علي بن الحسین اکبر کنیته ابو محمد؛ ۲) و علي بن الحسین الاصغر قتل مع ابیه؛ ۳) جعفر بن الحسین؛ ٤) عبد الله بن الحسین قتل مع ابیه صغیراً جاءه سهم وهو في حجر ابیه فذبحه؛ ٤) سکینه بنت الحسین و امّها الرباب؛ ٦) فاطمه بنت الحسین وامّها امّ اسحاق[۱]

امام حسینؑ کی چھ اولادیں تھیں چار فرزند: ۱۔ علی اکبرؑ ابن حسینؑ؛ ۲۔ علی اصغر ابن حسینؑ کہ جو اپنے والد کے ساتھ شہید ہوئے؛ ۳۔ جعفر ابن حسینؑ؛ ۴۔ عبد اللہ ابن حسینؑ۔ دو بیٹیاں تھیں: ۱۔ سکینہ بنت الحسینؑ؛ ۲۔ فاطمہ بنت الحسینؑ۔

۲) امین الاسلام شیخ طبرسیؒ کتاب اعلام الوریٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

کان له ستة اولاد

اسکے بعد تمام وہی نام لکھے ہیں جو شیخ مفید نے ارشاد میں تحریر فرمائے ہیں یعنی امامؑ کی چھ اولادیں تھیں چار فرزند اور دو بیٹیاں۔[۲]

۳) حاج فرہاد مرزا صاحب قمقام فرماتے ہیں:

اولاد امجادش بقول اصح شش تن چهار پسر و دو دختر

یعنی صحیح قول کے مطابق امامؑ کی چھ اولادیں تھیں چار فرزند اور دو بیٹیاں۔[۳]

---

[۱]۔ الارشاد ج۲ ص۱۳۵۔

[۲]۔ اعلام الوریٰ ص۲۵۵ فصل خامس۔

[۳]۔ قمقام الذخار ج۱ ص۲۶۔

۴)مؤرخ شہیر میرزا محمد تقی سپہر صاحب ناسخ التواریخ فرماتے ہیں:

امامؑ کی اولاد چھ عدد یعنی چار فرزند اور دو دختر کے بارے میں اپنی تحقیق ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

مکشوف باد که آنچه این بنده بی بضاعت باستقراء واستیعاب رنج برد و اختیار نمود،آن است که حسینعليه‌السلام را چهار پسر بود،۱) علی اکبر شهید؛ ۲) علی اوسط هو الامام؛ ۳) علی اصغر؛ ۴) عبد الله سه تن از ایشان در یوم طف شهید شدند... و آنحضرت را دو دختر افزون نبود نخستین فاطمه و آن دیگر سکینه[1]

۵)آقای محمد باقر مدرس فرماتے ہیں:

امامؑ کی چھ اولادیں تھیں چار فرزند اور دو دختر[2]

۶)صاحب بحر الانساب فرماتے ہیں:

امّا در اخبار آورده‌اند که امام حسینعليه‌السلام را شش فرزند بود: ۱- حضرت زین العابدینعليه‌السلام؛ ۲- عبد اللهعليه‌السلام؛ ۳- محسنعليه‌السلام؛ ۴- علی اکبرعليه‌السلام؛ و دو دختر آن حضرتعليه‌السلام ۱- حضرت فاطمه‌عليها‌السلام؛ ۲- حضرت زبیده‌عليها‌السلام.[3]

۷۔ آقا محدث خراسانی فرماتے ہیں:

شیخ مفیدرحمه‌الله در ارشاد و امین الاسلام طبرسیرحمه‌الله در اعلام الوری و احمد بن مهنه در عمده الطالب و بعضی از علماء اعلام فرموده‌اند که انحضرت شش اولاد داشته چهار پسر و دو دختر.

---

[1] ناسخ التواریخ ج۴ص۲۳۵وص۲۴۱۔

[2] شخصیت حسینؑ ص۵۹۵۔

[3] بحر الانساب ص۱۵۔

شیخ مفید نے ارشاد میں، امین الاسلام نے اعلام الوریٰ میں احمد نے عمدۃ الطالب میں اور بعض اعلام نے فرمایا ہے کہ امام حسینؑ کی چھ اولادیں تھیں چار فرزند دو دختر۔

۸) یوسف گنجی شافی فرماتے ہیں:

وکان للحسين بن علي عليه السلام ستة اولاد.[۱]

۹) شیخ عباس قمیؒ صاحب مفاتیح الجنان فرماتے ہیں:

شيخ مفيد رحمه الله فرموده كه آن حضرت را شش فرزند بود چهار تن از ايشان پسران بودند... اما دختران يكى سكينه است كه مادرش رباب دختر امرءالقيس است... و دختر ديگر فاطمه نام داشت و مادر او ام اسحاق دختر طلحه بن عبد الله تميميه است...

آگے فرماتے ہیں:

و مختار شيخ مفيد رحمه الله را جمعى ديگران نيز اختيار كرده‌اند لكن سيد سجاد عليه السلام را على اوسط تعبير كرده‌اند و على ابن الحسين عليه السلام را على اكبر عليه السلام.

حضرت کی چھ اولادیں تھیں چار فرزند... اور دو دختر ایک سکینہ جن کی والدہ رباب دختر امرء القیس ہیں... دوسری فاطمہ جن کی والدہ ام اسحاق دختر طلحہ بن عبد اللہ تیمیہ ہیں... شیخ مفید کے قول کو علماء کے ایک گروہ نے اختیار کیا ہے۔[۲]

یاد رہے کہ شیخ عباس قمی کا یہ قول مختار بھی ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ شیخ عباس قمی مرحوم نے حضرت قاسم کی شادی کی روایت کو رد کرتے ہوے تصریح فرمائی ہے:

۱۔ کفایۃ الطالب فی مناقب علیؑ ابن ابی طالبؑ ص ۴۳۹۔

۲۔ منتہی الامال ج ۱ ص ۸۵۵ و احسن المقال ج ۱ ص ۵۵۰، در کربلا چہ گذشت ص ۵۴۳ باب پنجم۔

خفی نماند که قصه دامادی جناب قاسم علیه السلام در کربلا و تزویج او فاطمه بنت الحسین علیه السلام را صحت ندارد،چه آنکه در کتب معتبره به نظر نرسیده،و بعلاوه آنکه حضرت امام حسینؑ را دو دختر بوده۔[۱]

۱۰)علامہ محمد باقر مجلسیؒ صاحب "بحار الانوار":

علامہ بزرگوار نے بھی بحارالانوار میں شیخ مفید کا قول اختیار کیا ہے:یعنی چھ عدد اولاد چار فرزند دو دختر[۲]

۱۱)احمد بن یحیٰ جابر بلاذری فرماتے ہیں:

فولد الحسینؑ علیاً الاکبر... و ولد ایضاً علي الاصغر...

آخر میں فرماتے ہیں:

و ولد ایضاً فاطمه بنت الحسینؑ امها ام اسحاق و ولد ایضاً سکینه بنت الحسینؑ امها الرباب بنت امرء القیس۔[۳]

۱۲)علامہ محقق سید شاکر حسین امروہویؒ فرماتے ہیں:

ہم نے جہاں تک مورخین ونسابین کی مستند اور معتبر کتابوں کو دیکھا اور اس اختلاف کی چھان بین کی ہمارے خیال میں بھی حضرت کی صرف دو بیٹیاں فاطمہ اور سکینہ تھیں جن کو حضرتؑ اپنے ساتھ ہی سفر میں لے لیا تھا،اور تیسری کوئی بیٹی نہ تھیں جن کو آپ وطن میں چھوڑ جاتے... جناب سید الشہداء علیہ السلام کی صاحبزادیاں

۱۔ منتہی الامال چاپ جدید جلد ا ص ۷۰۰۔

۲۔ بحارالانوار ج ۴۵ ص ۳۲۹۔

۳۔ انساب الاشراف ج ۳ ص ۱۴۶۔

بنابر قول مشہور دو تھیں ایک حضرت فاطمہ صغریٰ دوسری حضرت سکینہ... بہر حال چونکہ یہ روایت تمام مشہور و مستند کتابوں کے خلاف ہے اس لئے اس کے ناقابل اعتناء اور ساقط الاعتبار ہونے میں کیا شک رہا اگر اس کی روایت بہ سند مسلسل کہیں مل بھی جائے تو بھی اس وجہ سے کہ حضرت کی کوئی تیسری بیٹی جس کا نام فاطمہ ہو، تھی ہی نہیں پھر اس سند کو کیونکر مستند سمجھا جائے گا۔[1]

۱۳) آیت اللہ سید محمد بن سید دلدار علی نقوی سلطان العلماء رضوان مآب (۱۱۹۹۔۱۲۸۴ھ ق):
آپ جدول چہاردہ معصومینؑ میں جناب سید الشہداء علیہ السلام کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں:

اولاد حضرتؑ چهار پسر و دو دختر، علی السجادؑ، علی الاکبرؑ، عبد الله مشهور به علی اصغرؑ و جعفر که در حیات آنحضرت وفات یافت و سکینه و فاطمه.[2]

۱۴) فخر الدین طریحی:
اپنی کتاب منتخب جزو ثانی کی مجلس اول میں لکھتے ہیں:

و كان للحسين بنتان سكينة وفاطمة الصغرى

ان کے علاوہ اور بھی کافی سارے ایسے علماء اعلام موجود ہیں جنہوں نے امامؑ کی چھ عدد اولاد ہونے یعنی چار بیٹے اور دو بیٹیاں کو قبول کیا ہے لہٰذا ہم اختصار کے پیش نظر ان کی عبارت کو حذف کر کے فقط قارئین کرام کے افادہ معلومات کیلئے اس جگہ پر انکے نام اور کتاب کا حوالہ پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں:

۱۲) ابن صباغ مالکی: فصول المہمہ ص۱۸۸۔

۱۳) علاّمہ محقق تستری صاحب قاموس الرجال: تاریخ آئمہ۔

1۔ مجاہد اعظم ص۲۴۶،۲۴۵۔

2۔ بحوالہ مجاہد اعظم ص۳۰۴۔

۱۴)علاّمہ حلیؒ:المستجاد ص ۴۰۴۔
۱۵)علاّمہ طبرسیؒ: تاج المو الید ص ۱۱۰۔
۱۶)ملاّ حسین کاشفی:روضۃالشہداء ص ۴۰۷۔
۱۷)صاحب مجدی:ص ۹۱۔
۱۸)صاحب شجرہ مبارکہ:ص ۷۳۔
۱۹)ابن جوزی: تذکرۃ الخواص ص ۲۷۷۔
۲۰)محمد بن علی صبان مصری شافعی:اسعاف الراغبین حاشیہ بر نورالابصار ص ۱۹۵۔
۲۱)سید علی نقی حائریؒ:نورالاخبار ص ۳۳۔
۲۲)علاّمہ عبداللہ بن نوراللہ:مقتل عوالم ص ۶۴۰۔
۲۳)صاحب ستارگان درخشان ج ۵ ص ۲۱۹۔
۲۴)محمد بن ابی بکر انصاری قرن سابع:الجوہرہ فی نسب الامام علیؑ وآلہ ص ۵۴۔
۲۵)ابی نصر بخاری : سر السلسلۃ العلویۃ ص ۳۰۔
۲۶)صاحب:الجازم فی نسب بنی ہاشم ص ۷۹ تا ۸۱۔
۲۷)عمادزادہ اصفہانی: مجموعہ زندگانی چہاردہ معصومینؑ ص ۶۳۲۔
۲۸)علاّمہ نسّابہ صفی الدین متوفی ۷۰۹:الاصلی فی انساب الطالبین ص ۱۴۳۔اور ص ۶۲ پر
۲۹)ابن عنیبہ صاحب عمدۃ الطالب:الفصول الفخریہ ص ۱۳۳۔
۳۰)السید احمد الحسینی:النجوم الزواہر ص ۱۲۵ طبع بغداد۔
۳۱)السید فاضل موسوی خلخالی زادہ:الشجرہ الطیبہ ج ۲ ص ۲۔
۳۲)محمد محمدی اشتہاردیؒ:سوگنامہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۲۷۲۔
۳۳)ابو سعید حسن شیعی سبزواری:راحۃ الارواح و مونس الاشباح ص ۱۴۹ میں۔
۳۴)علامہ محمد سلیمان تنکابنی:اکلیل المصائب ص ۱۵۰۔

۳۵)علاّمہ عبد اللہ بن نور اللہ صاحب عوالم: مقتل عوالم۔
۳۶)علاّمہ میرزا ابو الفضل تہرانی: شفاء الصدور شرح زیارۃ العاشور ص ۵۳۵۔
۳۷)خواجہ محمد پارسا بخاری: فصل الخطاب۔
۳۸)یحیٰی ابن ابی بکر کانی عامری: ریاض مستطابہ میں۔
۳۹)احمد بن عبد القادر عجیلی شافعی: ذخیرۃ الحال میں۔
۴۰)ملا محمد مبین فرنگی محلی: وسیلۃ النجات میں۔

وہ علماء اعلام جو پانچ عدد اولاد کے قائل ہیں:

۱)علاّمہ ابن الحیان اسعاف الراغبین صاحب نے یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

امامؑ کی اولاد پانچ ہے تین فرزند ۱۔ علی اکبرؑ ۲۔ علی اصغر اعنی امام زین العابدینؑ ۳۔ جعفر اور دو دختر کے قائل ہیں ۱۔ سکینہ ۲۔ فاطمہ۔[1]

امام حسینؑ کی اولاد کی تعداد کے بارے میں یہ تھا علماء کے درمیان اختلاف یعنی امامؑ کی اولاد کے بارے میں کل ۱۸ اقوال ہیں:

۱۔ پانچ عدد اولادیں تین فرزند دو دختر؛
۲۔ چھ عدد اولاد چار فرزند دو دختر؛
۳۔ سات عدد اولادیں پانچ فرزند دو دختر؛
۴۔ آٹھ عدد اولاد چار فرزند چار دختر؛
۵۔ نو عدد اولاد چھ فرزند تین دختر؛
۶۔ دس عدد اولاد چھ فرزند چار دختر؛
۷۔ دس عدد اولاد آٹھ فرزند دو دختر؛

---

[1]۔ اسعاف الراغبین حاشیہ نور الابصار طبع مصر ص ۱۹۵۔

۸۔ بارہ عدد ۸ آٹھ فرزند ۴ دختر۔

لیکن چوتھی بیٹی کا نام نہیں لکھا، لہٰذا چوتھی بیٹی یا زینب صغری ہے جیسا کہ مقدس اردبیلیؒ نے کہا ہے یا رقیہ ہے جیسا کہ صاحب موجز التواریخ نے لکھا ہے، یا پھر وہی فاطمہ ہے جو مدینہ میں رہ گئی تھیں۔

پہلے دو نظریوں میں دونوں حضرات منفرد ہیں اور نہ ہی ان کے کوئی قابل ذکر حالات ہیں اور تیسرا قول اس لئے ضعیف ہے کہ علاّمہ مجلسیؒ نے اس واقعہ کو مناقب کی قدیم کتاب سے نقل کیا ہے، بعد میں خود اس کے ضعیف ہونے کا دعویٰ کر دیا، اور دوسرا اس لئے کہ تمام اہل سیر و تواریخ و علماء انساب اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ، حضرت کی فاطمہ نام کی دو بیٹیاں نہیں تھیں، اور قصہ غراب فاطمہ نام کی بچی سے منسوب ہے۔

لہٰذا امام کی چوتھی بچی کا نہ ہونا تو بالکل روشن ہو گیا ہے اور اگر مان بھی لیا جائے تو کم از کم اس کے بارے میں کسی قسم کی کوئی اطلاع موجود نہیں ہے۔ رہ گئی تیسری بیٹی زینب اگرچہ بعض حضرات زینب نام کی بچی کو امام حسین کی بیٹی تسلیم کرتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ اکثر علماء اعلام نے ان کی والدہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک امامؑ کی پانچ بیویاں ہیں اور ان پانچوں سے وہی چھ اولادیں پیدا ہوئی ہیں یہ تیسری زینب جو امامؑ کی بیٹی ہے امامؑ کی کس بیوی کے بطن سے متولد ہوئی، اہل تاریخ کے بعض اعلام اسے ام اسحاق کی طرف نسبت دیتے ہیں اور بعض اس بارے میں بالکل خاموش نظر آتے ہیں۔[1]

اسی وجہ سے محقق سامی الغریری الغراوی نے ذخائر العقبی پر تحقیق کرتے ہوئے مؤلف کی اس عبارت کے بعد کہ امام حسین کی ۹ اولادیں تھیں ۶ فرزند ۳ دختر زینب کے نام بعد لکھا:

> لا ادری من این جا ءت،ولم یذکرها الشیخ المفیدؒ او غیره من علماء الامامیه بل زکرها المسعودی،و ابي طاهر البغدادی في بلا غات النساء.[2]

---

[1] ۔ امام حسنؑ و حسینؑ ص ۱۰۸ محسن امین عاملی۔

[2] ۔ ذخائر العقبی جلد ۲ ص ۱۸۲۔

یا پھر بیھقی صاحب "لباب الانساب" کا یہ قول قبول کرنا زیادہ بہتر ہے کہ امام کی چار بیٹیاں تھیں لیکن دو بچپنے میں ہی فوت ہو چکی تھیں۔ واللہ العالم بالصواب۔

خلاصہ کلام:

یہ ہوا کہ قول معروف و مشہور کی بنا پر امام مظلوم کی دو بیٹیان تھیں، اور قول غیر معروف کی بنا پر امام کی تین یا چار بیٹیاں تھیں۔ لیکن چونکہ تیسری اور چوتھی بنابراین قول کم سن تھیں اور اسی کم سنی میں بعض کے بقول وفات پا چکی تھیں اور ان کے حالات بھی کتب میں موجود نھیں ہیں تو اس سے یہ نتیجہ لینا درست ہو گا کہ مسئلہ شادی حضرت قاسم درست نہیں اور اسی طرح بفرض قبول امام کا کمسن بچی کو تنہا چھوڑ کے جانا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے۔

کتابوں میں آ جانا یا کسی واقعہ کا مشہور ہونا اس کی حقانیت و واقعیت کی دلیل نہیں بن سکتا، دسیوں واقعات ایسے ہیں کہ جو کتابوں میں بھی موجود ہیں اور مشہور بھی ہیں لیکن انہیں قبول نہیں کیا جا سکتا جیسے عقد حضرت ام کلثوم بنت امیر المومنین علیہ السلام با خلیفہ دوم، اور اسی طرح عقد حضرت سکینہ بنت امام حسین دشمنان اہل بیت اور اس طرح کے دیگر مسائل۔

دوسرا مسئلہ: مدینہ میں دختر امام حسین علیہ السلام کا رہ جانا

سوال میں دوسرا مسئلہ فاطمہ صغریٰ علیہا السلام کے مدینہ رہ جانے کے بارے میں تھا اس مسئلہ کی بھی تحقیق پیش کی جاتی ہے۔

بی بی فاطمہ کبری سلام اللہ علیہا کا تعارف

دادا: امام المتقین حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام۔

دادی: سیدہ نساء العالمین حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا۔

چچا: قتیل مسموم حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام۔

مادر گرامی: ام اسحاق بنت طلحہ بن عبداللہ تیمی۔
برادران: حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت علی اکبر، حضرت علی اصغر، وجعفر علیہم السلام۔
خواہر گرامی: سکینہ بنت امام حسینؑ۔
شوہر: جناب حسن مثنیٰ ابن امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام۔
کنیت: ام عبداللہ۔
القاب: فاطمہ صغریٰ، فاطمہ کبریٰ، النبویہ۔
فرزندان: عبداللہ محض، ابراہیم الغمر، حسن مثلث، وزینب۔
تاریخ ولادت: ۵۱ ہجری قمری، تقریبا
تاریخ رحلت: ۱۱۷ ہجری قمری۔
عمر مبارک: تقریبا ۶۶ سال۔
مدفن: مدینہ منورہ قبرستان بقیع

یہ معظمہ جناب سید الشہداء کی بڑی صاحبزادی ہیں آپ کی والدہ ماجدہ ام اسحاق بنت طلحہ بن عبید اللہ تمیمیہ ہیں، اس مخدرہ کو تقوی وتقدس کی وجہ سے صدیقہ طاہرہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔[1]

امام حسینؑ نے اپنے بھتیجے شہزادہ حسن مثنّی ابن امام حسنؑ مجتبیٰ علیہما السلام کے ساتھ آپ کا عقد کیا۔ روایات میں کچھ اس طرح ذکر ہے کہ جب شہزادے نے امام حسین علیہ السلام سے رشتہ کی خواستگاری کی تو امامؑ نے فرمایا: میری دو صاحبزادیاں ہیں جن سے چاہو تمہارا عقد کر دیتا ہوں۔

جناب حسن مثنّی علیہ السلام نے حیاوشرم کی وجہ سے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا پھر امامؑ نے خود ہی فرمایا کہ میں تمہارے لئے اپنی بڑی صاحبزادی فاطمہ کو منتخب کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ میری والدہ ماجدہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے زیادہ شباہت رکھتی ہے۔

---

[1]۔ (ناسخ التواریخ ج ۶ ص ۴۹۹، منتہی الامال ج ۱ ص ۴۵۰، ارشاد ج ۲ ص ۲۶، فصول المہمہ ص ۱۶۰ وغیرہ۔

اس مذکورہ عقد کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل کتب کی طرف رجوع فرمائیں:

۱) شیخ مفیدؒ، الارشاد جلد ۲ ص ۲۵۔

۲) ابی فرج اصفہانیؒ، مقاتل الطالبین ص ۱۶۷۔

۳) ابن صباغ مالکی، فصول المہمہ ص ۱۶۰۔

۴) شیخ عباس قمیؒ، منتہی الامال۔

۵) علاّمہ مجلسیؒ، بحار الانوار، ج ۴۵۔

۶) علاّمہ نسابہ السید عزالدین ابی طالبؒ، الفخری انساب الطالبین بامقدمہ حضرت آیۃ اللہ مرعشی نجفی ص ۸۵۔

۷) ابی الحسن علی بن ابی القاسم بن زید البیہقی الشہیر بابن فندق (متوفی ۵۶۵ ہجری)، لباب الانساب بامقدمہ حضرت آیۃ اللہ مرعشی نجفیؒ ص ۳۸۵۔

۸) فخر الدین رازی صاحب تفسیر کبیر، الشجرۃ المبارکۃ، ص ۵۔

۹) شیخ طوسی، رجال طوسی، ص ۱۱۲۔

۱۰) ابو الحسن عمری علماء قرن پنجم صاحب المجدی، فی انساب الطالبین، ص ۱۹۔

۱۱) سید احمد بن محمد گیلانی (متوفی قرن دہم) سراج الانساب، ص ۳۶۔

۱۲) یحیی بن حسن بن جعفر بن عبد اللہ بن حسین اصغر بن امام سجاد عبیدلی (متوفی ۲۲۱ ہجری) تہذیب الانساب، ص ۳۴۔

۱۳) احمد بن علی حسینی معروف ابن عینا (متوفی ۸۲۸ ہجری) عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب علیہم السلام، ص ۸۴۔

۱۴) شیخ محمد بن علی حبان، اسعاف الراغبین فی سیرۃ المصطفی واہل بیت الطاہرین علیہم السلام، ص ۲۱۰۔

۱۵) سید مقرم نجفی، مقتل حسینؑ، ص ۳۷۶۔

۱۶) ابی الفرج اصفہانی (متوفی ۳۵۶ ہجری) الاغانی، ج ۱۸، ص ۲۰۴۔

۱۷) علی بن عیسی اربلی (متوفی ۶۸۷ ہجری) کشف الغمہ فی معرفۃ الائمۃ علیہم السلام۔

۱۸) آقای خراسانی، منتخب التواریخ ص ۲۴۴ باب پنجم فاطمہ بنت الحسینؑ۔
۱۹) محمد ہادی امینیؒ، فاطمہ بنت امام حسین، ص ۶۸۔
۲۰) شیخ جعفر نقدی، فاطمہ بنت الحسینؑ، ص ۲۱، ۳۴، ۱۰۔
۲۱) رسول محلاتی، زندگانی امام حسین، ص ۵۵۴۔
۲۲) الدر المنثور، ص ۳۶۱۔
۲۳) فاطمہ بنت الحسینؑ، ص ۱۲، ۱۱۔
۲۴) احسن المقال ترجمہ منتہی الامالی، ج ۱، ص ۲۷۲۔
۲۵) قاموس الرجال، ج ۳، ص ۲۱۲۔
۲۶) طبقات الکبری، ج ۵، ص ۳۱۹۔
۲۷) تاریخ بغداد، ج ۷، ص ۲۹۳۔
۲۸) کامل ابن اثیر، ج ۱، ص ۲۱۲۔
۲۹) آیت اللہ ابو القاسم الموسوی الخوئی، معجم الرجال۔

یہ معظمہ واقعہ کربلا کی چشم دید گواہ ہیں اس حوالے سے بعض روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ فاطمہ بنت الحسینؑ سے مروی روایات دیکھنے کے شائقین علامہ محمد ہادی امینی مرحوم کی کتاب فاطمہ بنت الحسینؑ ص ۸۰ سے لیکر ۱۱۶ تک کی طرف رجوع فرمائیں۔ جس میں ان معصومہ سے درجنوں روایات دسیوں کتابوں کے حوالہ جات سے نقل کی گئی ہیں اور شیخ جعفر نقدی کے بقول جو چیز ان معصومہ سلام اللہ علیہا کے کمال پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بابا اور پھوپھی حضرت زینب سلام اللہ علیہا سے روایت نقل کی ہے اور علماء شیعہ و سنی نے ان معصومہ سلام اللہ علیہا سے نقل ہونی والی روایات پر اعتماد کیا ہے، بلکہ اس معصومہ سے امام سجاد علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام نے بھی روایات نقل کی ہیں۔

اس محترمہ کی عظمت کے لئے بس یہی کافی ہے کہ تمام اصحاب سیر ومقاتل نے لکھا ہے امام حسینؑ نے آخری وقت وصیت نامہ آپ ہی کے سپرد کیا تھا، جو انہوں نے بعد میں امام زین العابدینؑ کی صحت کے بعد امام وقت کے حوالہ کیا۔

فاطمہ کبری سلام اللہ علیہا امانت دار وصیت امام حسین علیہ السلام

مختلف اسناد کے ساتھ امام جعفر صادقؑ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں:

دعا ابنته الکبری فاطمة بنت الحسینعليه السلام فدفع الیها کتاباً ملفوفاً ووصیته ظاهرة

امام حسین علیہ السلام نے میدان جنگ کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اپنی دختر فاطمہ کبری سلام اللہ علیہا کو بلایا اور وصیت نامہ انکے سپرد کیا۔

امام زین العابدینؑ کی تندرستی کے بعد وہ وصیت نامہ جناب فاطمہ نے امام سجاد علیہ السلام کے سپرد کر دیا۔ خدا کی قسم وہ وصیت نامہ ہم تک منتقل ہوا ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے کہا مولا اس وصیت نامہ میں کیا تھا؟

تو امام علیہ السلام نے جواب دیا:

اس میں بنی نوع آدم کی خلقت سے لیکر دنیا سے اٹھائے جانے تک کے سارے احکام تھے کہ جس کی احتیاج ہر بنی آدم کو ہوتی ہے یہاں تک اس میں ارش خدش تک کے احکام تھے۔

یہ وصیت نامہ مختلف اسناد والفاظ کیساتھ مندرجہ ذیل کتابوں میں موجود ہے:

۱۔ اصول کافی؛ ۲۔ بصائر الدرجات؛

۳۔ قمقام ذخار، فاطمہ کبری، ص ۴۵۰ تا ۴۵۳؛ ۴۔ ناسخ التواریخ، ج ۲، ص ۳۴۲؛

۵۔منتخب التواریخ باب خامس، ص۱۷۳؛ ۶۔جلاء العیون؛
۷۔فاطمہ بنت الحسینؑ، ہادی امینی، ص۱۳؛ ۸۔فاطمہ بنت الحسینؑ جعفر نقدی، ص۹۔

تاراجی خیام کے بعد حالتِ اسیری میں کوفہ وشام کے بازاروں میں برابر اپنی پھوپھی جناب زینب کبریٰؑ وجناب ام کلثومؑ علیہا السلام کے ساتھ خطبے دئے ہیں، اس معظمہ کو بیوگی کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ بعد از شہادت امام اسیری کے صدمات برداشت کرکے رہائی کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہیں بالآخر ۱۱۷ ہجری کو مدینہ منورہ میں دار فانی سے دار جاودان کی طرف رحلت فرمائی۔

فاطمہ صغریٰ کوفہ میں

فاطمہ صغریٰ کا اہل کوفہ سے خطاب

سید ابن طاؤس نے حضرت زید بن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے یہ خطبہ اپنے والد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

روی زید بن موسي قال حدثني ابي عن جدی علیهم السلام: قال:
خطبت فاطمة الصغری بعد ان وردت من کربلاء فقالت:...

خطبہ طولانی ہے صرف ان کتابوں کے حوالے پیش کیے جارہے ہیں جن میں جناب فاطمہ صغریٰ سلام اللہ علیہا کا یہ خطبہ موجود ہے:

۱۔ناسخ التواریخ، ج۶، جزء۳، ص۴۲۔ ۲۔تظلم الزہراء، ص۲۹۵۔
۳۔اسرار الشہادۃ، ص۴۷۹۔ ۴۔ریاض الشہادہ، جلد۲، ص۲۸۵۔
۵۔بحار الانوار، ج۴۵، ص۱۱۰۔ ۶۔معالم المدرستین، ج۳، ص۱۸۳۔
۷۔جلاء العیون، ج۲، ص۵۰۴۔ ۸۔الدمعۃ الساکبہ، ج۶، ص۳۸۔
۹۔مقتل حسینؑ، ص۳۱۳۔ ۱۰۔لہوف، ص۱۹۴۔
۱۱۔قمقام ذخار، ج۲، ص۵۲۰۔ ۱۲۔لوائج الاشجان، ص۲۰۲۔

۱۳۔ منتخب الطریحی، ص ۱۲۲۔ ۱۴۔ زینب کبریٰ، ص ۵۶۔
۱۵۔ تنقیح المقال، ج ۱، ص ۷۱ ۴۔ ۱۶۔ نفس المہموم۔
۱۷۔ مقتل حسینؑ، ج ۲، ص ۲۔ ۱۸۔ الکامل فی التاریخ۔
۱۹۔ تاریخ طبری۔ ۲۰۔ جمرۃ الانساب العرب، ص ۵۵۔
۲۱۔ مقاتل الطالبین۔ ۲۲۔ وفیات الاعیان، ج ۳، ص ۲۷۱۔
۲۳۔ جامع الرواہ، ج ۱، ص ۳۴۳۔ ۲۴۔ فاطمہ بنت الحسینؑ، ص ۲۶۔
۲۵۔ مثیر الاحزان۔

فاطمہ سلام اللہ علیہا کو صغریٰ اور کبریٰ کہنے کی وجہ

ہم نے بحمد اللہ معتبر حوالہ جات سے ثابت کیا ہے کہ امام مظلومؑ کی فاطمہ نام کی بیٹی ایک ہی تھی اور تمام ارباب سیر و مقاتل اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ فاطمہ صغریٰ کربلا میں موجود تھیں اور پھر اسیری کے مصائب بھی برداشت کئے اور اپنے بھائی امام زین العابدینؑ و پھوپھی زینبؑ و ام کلثومؑ کے شانہ بشانہ بازار کوفہ و شام میں خطبے دئے جس کی ایک جھلک آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

سوال

اگر سید الشہداء علیہ السلام کی دختر جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ایک ہے دو نہیں تو پھر صغریٰ و کبریٰ کی تفریق کی کیا ضرورت ہے؟

جواب

اس سوال کے جواب میں محققین نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اختصار کے پیش نظر ہم فقط علاّمہ محقق سید شاکر حسین امروہویؒ کی تحقیق پر اکتفاء کریں گے، اس سلسلہ میں جناب امروہوی فرماتے ہیں:

وہ عبارتیں قابل غور ہیں جن کی وجہ سے فاطمہ کبریٰ کے حضرتؑ کی اولاد میں ہونے کا توہم ہو سکتا ہے ان میں:

۱) عبارت مناقب ابن شہر آشوب ہے:

چنانچہ کتاب مذکور کے صفحہ ۱۳۰ احوال سید الساجدین میں کہتے ہیں:

ان الحسین علیہ السلام لماحضره الذی حضره دعا ابنة فاطمة الکبری فدفع الیها کتاباً ملفوفاً و وصیة ظاهرة الخبر.

حسین نے جس وقت وہ واقعہ پیش آیا جو پیش آیا یعنی شہادت تو آپ نے اپنی بیٹی فاطمہ کبریٰ کو سامنے طلب فرمایا اور ان کو ایک لکھا ہوا کاغذ لفافہ بند جو وصیت نامہ تھا سپرد کیا۔

۲) عبارت بحارالانوار۔ ۳) عبارت ناسخ التواریخ ان میں بھی "دعا ابنة فاطمة الکبری" لکھا ہے ان عبارتوں میں لفظ فاطمہ موصوف اور کبریٰ اس کی صفت ہے، حاصل مراد یہ ہے کہ حضرت سید الشہداءؑ نے اپنی شہادت کے قریب، اپنی صاحبزادی فاطمہ کبریٰ کو طلب کیا اور صحیفہء ملفوفہ اور وصیت کو ان کے سپرد فرمایا اور جب سید الساجدین کو صحت حاصل ہوئی تو فاطمہ کبریٰ نے اس امانت کو حضرت کے حوالہ کردیا۔ اس سے جناب سید الشہداءؑ کی اولاد میں فاطمہ کبریٰ کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن در حقیقت لفظ کبریٰ جو ان عبارتوں میں مذکور ہے صفت فاطمہ کی نہیں بلکہ لفظ ابنتہ کی صفت ہے معنی یہ ہیں کہ حضرت نے اپنی بڑی صاحبزادی فاطمہ کو طلب کیا اور یہ امر بالکل درست اور صحیح ہے اس لئے کہ فاطمہ کا سکینہ سے بڑا ہونا قابل انکار نہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ان عبارتوں میں لفظ کبریٰ بعد لفظ فاطمہ اشتباہاً بسبب غلطی کاتب واقع ہو گیا ہے والاّ دراصل اس کے بعد لفظ ابنتہ اور قبل لفظ فاطمہ ہونا چاہئے کیونکہ ان عبارات میں یہ حدیث مذکور ہے اس کو اکابر علماء محدثین نے اسی طرح روایت کیا ہے کہ اس میں لفظ کبریٰ بعد لفظ ابنتہ واقع ہے چنانچہ شیخ اجل

ابوجعفر محمد بن حسن القمی(جو امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں شمار کئے جاتے ہیں)اپنی کتاب "بصائر الدرجات" میں لکھتے ہیں:

حدثنا محمد بن احمد عن محمد بن الحسینعليه السلام عن ابن سنان عن ابي الجارود عن ابي جعفر قال ان الحسینعليه السلام لما حضره دعا ابنة الكبرى فاطمة فدفع اليها كتاباً ملفوفاً ووصية ظاهرة ووصية باطنة وكان علي ابن الحسینعليه السلام مبطوناً لايرون الا انه لما به فدفعت فاطمة الكتاب الي علي ابن الحسینعليه السلام.

ثقۃ الاسلام ابو جعفر محمد ابن یعقوب کلینی کتاب کافی میں دوسرے راویوں کی اسناد سے اسی حدیث کو نقل کرتے ہوئے:

دعا ابنة الكبرى فاطمة بنت الحسینعليه السلام فدفع اليها كتاباً ملفوفاً

تحریر فرماتے ہیں۔

علی ابن الحسین المسعودی نے کتاب اثبات الوصیۃ میں اس حدیث کو اسی طرح روایت کیاہے ،علیٰ ہذاالقیاس علامہ مجلسی بحارالانوار میں اورآقائے دربندی اکسیر العبادات میں اسی طرح ناقل ہوئے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ باعتبار عمر فاطمہ بڑی تھیں یاسکینہ تو گو اس امر کا تصفیہ عبارات کتب مندرجہ صدر ہی سے ہوجاتاہے تاہم مورخین نے صاف الفاظ میں اس کی صراحت کردی ہے چنانچہ تاریخ رسل وملوک ابو جعفر محمد ابن جریر طبری کی جلد آٹھ صفحہ ۳۸۱میں مرقوم ہے:

فقالت فاطمة بنت الحسینعليه السلام وكانت اكبر من سكينه

یہی عبارت تاریخ کامل ابن اثیر جزری مطبوعہ مصر جلد چار صفحہ ۳۵میں اور فصول المہمہ ابن صباغ مالکی مطبوعہ ایران صفحہ ۲۰۵اور نورالابصار سید مومن شبلنجی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲۶میں موجودہے۔

لہٰذا یہ سمجھنا کہ ان کو فاطمہ کبریٰ کہتے تھے صحیح نہیں ہو سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی جدّہ ماجدہ جناب فاطمہ کبریٰ کے ہم نام ہونے کی وجہ سے بنام فاطمہ صغریٰ مشہور تھیں ، چنانچہ علاّمہ طبرسی نے احتجاج میں سید ابن طاؤس نے لہوف میں فخر الدین طریحی نے منتخب میں علاّمہ مجلسی نے بحار میں اور علاّمہ عبداللہ نے مقتل عوالم میں علی بن عیسیٰ نے کشف الغمہ میں نورالدین سمہودی نے جواہر العقد میں علاّمہ مزی نے تہذیب الکمال میں ولی الدین خطیب نے رجال مشکوٰۃ میں "فاطمۃ الصغریٰ بنت الحسینؑ" ہی تحریر کیا ہے ، جب حضرتؑ کی اولاد دختری میں صرف ایک ہی فاطمہ ہیں تو وہی فاطمہ کبریٰ اور وہی فاطمہ صغریٰ کیسے ہو سکتی ہیں بلکہ ان کا حسب صراحت علماء مذکور الصدر فاطمہ صغریٰ ہونا ہر طرح ثابت ہوتا ہے ، بحارالانوار جلد عاشر صفحہ ۳۵، کشف الغمہ صفحہ ۱۷۳ صحیح ترمذی مطبوعہ دہلی صفحہ ۶۰، مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ دہلی کہ ان سب میں جناب سیدۃ النساء سے حدیث نبویؐ کو فاطمہ بنت الحسینؑ کی زبانی بیان کرتے ہوئے:

«عن فاطمة بنت الحسين عن فاطمة الكبرى» **تحریر کیا ہے ، اسی طرح کتب الدلائل محمد بن جریر طبری امامی کی عبارت میں لفظ** «عن شبيه بن لغامه عن فاطمة الصغرىٰ عن فاطمة» **اور جواہر العقد میں نورالدین سمہودی کی عبارت میں** «و رواية فاطمة الصغرا من الكبرىٰ وان كانت رسلته ابو الحجاج نسياتى ماتقوى به» **اور تہذیب الکمال مزی کی عبارت میں جملہ** «روى منها انس بن مالک الى ان قال وفاطمة الصغرىٰ بنت الحسينؑ بن على بن ابى طالب مرسلاً» **اور اسماء الرجال مشکوٰۃ کی عبارت میں عنوان** «فاطمة الصغرى هى فاطمة الصغرى بنت الحسينؑ» **کا مطلب اس پر دلالت کرنا بالکل صاف اور واضح ہے۔**[1]

[1] مجاہد اعظم ص۳۰۶ تا ۳۰۹۔

کسی حد تک مسئلہ روشن ہو چکا ہے، بحث اختصار کے دامن سے بہت آگے جا چکی ہے لہذا اسی جگہ پر ہم اپنی تحقیق کو روکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ فاطمہ صغری کا مدینہ میں رہ جانے ے رد میں علماء اعلام کے اقوال اور انکی تصریحات اور باقی جوابات کی تائیدات اصل کتاب کی طباعت کے ساتھ پیش کریں گے ان شاءاللہ۔ سر دست شائقین تحقیق آیۃاللہ سید ناصر حسین ناصر الملت کے فرمان اور کتاب مجاہد اعظم ص ۲۴۴ واکلیل المصائب تنکبانی، سعادت الدارین نجفی وغیرہ کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ شہید محراب آیۃاللہ سید محمد علی قاضی طباطبائی تبریزی کی کتاب تحقیق اول اربعین کی اس عبارت کو غور سے پڑھیں۔

اما فاطمه صغری در مدینه مانده باشد در کتب امامیه به نظر نرسیده یعنی اصل ناقل وجود او و ماندنش در مدینه از کتب سنی‌ها شهرت یافته و به بعضی کتب امامیه از آنها نقل شده و در اغلب کتب معتبره سنی‌ها هم نقل نشده است.[1]

الاحقر الفانی

طاہر عباس اعوان ولد غلام عباس اعوان

قم۔ایران

۲ محرالحرام ۱۴۳۲ بروز اتوار ھ۔ق

---

[1] تحقیق اول اربعین ص ۶۸۵

تالیف: آیت اللہ سید حاجی آل محمد صاحبؒ
ناشر: مطبع ریاضی امروہہ
تاریخ: ۱۳۲۳ھ۔ق

- تمثال مبارک مؤلف کتاب "غازہ شاہد"
- مؤلف کے بارے میں
- کتاب کے بارے میں
- متن کتاب
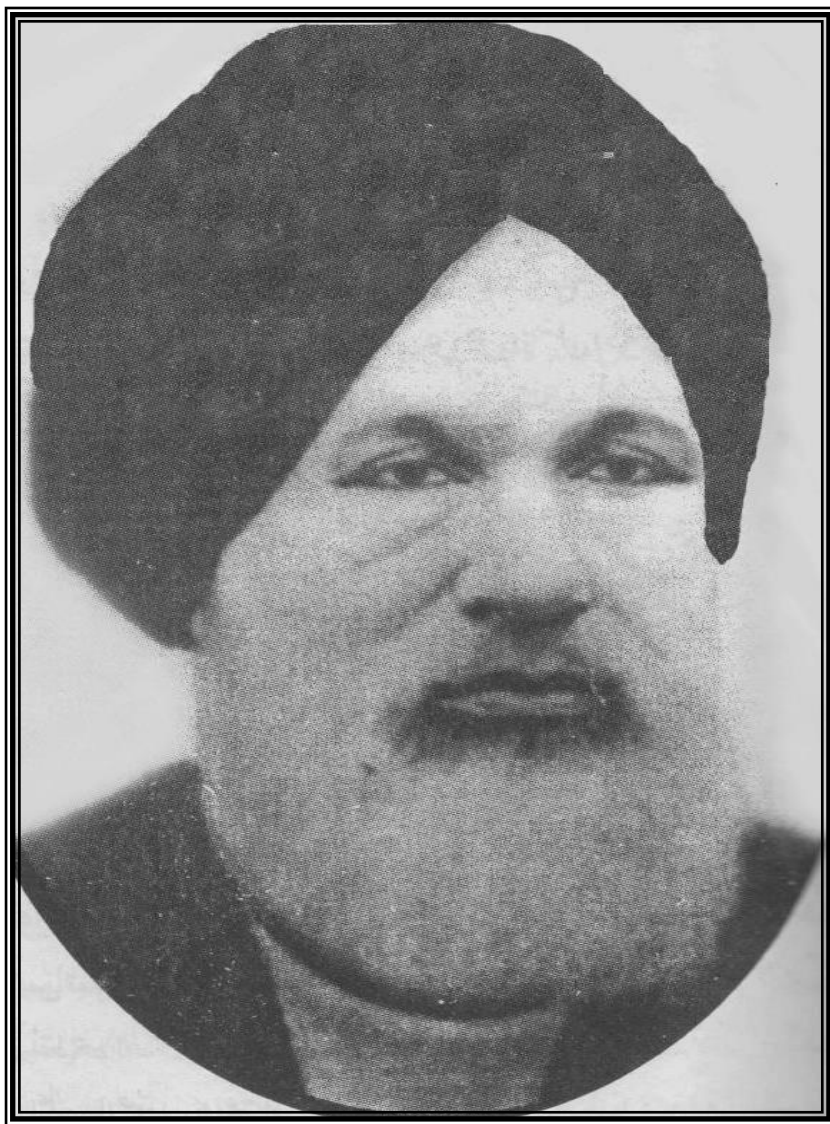
تمثال مبارک مؤلف کتاب ”غازہ شاہد“

از قلم: طاہر عباس اعوان

مؤلف کے بارے میں

جناب حاجی آل محمد بن حاجی اصغر حسین صاحب امروہوی (۹ شوال ۱۲۲۴۔۱۳۲۵ھ۔ق)

۹ شوال ۱۲۲۴ھ کو آپ امروہہ میں پیدا ہوئے، کتب صرف و نحو و منطق و طب و فقہ امروہہ میں اور پھر مجتہدین لکھنو سے لکھنو میں پڑھیں، تکمیل علوم دین کے لیے عراق کا سفر کیا اور علمائے عراق سے کتب معقولات و منقولات پڑھنے کے بعد وہ مقام پایا کہ اپنے امثال و اقران میں ممتاز ہو گئے ۱۲۹۸ھ میں مع اپنے والد ماجد کے زیارات عتبات عراق سے مشرف ہوئے اور ۱۳۰۰ھ میں حج و زیارات مدینہ سے مشرف ہوئے اور ۱۳۴۴ھ میں دوسرا سفر عراق کا اپنے فرزند سید آل یسین و زوجہ کے ساتھ کیا، علم عروض میں مہارت کے علاوہ آپ شاعر بھی تھے۔

علمی صلاحیتیں

آپ نے قصائد عربیہ، فارسیہ، اردو، و مسدس، سلام، و مراثی یادگار چھوڑے ہیں، عبقات الانوار پر آپ نے ایسی تقریظ لکھی کہ نصف فقرات عربی اور نصف فارسی تھے۔

جناب فردوس مآب میر حامد حسین نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ این تقریظ لائق تقریظ است۔ ادیب ایسے ہیں کہ ایک خط آپ نے جناب آیۃ اللہ شیخ مازندرانی کو تحریر فرمایا ہے کہ جو غیر منقوطہ ہے اور ایک خطبہ میں الف نہیں آیا اس خط کے جواب میں آقای مازندرانی نے تحریر فرمایا کہ« ماهذه من بشران هذا من ملك كريم من سلامة طه و حم»، پھر لکھا ہے کہ «افكرني في صنيع فصاحته و بديع بلاغته»

بقول آقای نوگانوی، امروہہ میں آپ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ کے ممبر بھی رہے اور نواب لفٹنٹ گورنر جنرل کے دربار میں شریک ہوئے حکام وقت اور نواب لفٹنٹ گورنر کی چیٹھیاں آپ کے پاس موجود ہیں جو ڈیپوٹیشن سادات امروہہ کا جناب سرکار نواب صاحب رام پور مرحوم مغفور کی خدمت میں گیا تھا تو آپ بھی اس میں شریک تھے اور آپ کی تصانیف سے یہ کتابیں ہیں:

وفات

آپ نے ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں رحلت فرمائی اور خالق حقیقی سے جا ملے۔

آثار

۱. سبحۃ الجواہر (در حال علماء)؛
۲. وطعن النصول در قصہ قتل عثمان؛
۳. ودافع الشکوک والاوہام در بحث امامۃ؛
۴. ومثنوی نان خشک فارسی وعربی؛
۵. وحلیۃ الاولیاء در بحث متعۃ النساء؛
۶. والالقام الاحجار فی افواہ الاشرار رد اعتراض تعزیت امام مظلوم؛
۷. رسالہ بیان حاسم رد نفی عروسی جناب قاسمؑ؛
۸. وزاویہ حاویہ در مطاعن معاویہ اس کا نام کجج حاویہ بھی ہے؛
۹. گلزار جنت موسوم بتصویر کربلا مشتمل بر حالات تاریخی کربلا و سرور الہموم فی جواز البکاء علی الحسینؑ المظلوم؛
۱۰. وورشاہوار (دراحوال رسول مختار)؛
۱۱. ومثنوی سبعہ سیارہ در معجزات جناب امیر؛
۱۲. وقرضاب تفسیر بعض آیات قرآن؛
۱۳. ونتائج فکریہ درابطال خلافت بکریہ؛
۱۴. ودستور الخیول در علاج اسپان؛
۱۵. وغضب البتول علی الاصحاب النبی العدول؛
۱۶. درۃ البیضاء فی اثبات حق فاطمۃ الزہراء اردو؛
۱۷. غازہ شاہد در نفی عروسی جناب قاسم؛
۱۸. اللہ المضیٰ عربی در اصول دین مطبوعہ۔

اس پر علمائے عراق وہند کی تقریظات ہیں جو سب غیر مطبوعہ ہیں ان تقریظاتات کے متعلق صاحب تذکرہ بی بہا لکھتے ہیں، اور اکثر جناب مصنف نے نحیف کو دکھلائی ہیں۔[1]

---

[1] تذکرہ بی بہا، ص ۸۷، چاپ جدید؛ تذکرہ علماء امروہہ، ص ۱۳۱؛ مطلع انوار ص ۴۰۔

متن کتاب

حمد اس خدا کی مقدس ذات کو زیبا ہے، جس نے ہر شئے کو پیدا کیا ہے اور نعت اس پیغمبر ﷺ آخر الزمان کے لایق ہے جو سب پیغمبر وں پر رتبہ میں فایق ہے، اسم پاک اون کا محمد ﷺ ہے اور دوسرا احمد ہے اور منقبت حیدر کرار وصی احمد مختار سے ایمان کی جلا ہے۔ انکے مداح کو بہشت میں گھر ملا ہے۔ اما بعد ہیچمدان حقیر ترین زائر ان ضعیف ترین حاجیان سید آل محمد ابن زبدۃ الحاج عمدۃ الزوار سید اصغر حسین سلمہ اللہ المنان یہ عرض کرتا ہے، کہ ان روزوں میں بسبب علم کی ترقی کے میرے دل نے یہ چاہا کہ ایک تاریخ ارض مقدس کربلا کی لکھوں۔ جب اس کو لکھنا شروع کیا۔

تو اس میں تاریخی واقعات کے لحاظ سے حضرت قاسم پسر امام حسن کی دامادی کا حال بضمن عدم صحت واقعہ مختصراً لکھا۔ در صورت اسکی تحقیق نہ ہونے کہ اس فعل کا معصوم پر افترا اور بہتان ہے جو بہت بڑا گناہ ہے اور اس وضعی واقعہ کا رواج اور شیوع اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ عام طور سے مرثیوں کو کتابوں میں لکھا جاتا ہے اور شہر بشہر مہندیان اٹھائی جاتی ہیں۔ اور ممبر وں پر بیان کیا جاتا ہے۔ بعض محبان واثق اور دوستان صادق کی یہ استدعا ہے کہ کسی قدر بسط سے حال جدا اس رسالہ تاریخی سے لکھ کر چھاپ کرایا جاے۔ بنابر ین، ان اوراق میں جدا لکھ دیا اور رسالہ کا تاریخی نام (غازہ شاہد) رکھا۔ وباللہ التوفیق وبہ نستعین وانا اشرع المقصود بعون اللہ الودود۔

واقعہ نینوا اور سانحہ کربلا میں باتفاق علماء مورخین اصدقا، جناب قاسم اور حسن مثنی پسر ان حضرت امام حسن سبز قبا شریک مصائب امام حسین سید الشہداء ضرور تھے۔ نکاح حضرت قاسم جناب فاطمہ کبری امام حسین علیہ السلام کی دختر سے ثابت نہیں ہوتا۔ صاحب روضہ الشہداء نے یہ دامادی کی روایت بلاسند جس کو شتر بی مہار کہتے ہیں، نہیں معلوم کس اعتماد پر لکھ دی، جو رفتہ رفتہ ذاکرون اور واقعہ نگاروں میں مشہور ہو گئی

، کہ جناب امام حسین نے اس بی اطمینانی کی حالت میں حضرت قاسم سے اپنی بیٹی کا عقد حسب وصیت جناب امام حسن علیہ السلام روز عاشورہ وقت شہادت حضرت قاسم کر دیا اور دس گیارہ سال کی وصیت کو اطمینان کے وقت چھوڑ کر اس آفت کے وقت پر موقوف رکھا اور کبھی مدینہ منورہ میں اس پر عمل نہ کیا۔ اس حیرت انگیز واقعہ کو روضۃ الشہداء سے ہم آیندہ نقل کریں گے اور دکھلائیں گے کہ اس روایت سے ہی اس واقعہ کی تکذیب ہوتی ہے۔ میں نے جو اس واقعہ کا حال تلاش کیا، تو یہ امر ظاہر ہوا کہ ہمارے علماء کرام کی قدیمی کتابوں خصوصاً کتب احادیث میں کہیں اسکا پتہ نہیں چلتا۔

ارشاد شیخ مفید اور مثیر الاحزان ابن نما اور لہوف ابن طاؤس اور کشف الغمہ علی عیسی اربلی اور بحار الانوار علامہ مجلسی میں جو دیکھا تو ان کتابوں میں کچھ بھی اسکا اثر نہیں، ہر چند امالی شیخ صدوق نسب اور خاص فضائل کی کتاب نہیں مگر اس میں واقعہ کربلا سلسلہ وار لکھا ہے۔ اور ناقلین اسی واقعہ میں لکھتے ہیں مگر اس میں بھی نھیں پایا۔ جناب ملا باقر مجلسی جلاء العیون میں انکے عقد کے بارے میں فرماتے ہیں ''وقصہ دامادی او در کتب معتبرۃ بنظر این حقیر نرسیدہ است'' اور منافع کثیر بیاض مشرف علیخان جس میں فتوی علماء کرام کے ہیں اس میں جواب سلطان العلماء طاب ثراہ کا بجواب ایک سوال کے اس طرح لکھا ہے۔

سوال:

مراسم حنا بندی و آتشبازی و تفنگ‌ها سردادن درست است یا نه؟

جواب:

جناب اخوند رحمه الله نوشته‌اند که: «روایت دامادی حضرت قاسم علیه السلام در کتب معتمده بنظر نرسیده. (والله یعلم)

پھر دوسری جگہ اسی میں ہی سوال حال صحت عقد فاطمہ کبری دختر جناب امام حسین علیہ السلام با حضرت قاسم بن الحسن علیہ السلام در واقعہ کربلا یا قبل ازین چیست جواب این امور مفصلا وارد نگشتہ، یہ

جواب بھی جناب سلطان العماء طاب ثراہ کا ہے۔ اور جناب مولانا محمد حسن قزوینی "ریاض الشہادت" میں فرماتے ہیں:

«علماء شیعه در کتب مقتل و مورخین در تواریخ مختلف نقل کرده‌اند،و حکایت دامادی او را نیز فاضل مجلسی مذکور نساخته،و فرمود که حدیث آن بنظر نرسیده اما شیخ فخر الدین طریحی که از جمله علماء امامیه است و مرد بزرگی است در فخری نقل و مستند بروایت نموده. و ملا حسین کاشفی نیز در روضه الشهداء از کتب مقتل‌ها و تواریخ ایراد نمود.»

محمد بن سلیمان تنکابنی قصص العلماء میں تحریر فرماتے ہیں کہ فخر الدین طریح نجفی مصیبت کے اخبار مراسیل اکثر نقل کرتے ہیں۔

پس انکا نقل کرنا بسبب مرسل روایت نقل کرنے کے سند نہیں ہو سکتا۔ اور ملا مہدی نراقی نے جو محرق القلوب میں اس روایت کو دامادی کی نقل کیا ہے، اسکا حال یہ ہے کہ وہ مطلق ایراد ہے، کسی روایت معتبر سے بشروط مستند نہیں کیا علاوہ برین قصص العلماء میں ہی کہ محرق القلوب میں ایسی خبریں ہیں کہ انکا اعتبار نہیں اور اخبار ضعاف بلکہ مظنون الکذب ہیں۔ اور فاضل تنکابنی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اسرار الشہادۃ آقا دربندی کی بعض مقامات میں بے اعتباری کی رو سے ہم مرتبہ محرق القلوب کے ہے۔

چنانچہ فاضل نراقی کے ذکر میں جو محرق القلوب کا ذکر کیا ہے، اس میں لکھا ہے:

«لیکن بسیاری از اخبار آن کتاب را اعتمادی نیست و از اخبار ضعاف بلکه مظنون الکذب و یا مقطوع الکذب است و این فقیر را حواشی برهامش آن کتابست.»

اور پھر بعد چار سطر کے لکھا ہے:

و کتاب آخوند ملا در بندی در بعضی از مقالات تالی محرق القلوب است.

پس ایسی کتاب کی روایتوں کا کیا اعتبار ہے۔ اب رہی روضۃ الشہداء تو وہ مخالف کی کتاب ہے ہمارے کسی شیعہ مجتہد یا عالم کی نہیں اور اصل یہ ہے کہ اسی کتاب سے یہ بلا نکل کھڑی ہوئی مقتل کی اور مصایب کی کتابوں اور مرثیوں میں اس روایت کو معین بکا سمجھ کر لوگوں نے نقل کرنا شروع کر دیا۔ اب جہاں یہ روایت پائی جاتی ہے وہ کتابیں مقتل کی اور مصائب کی ہیں، اور طرفہ یہ ہے کہ کوئی ناقل کسی معتبر راوی سے سلسلہ وار مستند نہیں کرتا محض ایراد پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ احتیاط مصائب کی کتابوں والوں کی اسی سبب سے ہے، کہ یہ روایت حضرت قاسم کی دامادی کی کسی حدیث اور معتبر کتاب میں نہیں اگر ہے تو غیر معتبر میں ہے جیسا کہ ملای مجلسی کی تحریر سے ظاہر ہے۔

یعنی در کتب معتبرہ بنظر فقیر نرسیدہ صاف اس سے ظاہر ہے کہ جس کتاب میں میری نظر سے اگر گذر ابھی ہے تو وہ معتبر کتاب نہیں، کسی معتبر کتاب میں میں نے نہیں دیکھا اور بیاض فخری اور روضۃ الشہداء میں جو یہ روایت ہے اب ہم اسکو اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ اس روایت سے ہی کذب اسکا عیاں ہے فاضل تنکابنی (قزوینی) ریاض الشہادت میں بیاض فخری اور روضۃ الشہداء کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں بہمان طریق کہ در ان دو کتاب بنظر رسیدہ نقل می شود پھر کسی قدر فرق سے لکھا ہے:

القصه قاسم اجازه حرب نیافت و برادران سید الشهداء تدارک حرب می‌دیدند قاسم به خیمه درآمد و سر به زانوی غم نهاده به نشست

پھر دو سطر کے فرق سے لکھا ہے:

ناگاه بخاطرش رسید که پدرش حضرت امام حسن علیه السلام تعویذی بر بازوی او بسته و باو فرموده بود که ای فرزند دلبند هر وقتی از اوقات که الم بیحد و غایت و مصیبت بی نهایت بتو روی دهد این تعویذ را باز کن و بخوان و بدانچه در آن نوشته‌اند عمل نمای قاسم گفت بخدا قسم تا بوده‌ام هرگز غم و اندوهی چنین بمن رخ نداده و بدین قسم گره در کار من نیفتاد،و بعد از ین نیز اگر زنده بمانم چنین اندوهی از برای من اتفاق نیفتد،امروز وقت آنست که تعویذ را باز

کنم،و از دیدن آن رفع اندوه خود نمایم،پس آن تعویذ را از بازوی خود کشود و چون ملاحظه نمود دید که پدرش امام حسنؑ بخط مبارک خود نوشته است که ای قاسم ای نور دیده وصیت می‌کنم ترا که چون برادرم یعنی عمت امام حسینؑ به بینی در کربلا بدست شامیان پردغا و کوفیان بیوفا گرفتار شده از نهار که سرخود در قدم وی بیندازی،و جان خود را از برای وی در بازی و هر چند ترا از مصاف رفتن باز دارد،از و نه پذیری و چندان اصرار و مبالغه کنی،و در الحاح و ابرام بیفزایئ که جان فدای عمت نمای،که مفتاح سعادت و وسیله اقبال و کرامت خواهد بود،پس قاسم بر مضمون نامه مطلع شد و از شادی ندانست که چه کند بتعجیل از جای جست و آن نامه که رقم شهادت آن معصوم بود بدست عم خود داد،چون شاه شهیدان آن مکتوب را دید آه حسرت از دل پر درد بر کشید،و زار زار گریست و اشک حسرت از دیدگان بارید و گفت ای جان عم این وصیتی است که برادرم بتو کرده است درباره من و تو می‌خواهی که بوصیت او عمل نمای مرا نیز درباره تو وصیتی نموده می‌خواهم آنرا بجای آورم و وصیت او بمن آنست که فاطمه دختر من که پدرت او را نامزد تو کرده بود بعقد تو در آورم و بتو دهم،بیاتا ساعتی بخیمه رویم و در تمشیت این مهم کوشیم،پس دست قاسم را گرفت و او را باند رون خیمه برد،و برادر خود عباس را طلبید و خطبه در نهایت فصاحت و بلاغت او فرمود و فاطمه را بمهر شهادت بقاسم عقد کرد. پس بزینب خاتون فرمود ای خواهر جامه‌های برادرم امام حسنؑ را حاضر کن و چون زینب آنها را حاضر نمود مقرر فرمود تا آنکه جامه فاخره بقاسم پوشانید و آن حضرت بدست مبارک خود دراعه امام حسنؑ را در او پوشانید و عمامه آنحضرت را بر سر او گذارد. پس زنان حرم فاطمه را زینت نمودند. پس آنحضرت دست فاطمه را بدست قاسم داد و گفت اینست امانتی که پدرت من سپرده بود.

تمام تر اس روایت سے اہل ہوش پر ظاہر ہے کہ اس تعویذ کا دکھانا امام حسین کو حضرت قاسم کا روز عاشور میں تھا۔ بعد شہید ہو جانے جملہ انصار اور اولاد عقیل اور اولاد جعفر طیار کے اور منجملہ اولاد عقیل کے دو بیٹے حضرت مسلم کے بہانجے حضرت عباس کے جو بطن سے رقیہ دختر امیر المومنین کے تھے شہید ہو چکے تھے اور دو بیٹے حضرت عبد اللہ بن جعفر طیار کے بھانجے حضرت امام حسینؑ کے بطن مطہر حضرت زینب کے تھے، بعد انکی وہ بھی شہید ہو چکے تھے اور بموجب اس روایت کے عقد دن میں ہونا قرار پایا ہے نہ رات میں صاحب ماتین نے باوجود مصلحت بیان کرنے کے اسے پسند نہیں کیا، کہ وصیت حضرت امام حسن کی اس تعویذ میں تہی یا وہ تعویذرات کو کہولا گیا چنانچہ کہاہے۔

«وما اشتهر بين تلک الوصية ايضا كانت مكتوبة فى عودة حلها الاسم تلک الليلة» فعندى فيه نظر خلاصہ اور یہ روایت جو عام لوگوں میں مشہور ہے کہ داماد بنانے کی وصیت بھی امام حسین کی نسبت اسی تعویذ میں درج تہی جسکو حضرت قاسم نے اسی شب کو کہولا ہے مجھے اس میں کلام ہے۔ اب حقیر کہتا ہے کہ یہ تعویذ تورخصت نہ ملنے کے بعد کہولا گیا تھا شب کیسی اور وہ لڑای کا وقت تھا جیسا اصل روایت سے جو ہم نے ریاض الشہادت سے قبل ازین نقل کی ہے عیان ہے، اور یہ یہی اس روایت سے ہوید اہے کہ جب حضرت قاسم نے جناب امام حسین کو وہ تعویذ دیا تو آپ خیمہ میں لیگیے اور اپنے بھائی عباس اور عون کو وہان بلایا اور خطبہ پڑہا اور قاسم کی شہادت کے مہر باندہ کر فاطمہ کبری سے عقد کر دیا اور جناب زینب خاتون سے حضرت امام حسن کا لباس منگوایا اور ذرہ مع لباس حضرت امام حسن کا حضرت قاسم کو پہنایی اور عمامہ انکا سر پر حضرت قاسم کے باندھا اور عورتوں نے حضرت فاطمہ کبری کی زینت کی کاتب الحروف اس روایت کے جھٹلانے کے لیے چند وجہیں وجیہ پیش کرتا ہے۔

پہلی یہ کہ یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں نہیں جیسا کہ بعض جواب میں سلطان العلماء کے ہے، و نیز ملای مجلسی کے ارشاد اور تحریر سے اور صاحب ریاض الشہادت کے ظاہر ہے۔

دوسری کتابوں میں علماء کا نہ دیکھنا جیسا کہ گذرا۔

تیسری بے ضرورت کہ حضرت قاسم اور فاطمہ کبری دونوں خورد سال بچے تھے اور حضرت قاسم اسی وقت مرنے کو جارہے ہیں اور حضرت امام حسین شب میں سب کی شہادت کی خبر دے چکے ہیں۔

چوتھی یہ قیامت توبپاہورہی ہے کہ خاندان والوں کی لاش پر لاش چلی آتی ہے حضرت رقیہ اپنے بیٹوں کو رورہی ہیں حضرت زینب اپنے صاحبزادوں کو پیٹ رہی ہیں سارا خاندان اور انصار قتل ہو چکا ہے۔ باقی کی باری مونہہ پر کھڑی ہے بڑی سخت پریشانی کا وقت ہے اور وہاں اطمینان سے کپڑے امام حسن کے مانگے جارہے ہیں ذرہ اور لباس پہنایا جارہا ہے خطبہ کیسے اطمینان سے پڑھا جاتا ہے، بھلا یہ کونسا وقت نکاح کا تھا۔

پانچویں یہ کہ قبل ازین کفار کے حملہ پر حملہ تھے خیموں کے جلانے کو چڑھے چلے آتے تھے، حضرت کے انصار انکو روکتے تھے خندق میں آگ جلا کر خمیوں کی حفاظت بمشکل کی تھی باوجودیکہ مخالفین مسلمان تھے اور نماز کی مہلت نہ دیتے تھے بڑی مشکل سے دو اصحاب کو اپنے روبرو کھڑا کر کے امام حسین نے نماز خوف بجماعت پڑھی وہ دو صحابی ایک زہیر قین دوسرے سعد بن عبد اللہ تھے۔

یہاں تک کفار چڑھ آنے اور لڑنے میں کوشش کرتے تھے کہ امام حسین کے جو سعد بن عبد اللہ آگے کھڑے ہوے تھے کفار نے انکو شہید کر دیا اس عقد کے واسطے انہوں نے کیسے مہلت دیدی کہ خطبہ بھی پڑھ لو، صیغہ نکاح بھی پڑھو، کپڑے پہناو، ذرہ بھی پہناو، ودلہن کی زینت بھی کرلو، باطمینان خیمہ میں جابیٹھو، بھلا اس وقت کفار کا روکنے والا کون؟ نماز کے وقت تو کچھ انصار اور سب اہل خاندان تھے اس وقت فقط حضرت عباس اور انکے بھائی اور حضرت علی اکبر جو در حقیقت علی اوسط ہیں۔ یہی تھے۔ اور یہ سب باہر نہیں تھے بلکہ سب خیمہ میں تھے۔ بیٹے حضرت زینب کے تو دو بھانجے اور خصوصا دو بیٹے اور عزیز اور بھائی کے انصار قتل ہو چکے لاشیں خیمہ میں آگییں وہ بیٹوں کا رونا چھوڑ کر لباس حضرت امام حسن کا لا رہی ہیں اسکو تو کوئی بچہ بھی سمجھ ہی نہ پایگا۔

ساتویں حضرت فاطمہ کبری کا سنگہار عورتوں کے ہاتھ سے اس آفت اور بے اطمینانی کے وقت اپنے عزیزوں کی لاشیں اور انکا چھوڑ کر ہونا۔

آٹھویں ایسے ایسے قریب عزیزوں کے وقت فوراً اس عقد کا ہونا بھلا کیسے مانا جاوے۔

نویں بے اطمینانی کے وقت اس نکاح کا ہونا۔

دسویں جو اس روایت میں ہے کہ حضرت امام حسین نے لباس حضرت امام حسن اور ذرہ اس وقت حضرت قاسم کو پہنایی یہ بات کسی کی عقل کب تجویز کریگی کہ حضرت قاسم اس وقت بچے تھے ریاض الشہادت میں ہے قاسم بن الحسن کہ در آنوقت بحد تکلیف نرسیدہ بود دوازدہ یا سیز دہ سال از عمر شریفش نگذشتہ بود اور ملاے مجلسی کی جلاء العیون میں ہے:

«قاسم پسر حضرت امام حسن علیہ السلام که چهره مبارکش مانند آفتاب تابان بود و بحد بلوغ نرسیده بود نزد عم بزگوار خود آمد و رخصت جهاد طلبید»

جبکہ ایسے کم سن تھے انکے جسم میں حضرت امام حسن کی پوشاک کیسے آگیی ایک بزرگوار نے فرمایا کہ اس وقت عورتوں نے سویی لیکر ٹانکدی ہوگی میں کہتاہوں لوہا اور فولاد کی ذرہ کو امام حسن کی کیا کیا ہو گا۔

اور سب سے بڑھ کر تو گیارہویں یہ حجت ہے کہ حضرت فاطمہ کبری کا نکاح مدینہ میں حضرت حسن مثنی سے ہو چکا تھا پھر دوسرا نکاح حیات میں شوہر کی کیسا اور حسن مثنی کربلا میں موجود تھے چنانچہ سیر الائمہ میں مذکور ہوا ہے کہ علمای انساب نے حضرت امام حسن کے بیٹے سترہ عدد لکھے ہیں اور صاحب ناسخ التواریخ نے بیس عدد کو وارد کیا ہے۔ انکی تفصیل یہ ہے اول زید دوسرے حسن مثنی تیسرے حسین اثرم چوتھے علی اکبر پانچویں علی اصغر چھٹے جعفر ساتویں عبد اللہ اکبر آٹھویں عبد اللہ اصغر نویں قاسم دسویں عبد الرحمن گیارہویں احمد بارہویں اسمعیل تیرویں یعقوب چودھویں عقیل پندرہویں محمد اکبر سولویں محمد اصغر سترہویں حمزہ آٹھارہویں ابو بکر اونیسویں عمر بیسویں طلحہ اور ان بیس عدد میں سے سات تن عاشورہ کے دن کربلا میں سید الشہداء علیہ السلام کے ساتھ موجود تھے اول حسن مثنی دوسرے زید جس زمانہ میں مدینہ میں تھے تو انکا یہ خیال تھا کہ کسی بیٹی سے جناب امام حسین علیہ السلام کی نکاح کروں جب خبر حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہونچی تو حضرت حسن مثنی علیہ السلام کو اپنے پاس طلب فرمایا اور ارشاد کیا یہ دونوں بیٹیاں میری فاطمہ اور سکینہ ہیں جس سے چاہو تم اپنا نکاح کر لو حسن مثنی علیہ السلام بسبب شرم کے کچھ نہ بولے

اس وقت جناب سید الشہداء نے فرمایا کہ اپنی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا کا عقد تمہارے ساتھ کیا وہ میری ماں فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے صورت میں مشابہ ہے۔

خلاصہ حسن مثنی علیہ السلام روز عاشور سید الشہداء علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے اور عمر سعد کے لشکر سے جہاد کرتے تھے اور بہت زخمی ہو گئے اور کشتوں میں گر گئے جس وقت کہ سب شہیدوں کے سر تن سے جدا کئے جاتے تھے اس وقت حسن مثنی میں کچھ حیات کی رمق باقی تھی اسمار بن خارجہ جسکی کنیت ابو حسان تھی ان سے انکی شفاعت کی اور یہ شفاعت اس سبب سے تھی کہ حسن مثنی کی ماں خولہ منظور کی بیٹی فزارہ کے قبیلہ کی تھیں جب اس شفاعت کو عمر ابن سعد نے سنا تو کہا کہ ابو حسان کے بھانجے کا سر کاٹنا نہ چاہیے، حسن مثنی اس کے بھانجے کو اسے ہی دیدو پس ابو حسان حضرت حسن مثنی کو اپنے ساتھ کوفہ میں لے آیا اور انکی یہاں دوا کی یہاں تک کہ انکو صحت ہو گئی اور یہاں سے وہ مدینہ کو چلے گئے بعد اسکے لکھا ہے کہ اس روایت سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت قاسم کی دامادی اور نکاح کی روایت راویوں کا جھوٹ ہے اسلئے سید الشہداء کے دو بیٹیوں سے زیادہ کوئی تیسری بیٹی نہیں تھی ایک فاطمہ زوجہ حسن مثنی دوسری سکینہ پھر باقی پانچ پسر کی حضرت امام حسن کی شہادت لکھی ہے اصل عبارت سیر الائمہ کی یہ ہے:

«علمای انساب پسرهای حضرت امام حسن علیہ السلام را هفتده تن یافته‌اند صاحب ناسخ التواریخ پسرهای آنحضرت تا بیست نفر مقرر کرده بدین تفصیل اول زید،دوم حسن مثنی،سوم حسین اثرم،چهارم علی اکبر، پنجم علی اصغر، ششم جعفر، هفتم عبد الله اکبر، هشتم عبد الله اصغر، نهم قاسم، دهم عبد الرحمان، یازدهم احمد، دوازدهم اسمعیل، سیزدهم یعقوب، چهاردهم عقیل، پانزدهم محمد اکبر، شانزدهم محمد اصغر، هفدهم حمزه، هیجدهم ابوبکر، نوزدهم عمر، بستم طلحه و از این جمله هفت تن روز عاشوره در رکاب سید الشهداء علیہ السلام بلانیت داشتند اول حسن مثنی دوم زید امام حسن مثنی زمانی که در مدینه بود در خاطر داشت که دختر سید الشهداء را در حباله نکاح در آورد چون این خبر را بغرض

آنحضرت رسانید او را حاضر ساخت و فرمود ان یک فاطمه و سکینه دختر من اند و هر یک را خواستگا باشی با تو کا بین خواهم بست حسن را شرم مانع آمد سخن نکرد سید الشهداء فرمود دختر خود فاچمه را که با مادرم شبیه است با تو کابین بستم خلاصه حسن مثنی در یوم عاشوره در رکاب سید الشهدا حاضر بود و با لشکر ابن سعد جهاد کرد و زخم فراوان یافت و در میان کشتگان افتاد و وقتیکه سر سائر شهداء را از تن دور می‌ساختند هنوز حسن را رمقی در تن بود اسمار بن خارجه بکنی بابی حسان او را شفاعت کرد و این شفاعت از بهران بود که باور حسن مثنی خوله دختر منظور از قبیله بنی قراره بود جون ابن سعد آگهی هافت گفت پسر خواهر ابو حسان را باو گذارید پس ابو حسان حسن را بکوفه آورد و مداوا نمود تا صحت یافت و از آنجا روانه مدینه شد از این حدیث مکشوف افتادا که حدیث دامادی قاسم بن الحسن علیه السلام در کربلا از اکاذیب روات است زیرا که سید الشهداء علیه السلام را زیاده دو دختر بنود یکی فاطمه که زوجه حسن مثنی علیه السلام و آن یگر سکینه بود.

اورارشاد میں شیخ مفید اور کشف الغمہ میں علی بن عیسی اربلی رحمہا اللہ کی بالکل اسکی ہی مطابق لکھا ہے اور نسب کی کتابوں کیطرف جو رجوع کیا تو دیکھا کہ عمدۃ الطالب فی نسب آل ابی طالب میں درمیان ذکر حسن مثنی یہ لکھا ہے:

«و کان قد خطب الي عمه الحسين علیه السلام احدی بنایه فابرز الیه فاطمه و سکینه و قال یابن اخي اختر ایهما شئت فاستحي الحسن و سکت فقال الحسین قد زوجتك فاطمة فانها اشبه الناس بامي فاطمة بنت رسول الله وقال لبخاری بل اختار الحسن فاطمة بنت عمة الحسين»

خلاصہ حسن مثنی نے ایک بیٹی کی امام حسین علیہ السلام کے مدینہ میں خواستگاری کی تھی امام حسین علیہ السلام نے فاطمہ اور سکینہ کو پیش کیا اور کہا کہ یہ دونوں موجود ہیں اے بھتیجے جسکوان دونوں میں سے چاہو اختیار کولو حسن مثنی شرما کر خاموش ہورہے امام حسین نے فرمایا کہ یہ فاطمہ جو میری ماں فاطمہ بنت رسول اللہ سے صورت میں مشابہ ہے اسکا تیرے ساتھ نکاح کردیا اور تیری زوجیت میں دیدیا اور بخاری نے کہا ہے شرمائے نہیں بلکہ خود حسن مثنی نے فاطمہ کو اختیار کرلیا اور اس طرح اور تحقیق علمانے رجال اور انساب کی سیر الائمہ کی روایت کو قوت دیتی ہے، جیسے کہ نجوم السماء فی تراجم العلماء میں بحر العلوم جناب مولانا محمد مھدی طباطبائی کی ذکر میں لکھاہے:

نسب شریفش از جانب پدر بحضرت امام حسن و از جانب مادر بحضرت امام حسین سید الشهداءعليه السلام میرسد زیرا که از جانب پدر منسوب بوده‌اند بسید ابراهیم طباطبائی بن اسمعیل الدیباج بن ابراهیم المعمر بن الحسن المثنی ابن الامام الحسن المجتبیعليه السلام

سے بھی ثابت ہے کہ فاطمہ کبری زوجہ حضرت حسن مثنی کی تھیں اور ابراہیم معمران کے بطن مطہر سے پیدا ہوئے جو مولانا محمد مہدی طاب ثراہ کے دادے تھے اور پھر اسی کتاب میں درمیان ذکر مولانا سید علی بن محمد علی بن ابی المعالی صغیر بن ابی المعالی کبیر حسنی حسینی حائری یہ لکھاہے:

نسبت شریفش از طرف پدر به ابراهیم طباطبایی که از فرزندان حسن مثنیعليه السلام بود از جانب مادر بفاطمه بنت سید الشهداءعليه السلام میرسد.

اور یہ شبہ نہ ہو کہ امام حسین کی فاطمہ دو دختر ہمنام تھیں ایک فاطمہ کا عقد حضرت حسن مثنی سے کیا اور دوسری فاطمہ کا حضرت قاسم سے کیا اس لئے کہ شیخ مفید نے ارشاد میں دو بیٹیاں امام حسین کی تحریر فرمائی ہیں ایک فاطمہ اور ایک سکینہ۔

علی بن عیسی اربلی نے کشف الغمہ میں حافظ عبد العزیز بن الاخضر جنابدی سے یہی نقل کیا ہے اور کمال الدین بن طلحہ شافعی سے اگرچہ ہونا تین دختر کا منقول ہے مگر نام انکے یہ ہیں زینب اور سکینہ اور فاطمہ اور

ایسا ہی ابن خشاب سے نقل کیا ہے اور بحوالہ ارشاد شیخ مفید وہ ہی فاطمہ اور سکینہ دو دختر لکھی ہیں اور ایک بزرگوار نے مجھ سے فرمایا کہ جناب امام حسین علیہ السلام نے وصیت پر اپنے بھائی حضرت امام حسن کی عمل کیا تھا ارشاد اور کلام انکا از بس عجیب و غریب ہے یہ بزرگوار اسکو نہیں جانتے کہ عمل تو بعد کو ہو گا پہلے کسی معتبر روای سے صحیح روایت میں جسکی توثیق ہمارے علماء نے کی ہو وصیت کا ہونا تو ثابت ہو علاوہ بریں گیارہ برس پہلے حضرت حسن علیہ السلام وفات پا چکے تھے دس برس یا کچھ کم زیادہ جناب امام حسین مدینہ میں رہے وہاں کبھی اس وصیت پر عمل نہ کیا جب کربلا کو ماہ شعبان چلے تو چلتے یا راہ میں وصیت پر عمل نہ واجب دوسری محرم کو کربلا میں پہونچے اور نام کربلا کا سنتے ہی حضرت امام حسین نے فرمایا کہ ہم سب یہاں قتل ہو جائیں گے مگر اس وقت وصیت پر عمل نہ کیا یہ وقت سب اطمینان کے ساتھ تھے اطمینان چھوڑ کر بے اطمینانی اور پریشانی کے وقت بے ضرورت وصیت پر عمل کیا اور یہ کونسا وقت وصیت پر عمل کرنے کا تھا کہ دشمن چڑھے آرہے ہیں عزیزوں کی لاشیں آرہی ہیں رونا پیٹنا درپیش ہے جان کے لالے پڑ رہے ہیں اور اس پر باطمینان نکاح ہو رہا ہے ایسے ہی ایک بزرگوار نے فرمایا کہ بیٹی کا رانڈ ہو جانا یہی دنیا میں باپ پر بڑی مصیبت ہے تو امام حسین اس مصیبت سے محروم رہے جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں یہ مصیبت کب امتحانا خدا کی طرف سے تھی یہ تو دیدہ و دانستہ بے ضرورت جان بوجھ کر کہ حضرت قاسم اسی وقت میدان کو جارہے ہیں اور حضرت جانتے تھے کہ قاسم پھر کر نہ آئیں گے اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ڈال لی اور اسی طرح اور بھی مصیبتیں تھیں وہ حضرت نے اپنے ہاتھوں کیوں نہ ڈالیں ،بعض اشخاص اس نکاح کی مصلحتیں بیان کرتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ مصلحت بھی تو اس وقت دیکھی جائی گی جو اسکا واقع ہونا کسی معتبر حدیث یا روایت میں سچے معتبر راوی سے منقول ہو اگر کسی معتبر روایت میں اس نکاح کا ہونا مذکور ہو چکا تھا تو ہمارے قدیمی علماء نے اپنی حدیث کی کتابوں میں کیوں نہ مذکور کیا؟ اور روایت عقد فاطمہ کبری جو حسن مثنی سے ہوا ہے اور یہ روایت کتب انساب اور سیر و اخبار میں ہے۔

علاوہ بر ان ہے کہ وہ روایت وصیت و عقد حضرت قاسم سے معارضہ کرتی ہے جو کوئی اس نکاح کا معتقد ہو گا تو اسکو اسکا بھی جواب دینا ضرور ہو گا کہ جب یہ امر ثابت ہو لیا کہ جناب امام حسین نے حضرت فاطمہ کبری کا عقد مدینہ میں حضرت حسن مثنی سے کر دیا تھا چنانچہ یہی امر کتب تاریخ و رجال و انساب سے پوری

طرح ثابت ہے تو حیات میں شوہر کی جناب امام حسین دوسرا نکاح اپنی بیٹی کا کیوں کرتے تھے باوجودیکہ حسن مثنی کے پسر کا پیدا ہونا بطن مطہر وے فاطمہ کبری کے جنکا نام ابراہیم معمر ہے ثابت ہے اور جملہ طباطبا ئی انہیں کی اولاد ہیں جیسا کہ نجوم السما میں ہے اور ایسی ہی عبد اللہ بن حسن مثنی کا بطن فاطمہ کبری دختر سید الشہدا سے کشف الغمہ میں مولانا علی بن عیسی اربلی علیہ الرحمہ کی لکھا ہے۔

پس بعد ثبوت ان سب امور کے یہ کہنا حضرت امام حسن علیہ السلام نے اپنی دختر حضرت فاطمہ کبری کا نکاح روز عاشورہ یا شب شہادت کربلا میں حضرت قاسم ابن حسن سے کیا تھا جناب امام حسین پر بڑی تہمت ہے اور ان حضرت پر بڑا بھاری اعتراض ہے کہ امام معصوم ہو کر حیات میں داماد کی اپنی بیٹی کا عقد دوسرے شخص سے کرتے تھے جو جو شناعتیں اس اعتقاد اور ذکر کرنے میں اور بخوشی خاطر سننے میں لازم آتی ہیں ان سے پرہیز کرنا اور بچنا ضروری ہے: قال الله تبارك و تعالي لنبيه صلعم: ان عليك الا البلاغ فانا اقتديته

خاتمہ الطبع

الحمد لله الذى اكشف الغطاء وارفع جلباب الخفاء وصلي الله علي نبيه واصحابه الكساء کہ فی زماننا ہذا جو مدار مذہب اہل حق کا بر خلاف ﴿فاسئلوا اهل الذكر انكنتم لا تعلمون﴾ کے ذاکرین مصائب و مناقب کی تصنیفات نظم و نثر پر ہو گیا ہے جو اہل خلاف کی روایت سے مستنبط ہیں اور حضرات عوام نے انہیں مضامین کو اپنی الواح خاطر پر کالنقش فی الحجر منقش فرمالیا ہے اور یہ موجب عصیان بی پایان کا ہوتا ہے۔

لہذا مصنف محقق و مولف مدقق صاحب تصانیف کثیر و تالیفات خطیر مخجل فضلا مخالفین موئد علماء مولفین الحاج والزوار السید المجد سلالہ آل محمد مولانا السید محمد النقوی ادام اللہ الصمد ظلہ العالی بدوام الایام و اللیالی نے اس رسالہ کو نسبت دامادی قاسم ابن حسن کی اپنی تحقیق حقیقی سے انتہا شائع فرمایا ہے تا کہ اہل حق اپنی جادہ مستوی سے نہ پہریں اور اپنی کتب حقہ کے مرویات سے تجاوز نہ کریں۔

تاریخ کا خونی ورق

تالیف: علامہ سید احمد معروف بہ علامہ ہندیؒ

- تمثال مبارک مؤلف کتاب "تاریخ کا خونی ورق"
- مؤلف کے بارے میں
- متن کتاب
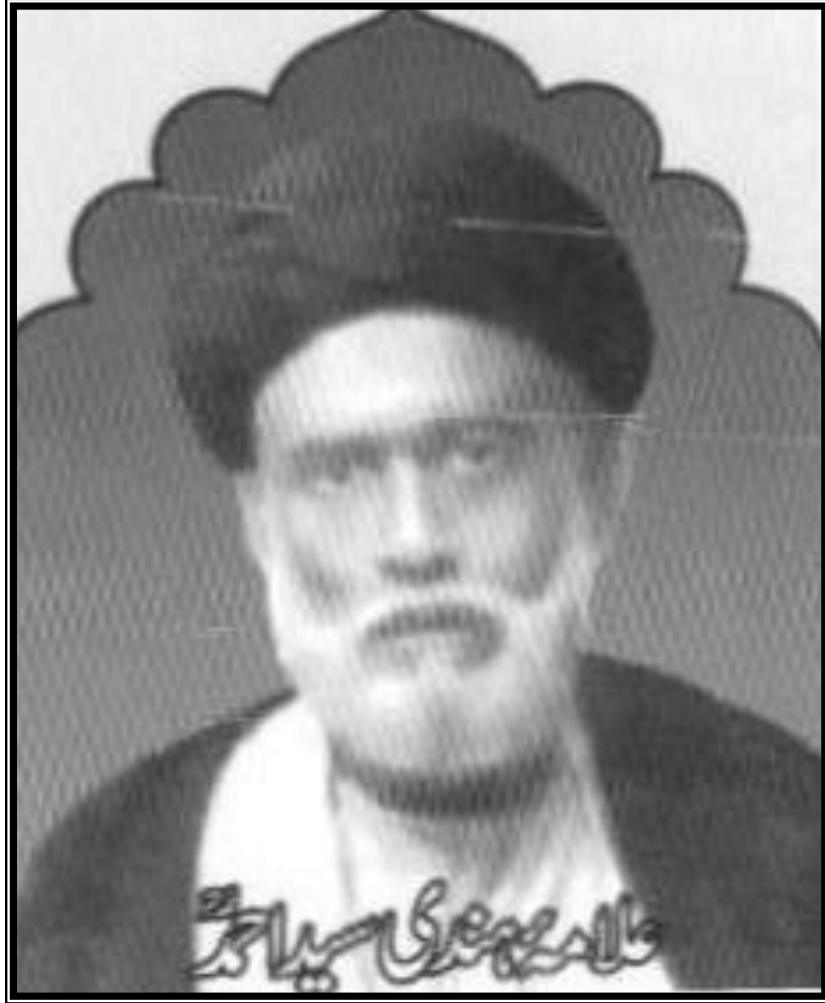
تمثال مبارک مؤلف کتاب "تاریخ کا خون ورق"

مؤلف کے بارے میں

علامہ سید احمد ہندیؒ، مولانا سید ابراہیم صاحب کے فرزند، ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے صفر ۱۲۹۸ھ کو اپنے والد کے ساتھ عراق گئے اور تحت قبہ بسم اللہ خوانی ہوئی۔ دوسری مرتبہ ۱۳۰۵ھ میں زیارات عراق وایران سے مشرف ہوئے۔ مرزا محمد حسن صاحب کشمیری سے اور مولوی سید محمد صاحب مدرس مدرسہ ناظمیہ اور مولوی سید سرفراز حسین صاحب اور مولوی شیخ فدا حسین صاحب، ملا سید علی اصغر صاحب اور مولوی مظفر علی خان صاحب مراد آبادی اور تاج العلما سے درسیات کی تکمیل کی۔

عراق جانے سے قبل تقریر وتحریر کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مثلاً سفر ملتان میں سنی عالم سے مناظرہ کیا۔ جس سے اہل ملتان اب تک ممنون ہیں۔ ایک شیعہ مولوی صاحب سے معراج جسمانی پر مباحثہ کیا۔ ایک آریا سے ذبح حیوانات پر بحث کی اور عزّت وفتح پائی۔

آپ نے عراق کے متعدد سفر کیے۔ ۱۳۲۵ھ میں مع اہل و عیال ۱۳۲۶ھ میں اس سفر میں غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے وقف اور اس کے وظائف کی تقسیم کا مسئلہ طے کرایا۔

۱۳۲۸ھ لکھنؤ میں "یاد گار علماء" کے نام سے خاندان اجتہاد کے اکابر کے لیے انجمن قائم ہوئی۔ علامہ ہندی نے تیس سال تک اس میں کام کیا۔

۱۳۳۱ھ میں وثیقہ موقوفہ نواب محل کی تقسیم کے لیے کربلاء گئے۔ اسی زمانے میں یکم شوال تا ۱۶ شوال نجف میں قحط آب ہوا تو مولانا روزانہ کوفے سے پانی منگوا کر مفت تقسیم فرماتے رہے۔ اسی سال جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ میں مدرسہ دینیہ، جعفریہ کی بنیاد رکھی جس میں سو سوا سو طلبہ جغرافیہ، ہندسہ، حساب ترکی، عربی وعلوم دینیہ پڑھتے تھے۔ اس مدرسے پر مولانا نے بڑی محنت کی تھی۔

۱۳۳۳ھ 1914ء کی جنگ عظیم میں آپ نے عوام، کی بڑی خدمت کی اور ۴۵ (زن وفرزند) افراد کا قافلہ لے کر براستہ دریا بصرے آئے اور ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ ہندوستان واپس پہنچے۔

۱۳۳۵ھ میں انجمن دارالتبلیغ قائم کی۔ عراق کے علماء میں مرزا فتح اللہ شیرازی مشہور بہ شیخ الشریعت، آیت اللہ سید محمد کاظم طباطبائی آقای محمد باقر طباطبای، آقای حاج شیخ حسین مازندرانی، رحمہم اللہ نے مولانا سید احمد کو اجازات دیے جن میں سے جناب ملا محمد کاظم خراسانی نجفی نے اجازہ میں لکھا:

«فی الحقیقت علم در آن صفحات منحصر بمثل ایشاں ست پس امر ایشاں امر من وطاعت ایشاں طاعت من وفعل من»

مولانا سید احمد با عمل، مدبر اور مفکر عالم تھے۔ جمال الدین افغانی کی تحریک کا شباب تھا۔ انگریزوں سے نفرت بڑھ رہی تھی مولانا سید احمد نے قومی مفادات کے تحفظ کی خاطر عراق میں قونصل برطانیہ سے ٹکر لی اور اوقاف لکھنؤ سے نجف و کربلا وغیرہ کے لیے جاتی تھی اس کا محاسبہ کیا اور صحیح مستحقین تک پہنچانے اور عراق میں زائرین کے تحفظ کی سعی کی۔

وطن آکر مولانا نے "علامہ ہندی" کے نام سے شہرت پائی۔ وہ شہر شہر قریے قریے دورے کرتے رہے اور دینی، سیاسی اور علمی مسائل کے لیے عملی منصوبے بنائے۔ انھوں نے آریوں، ہندوئوں اور مختلف مذاہب و ملل کے افراد سے مباحثے کیے۔ پورے ملک کے دورے کر کے اسلامی تبلیغات کا کام انجام دیا۔ بہت سے شہروں میں ذہنی اور علمی بیداری کے مرکز قائم کیے۔

وہ طویل مدت کلکتے میں رہے اور وہاں تبلیغی کتابچے چھاپتے رہے۔ علامہ ہندیؒ نے قوم کی علمی، اور ذھنی، سیاسی اور سماجی اصلاح وترقی کے لیے پوری زندگی جدوجہد کی۔ آخر پنجشنبہ ۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء مطابق ۲۰ شعبان ۱۳۶۶ھ لکھنو میں رحلت فرمائی۔ غفران مآب کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔

اولاد

مولانا سید محمد ابراہیم عرف سید محمد صاحب ملتان میں وفات پا چکے آپ کا تاریخی نام سید ذوالفقار حسین تھا سید محمد یوسف صاحب تاریخی نام سید خورشید حسن ہے۔ آقا حسین سید محمد مصطفی۔[1]

---

[1] بے بہا د نزہتہ ۸ ص ۱۵۔ اعیان الشیعہ ج ۹ ص ۱۷۹۔

آثار

علامہ ہندی شروع ہی سے زبان و قلم کے دھنی تھے، انہوں نے سینکڑوں مضامین اور رسالے لکھے اور چھاپے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ ساعتیہ، صرف مطبوعۃ (عربی)
۲۔ زبدۃ الکلام۔ مطبوعہ
۳۔ تفسیر سورۃ الحمد و تفسیر مسئلۃ (عربی)
۴۔ فلسفۃ الاسلام کیمیا
۵۔ المنطق
۶۔ اشارات فی الکلام
۷۔ التصریف
۸۔ الیاقوت
۹۔ قاسمیہ
۱۰۔ کفایتہ السائلین
۱۱۔ استدلال
۱۲۔ جواز تجزی فی الاجتہاد استدلال
۱۳۔ مدارج الوصول شرح معارج الاصول
۱۴۔ ھموع دموع العینین مقتل ابی الحسینؑ
۱۵۔ بسط مقال فی اسماء الرجال
۱۶۔ درایۃ الحدیث
۱۷۔ عماد الدین فقہ
۱۸۔ مخلوط
۱۹۔ انشاء صد برگ۔
۲۰۔ انشاء عجب العجاب
۲۱۔ ورثۃ الانبیاء
۲۲۔ حل مسئلہ مشکلہ۔؟ (فارسی)
۲۳۔ ریاض العباد فقہ (اردو)
۲۴۔ شکیات و جدول احکام نماز (اردو)
۲۵۔ فتاوی احمدیہ (اردو)
۲۶۔ احکام المسافرین (اردو)
۲۷۔ رسالہ عملیہ (اردو)
۲۸۔ اظہار الہدی رد بر اسرار الہدی (اردو)
۲۹۔ اثبات حق در رد نصاری (اردو)
۳۰۔ عشرہ مبشرہ مقاتل (اردو)
۳۱۔ حمایت الاسلام ۲ جلد (اردو)
۳۲۔ دورہ اول اسلام ج ا و ۲ مطبوعہ (اردو)
۳۳۔ المسیحۃ و الاسلام مطبوعہ (اردو)
۳۴۔ حل مسئلہ مشکلہ مطبوعہ (اردو)
۳۵۔ الدلیل و البرہان (مطبوعہ) (اردو)
۳۶۔ نظر فلسفیانہ بر معارج مطبوعہ (اردو)

۳۷۔ اختیارات در ادعیہ مطبوعہ (اردو)
۳۸۔ فلسفۃ الاسلام ۱۰ جلدیں ناتمام (اردو)
۳۹۔ کشکول۔ (اردو)
۴۰۔ التشفیع والصرف ۳ حصے (اردو)
۴۱۔ اراد الابرار (اردو)
۴۲۔ مقالات مفیدہ (اردو)
۴۳۔ رسالۃ الصحف (اردو)
۴۴۔ المسخ المطبوعہ۔

دار التبلیغ کلکتہ لکھنو سے آپ کے پچاس سے زیادہ رسالے شائع ہوئے جن کی تفصیل دستیاب نہ ہو سکی۔

متن کتاب

(شہادت امام حسینؑ کے تاریخی واقعات)

دیباچہ

محرم الحرام سنہ ۱۳۵۴ھ کے سرفراز محرم نمبر کے لیے واقعات کربلا لکھے گئے تھے اور مظلوموں کے بادشاہ صابروں کے شہنشاہ کی بارگاہ میں یہ ناچیز ہدیہ پیش کیا تھا۔

احباب کے اصرار اور دارالتبلیغ کی ضروریات نے مجبور کیا کہ چند مفید اضافوں کے ساتھ بطور رسالہ مکرر یہ مضمون طبع کرایا جاوے بعض ناگزیر اتفاقات کی وجہ سے محرم و صفر میں یہ مضمون طبع نہ ہو سکا، خدا کا شکر ہے کہ ہم اس قابل ہوئے کہ اس مفید رسالہ کو بعض ضروری اضافوں کے ساتھ مکرر پیش کر سکیں۔ وما توفيقي الا باالله

باسمہ سبحانہ لہ الحمد

جنگ کربلا کے تاریخی حالات!

حالات امام حسینؑ علیہ السلام

خدا کا فدائی، اسلام کا شیدائی، مسلمانوں کا غمگسار، امت کا جان نثار، خدا کا محبوب، رسول کا پیارا، محمد کا لخت جگر، علی کا نور نظر، فاطمہ کا چاند، حق کا دلدادہ، صداقت کا شہزادہ، مجسمہ ایثار، صبر واستقلال کا پتلا، خلق ومروت کا پیکر، رحم وانصاف کا پیرو، ہمت کا دھنی، امت کا پیشوا، شان الہی کا مظہر، کمالات رسالتی کا آئینہ، حافظ دین الہی۔

جنگ کربلا کا قافلہ سالار حسینؑ مظلوم

۳شعبان المعظم سہ ۴ھ روز جمعہ مدینہ منورہ میں پیدا ہوا اور ۱۰ محرم الحرام سہ ۶۱ھ روز جمعہ بعد زوال آفتاب بچپن سال کی عمر میں کربلا کے چٹیل میدان میں معہ عزیز و اقارب ننھے ننھے بچوں اور جان نثاروں

اور رفیقوں کی تین دن کی بھوک پیاس میں گردن کٹا کر سو رہا۔ تاریخ دانوں کے سوا کون جانتا ہے کہ امام حسینؑ اس مظلومیت سے کیوں شہید کر دیے گئے اور قتل مظلوم کے کون لوگ ذمہ دار تھے۔

امام حسین کا شجرہ نسب

واقعات شہادت کو روشنی میں دلانے کے لیے سب سے پہلے ضرورت ہے کہ ہم شجرہ نسب پیش کریں جس سے وجوہ شہادت کے معلوم کرنے میں سہولت ہو۔

ذیل کے شجرہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غالب سے وہ سلسلہ جو عبد اللہ بن عبد المطلب اور ابو طالب تک منتہی ہوا ہے صرف وہی موحد و ملت ابراہیمی پر تھے باقی تمام افراد کا سلسلہ بت پرست و مشرک ہے خلفائے رسول بھی مشرک تھے عرصہ کے بعد رسول خدا پر ایمان لائے اور مسلمان ہوئے۔
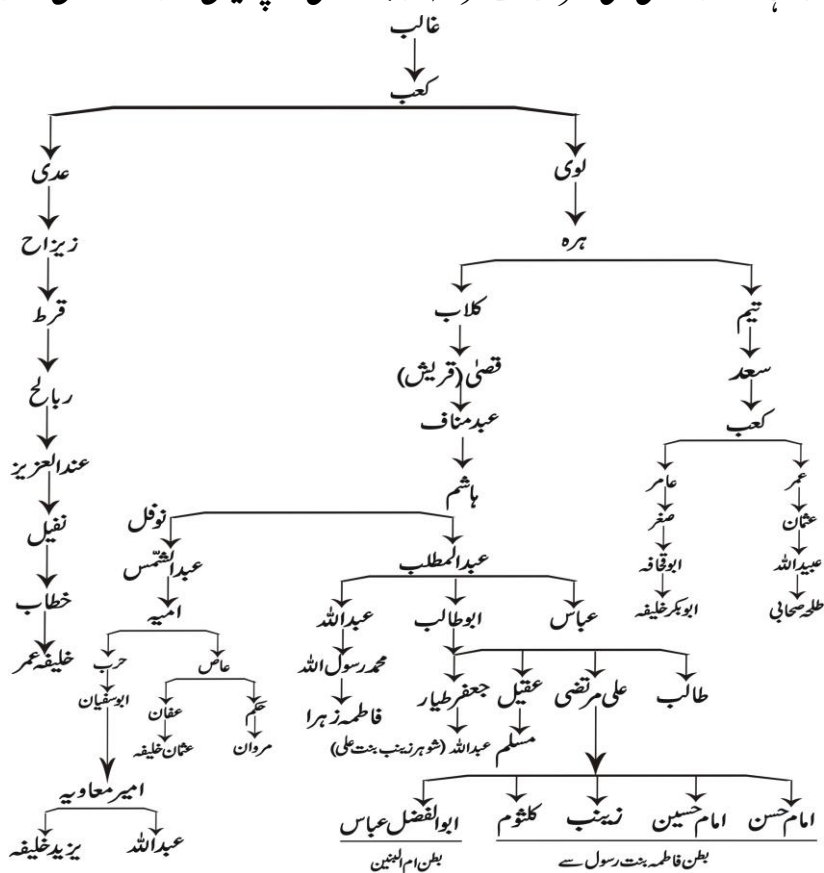
نوٹ: سعد بن وقاص، عمر عاص، عبد الرحمن بن عوف کے جد اعلی تھے خالد بن ولید اسی نسل سے تھے۔ سلاطین بنی عباس کے مورث اعلی بنی ہاشم، ونساب عرب، امیہ کو عبد الشمس کا بیٹا نہیں کہتے بلکہ امیہ کا نام ذکوان تھا جو غلام تھا، ان کو حقیر سمجھ کر امیہ ماں کا بیٹا کہتے تھے۔[1] اس بنا پر بنی ہاشم اپنے نسب میں بنی امیہ کو شریک نہ کرتے تھے آپ کی والدہ ہندہ جگر خوارہ مشہور ہیں ایک حبشی غلام سے آپ نے زنا کیا اس کی اجرت یہ قرار پائی کہ حبشی جنگ احد میں حضرت حمزہ عم رسول خدا کی لاش چاک کر کے جگر نکال لائے جب جگر ہندہ کو ملا اس نے دانتوں سے چبایا۔

حسب ضرورت شہادت امام حسینؑ، زیاد کو جو سمیہ بن عبد ثقیف کا بیٹا تھا اس کو معاویہ نے اپنی پولیٹیکل ضرورت کے ماتحت اپنے نسب میں شامل کر لیا۔ یزید نے بھی بعد شہادت امام حسینؑ ابن مرجانہ کے لقب سے یاد کیا اور لعنت کی۔[2]

خاندان رسالت سے پشتی عداوت اور اس کے وجوہ و اسباب اور اس کا نتیجہ جنگ کربلا:

کشتۂ ظلم وجفا حسینؑ، چونکہ وارث اسلاف کرام و اجداد عظام تھا، اس لیے تمام عداوتوں کا مرکز بھی یہی ایک تنہا ذات رہ گئی تھی، اس لیے تمام اگلی اور پچھلی عداوتیں اسی ایک یکہ اور تنہا ذات سے نکالی گئیں اور امام حسینؑ نے بھی نہایت خندہ پیشانی سے اپنی ذات عالی کو تمام بزرگوں کی طرف سے پیش فرما دیا اور اپنی ذات کو اسی فداکاری کی وجہ سے عالم میں ذبح عظیم کا مصداق بنا دیا۔

دیکھو! اس اسباب و وجوہ عداوت کو:

۱) خاندان ہاشم سے بنی تیم، بنی عدی، بنی امیہ کو سخت ترین عداوت تھی اور یہ تینوں قبیلے بنی ہاشم کے خلاف حلف اور معاہدہ کیے بیٹھے تھے۔ جناب ابو بکر بنی تیم سے تھے اور جناب عمر قبیلہ عدی سے اور جناب

---

[1] اصابہ، ثمرۃ الاوراق، روض الانف سہیلی، کامل ابن اثیر۔

[2] الامامت والسیاست۔

عثمان بنی امیہ میں سے تھے اسلام لانے کے بعد بیعت رضوان میں رسول خدا نے بھی اس اتحادی رشتہ کو نہیں توڑا بلکہ جناب ابو بکر و عمر میں برادری قائم کی اور جناب عثمان کو عبد الرحمن بن عوف (خلیفہ گر) کا بھائی بنادیا اسلام لانے کے ک بعد بھی یہ قبائل شیر و شکر رہے۔

بنی ہاشم،سے عداوت کی وجہ یہ تھی کہ جناب ابو بکر کے دادا صخر نے امیہ کے اغوا سے جناب عبد المطلب کے پڑوسی یہودی کو دولت کی لالچ میں قتل کر دیا امیہ نے ان کو پناہ دی ایک سال تک عبد المطلب قاتل کی تلاش میں رہے۔ بالا آخر پتہ لگا اور امیہ سے بجبر صخر کو حاصل کر کے حسب قانون حجاز صخر سے بھاری دیت حاصل کی جو مقتول یہودی کے بھتیجے کو دی گئی اور دس سال کے لیے صخر جلاوطن کئے گئے۔

۲) دولت و ثروت و حکومت موروثی خانہ کعبہ کی وجہ سے حضرت عبد المطلبؑ کو حاصل تھی، جس کی وجہ سے تمام قبائل آپ کے دشمن تھے اور یہ تولیت کعبہ و حکومت و ثروت جناب عبد المطلبؑ سے حضرت ابو طالبؑ کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت علی بن ابی طالبؑ سے بھی سخت دشمنی تھی۔ وہ عہدے اور منصب حسب ذیل تھے۔

تولیت خانہ کعبہ، حجاج کی مہمانی،(و قادہ) حجاج کے لیے پانی کی فراہمی (سقایہ) تمام قبائلی نزاعوں کا فیصلہ (قضاۃ) اور لشکر کی سپہ سالاری امام حسینؑ مذکورہ کل منصوبوں کے وارث و مستحق تھے۔

۳) حضرت عبد المطلبؑ کے چچا نوفل جد حضرت عثمان بن عفان نے جناب عبد المطلبؑ کی جائداد غیر منقولہ دبالی تھی حضرت عبد المطلبؑ نے اپنے ماموں کو مدینہ منورہ سے بلایا وہ اسی (۸۰) نفر مددگار ساتھ لائے اور بجبر جائداد نوفل کے قبضہ سے نکال کر عبد المطلبؑ کے حوالے کی۔

۴) چاہ زمزم، عرصہ سے مخفی ہو گیا تھا، حضرت عبد المطلبؑ کو الہام سے معلوم ہوا جس کو آپ نے بر آمد کیا امیہ نے یورش کی تا کہ حصّہ بٹائے لیکن سب مغلوب ہوئے۔

۵) جناب عبد المطلبؑ نے امیہ کی شرارتوں سے عاجز آکر بنی جرہم سے جو ایک بڑا قبیلہ اور بہادر تھا معاہدہ کر لیا جو سب کو شاق ہوا۔

۶) اہل تاریخ واقف ہیں، کہ عرب حسب و نسب پر مٹے ہوئے ہیں، ان کے آب و گل میں تفاخر نسبی داخل ہیں اس لیے بنی ہاشم قبائل عدی، تیم امیہ کو قریشی اور اپنا مقابل نہ سمجھتے تھے اور منہ نہ لگاتے تھے، جس کی وجہ سے بنی ہاشم سے سب کو سخت عداوت و مخالفت تھی۔

آخر کار ان عداوتوں کو خداوند کریم کو قرآن مجید میں ظاہر فرمانا پڑا: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ...﴾؛[1] جس میں حضرت علیؑ، حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان کی قدیمی رنجشوں کو جتایا گیا ہے اس لیے کہ حضرت علیؑ بنی ہاشم کے سردار تھے اور حضرت ابو بکر بنی تیم، حضرت عمر بنی عدی اور حضرت عثمان بنی امیہ سے تھے اور زمانہ جاہلیت سے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔[2] مذکورہ عداوتیں پشتہا پشت سے چلی آرہی تھیں۔

۷) علیؑ بن ابی طالبؑ کی شمشیر آبدار نے مذکورہ قبائل کو اور خلفاء کے قریبی رشتہ کو اسلام کی نصرت میں قتل کیا مثل عمیر بن کعب یزید بن تمیم، عثمان، مالک، بنی تیم سے جو قریبی رشتہ دار جناب ابو بکر اور جناب طلحہ کے دست علی سے قتل ہوئے ابو العاص بن قیس، عمر بن ہشام، ہشام بن امیہ حضرت فاروق کے قریبی رشتہ دار مارے گئے۔

معاویہ بن مغیرہ بن ابوالعاص، عاص بن سعید بن عاص بن امیہ حضرت عثمان کے قریبی رشتہ دار مارے گئے اور حنظلہ معاویہ کے ماموں اور ابن عتبہ اور عامر بن عبد اللہ اور شیبہ امیر معاویہ کے نانا کے بھائی اور عتبہ امیر معاویہ کے نانا یہ سب جناب عثمان اور امیر معاویہ کے قریبی رشتہ دار تھے اور عمر بن عوف ،عاصم بن ابی عوف جناب سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبد الرحمن بن ابی عود کے قریبی رشتہ دار مقتول ہوئے ورثاء مقتولین کا جذبہ انتقام تھا جس نے رسول خدا ﷺ اور علی مرتضی علیہ السلام کو دم نہ لینے دیا اور ہندہ کو عم رسول حمزہ علیہ السلام کے جگر چبانے پر آمادہ کیا اور انہیں شہدائے بدر کو یاد کر کے خلیفہ ابن

---

[1] سورہ اعراف (۷) آیت: ۴۳۔

[2] ازالۃ الخلفاء شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ص ۴۰۱۔

خلیفہ یعنی جناب یزید اس بھرے دربار میں مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ عین اس وقت جب سر امام حسینؑ طشت میں دھرا ہوا سامنے تخت پر رکھا ہوا تھا یہ خلیفہ زادہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا:

اے کاش آج کے روز ہمارے مقتول بزرگ جو بدر میں قتل ہوئے۔ دیکھتے کہ میں نے کس طرح سے بدلہ لیا ہے اور چنے ہوئے بنی ہاشم کے بزرگوں کو قتل کر کے عوض پورا کر لیا۔[1]

٨) سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ رسول خدا ﷺ کی وفات ہوئی حضرت علیؑ کو یقین تھا کہ وہی وصی و خلیفہ و جانشین رسول ہوں گے اور سب ہی کو اس کا یقین تھا اس لیے کہ علیؑ برادر رسول ﷺ، داماد رسول ﷺ ہر لڑائی میں سردار لشکر رہ چکے تھے رسول کے قرضے آپ ہی نے ادا کیے آپ کے علم و حکمت شجاعت و زہد کی بار بار رسول خدا ﷺ تصدیق فرما چکے تھے متعدد موقعوں پر آپ کو اپنا وصی و جانشین بھی ظاہر کیا تھا اور تمام اصحاب اور عرب جانتے تھے۔ کہ علی کے سوا کوئی خلیفہ نہ ہو گا۔[2]

علی علیہ السلام خلاف توقع اجماع سقیفہ کی وجہ سے محروم رہ گئے لیکن ہمیشہ دربار خلافت میں اپنا حق خلافت جتلاتے رہتے اور باوجود جبر و تشدد خلافت اولی میں بھی بیعت نہ کی اور خلافت ثالثہ میں بھی احتجاج فرمایا اور بیعت نہ کی اور جنگ جمل و صفین میں بھی آپ کے اعزا اور رفیق اور خود آپ برابر فرماتے رہے کہ میں نے بیعت نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ خلافت ثالثہ کے موقع پر جب آپ سے سیرت خلفاء کی پابندی کے لیے کہا گیا اس وقت بھی صاف انکار کر دیا اور بعد قتل عثمان جب آپ کے سامنے عہدہ خلافت کی پیشکش ہوئی تو آپ سے سیرت خلفاء کی پابندی کو کہا گیا اس وقت بھی آپ نے انکار کر دیا اور حضرت سیدہ بنت رسول ﷺ نے آخر دم تک بیعت نہ کی اور ایسی ناراض رہیں کہ جناب خلافت مآب (یعنی ابو بکر و عمر) سے بات تک نہ کی۔

---

[1]۔ طبرسی۔

[2]۔ رجوع کریں: نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، صحیح ترمزی، اپالوجی فار اینڈ قرآن جان ڈیون پورٹ لکچر محمڈن لا امیر علی صفحہ ٣٤ نوٹ ٢ فیصلہ مشورہ بمقدمہ اپیل مسٹر جسٹس آرنولڈ۔

المختصر جناب امیرؑ اور ان کے بعد امام حسنؑ اور امام حسینؑ یکے بعد دیگرے اپنے کو خلیفہ رسول سمجھتے رہے اور ان کے تابعین اور اصحاب اور جملہ بنی ہاشم خلافت کے حقدار انہیں حضرات کو سمجھتے رہے اور اسی خیال و اعتمار پر شدید مصیبتیں بھی جھیلیں۔ یہ دشمنی ایسی شدید اور سخت ترین تھی جو آج تک فریقین کے طرفداروں میں موجود ہے جو اکثر نازک حالت پیدا کر لیتی ہے۔

جناب عثمان کا رویہ

خود ان کی ذات کے لیے بھی بدترین نتائج کا موجب ہوا۔ عہد خلافت میں انہوں نے خزانہ اپنے خاندانیوں میں لٹا دیا تھا۔ تمام صوبوں کی اعلی افسری وعہدے اپنے خاندان کو دے دیے تھے جس سے عام شورش ہوئی اور آپ قتل کر دیے گئے۔ لیکن اسی پر اکتفانہ ہوئی خاندان نبوت بھی بھینٹ چڑھ گیا بنی امیہ کافی اقتدار و دولت حاصل کر چکے تھے بھی ہاشم فلاک و مصیبت میں مبتلا تھے پچھلی عداوتیں اور دولت و حکومت کا چسکا اس بات کا سبب ہوا کہ اولاد رسول ﷺ کو دنیا سے مٹادیں۔

فرزند رسول ﷺ کی کسی نے مدد کیوں نہ کی؟

دنیا میں اولاد رسول ﷺ کا کوئی حامی نہ تھا رسول کے پرستاروں نے سہولت سے اولاد رسول ﷺ کا خاتمہ کس طرح سے کر دیا اس تعجب خیز بات کا جواب تاریخ کے اوراق سے بخوبی مل جاتا ہے۔

ا۔ رسول خدا ﷺ کی آنکھ بند ہوتے ہی علی مرتضیٰؑ خلافت سے محروم کر دیے گئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ خلافت دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی، ظاہر ہے کہ اسی وقت سے خلافتوں کا عام پروپیگنڈہ شروع ہو گیا اور ان کے اصول خلافتی کا رواج ہو گیا علیؑ اور اولاد رسول ﷺ کے اصول اور شخصیتوں کا تعارف مفتوحہ ملکوں میں کون کرنے والا تھا عنان خلافت ان کے گروہوں میں آ گئی جو اصولاً بھی سیاست و دیانت علوی سے عظیم اختلاف رکھتے تھے جنہوں نے اسلام کی تلوار کا مذہب اور فتوحات و ملک گیری کا مذہب بنا دیا تھا۔ بدوی عرب جو سونا چاندی کی صورت سے بھی واقف نہ تھے ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے کمزور غافل ملکوں کی لوٹ مار میں ٹوٹ پڑے تھے۔

علوی آئین کا یہ اقتضا تھا۔ کہ نابینا بھائی عقیل فقیر و مصیبت سے جاں بلب ہو کر حصہ سے زائد تھوڑا گیہوں مانگتا ہے تو علی بیت المال کا چراغ جب بجھا دیتے ہیں۔ اس وقت بھائی کی مصیبت سنتے ہیں اور عام حصہ سے زائد چند مشت گیہوں مانگنے پر لوہا گرم کر کے بھائی کو داغ دیتے ہیں تمام بنی ہاشم فقر و گرسنگی میں مبتلا ہیں لیکن ان کا ہیر و امن و امان کا دیوتا تلوار اٹھانے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اور ملک گیری و فتوحات کا اسلام کا غلط جامہ نہیں پہنانا چاہتا تھا۔

۲۔ دنیا مفلس کا کب ساتھ دیتی ہے۔ علیؑ اور اولاد علیؑ فاقہ کشی میں مبتلا تھے اور خلافتی لیڈروں کے خزانے مال و زر سے بھرے پڑے تھے۔ جناب ابو بکر کی ماہواری تنخواہ بیت المال سے پانچ سو درہم تھی۔[۱]

جناب عثمان کی وفات کے بعد ۱۵۰۰۰۰ اشرفی اور ۱۰۰۰۰۰۰ درہم نکلے تھے اور ۱۰۰۰۰۰ درہم کی زمینداری اس کے علاوہ اثاث البیت اسپ، شتر، بھیڑ، بکری، لونڈیاں اور غلام تھے۔[۲] بی بی عائشہ کی بیت المال سے تنخواہ بارہ ہزار درہم سالانہ تھی۔[۳]

حضرت زبیر جب مرے تو ان کے ترکہ کے ایک حصہ کی قیمت پچاس ہزار اشرفی تھی، ایک ہزار گھوڑا، ایک ہزار لونڈی۔ اس کے علاوہ تھیں آپ کی عالی شان کوٹھیاں بصرہ، یمن، مصر، کوفہ، سکندریہ میں موجود تھیں۔[۴]

حضرت طلحہ کی آمدنی عراق سے تھی روزانہ ایک ہزار اشرفی اور ''مسراۃ'' سے جو آمدنی تھی وہ اس سے کہیں زائدہ تھی آپ کا عالی شان محل کوفہ میں اور مدینہ میں تھا جو سال کی لکڑی کا بنایا تھا۔[۵]

---

[۱]۔ تاریخ الخلفاء۔

[۲]۔ مروج الذہب مسعودی۔

[۳]۔ مستدرک حاکم۔

[۴]۔ مروج الذہب مسعودی۔

[۵]۔ مروج الذہب۔

عبدالرحمن بن عوف (خلیفہ گر) کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑا ہر وقت بندھا رہتا تھا ایک ہزار اونٹ دس ہزار بکریاں تھیں آپ کے ترکہ کا چہارم حصہ ۸۴۰۰۰ ہزار درہم قرار پائے تھے۔[۱]

زید بن ثابت کی رہن دولت کا تخمینہ ایک لاکھ اشرفی کے علاوہ چاندی سونے کی اینٹیں تھیں جو بعد میں کاٹ کر ورثہ پر تقسیم ہوئیں۔[۲]

حضرت سعد بن وقاص کا "عقیق" میں ایک عالی شان دو منزلہ محل تھا۔[۳]

حضرت یعلی بن منبہ نے ترکہ میں نقد پچاس ہزار اشرفی چھوڑی اور تین لاکھ درہم کا مال و متاع۔[۴]

حضرت امیر معاویہ گورنر شام کی تنخواہ خلافت مآب حضرت عمر نے ایک لاکھ اشرفی سالانی مقرر کی تھی پھر بحکم خلفیہ ثالث ذمیوں کی زمینیں اپنی خاص ملکیت میں داخل کر کے جاگیر داری کی بنیاد ڈالی[۵] آپ کا قصر "خضراء" شام کا عالی شان محل جب ابوذر غفاری صحابی نے دیکھا تو نصیحت کی جس کے صلہ میں جناب عثمان نے اس گستاخی کی یہ سزا دی کہ شام سے بلا کر "ربذہ" کے اجڑے اور ویران مقام پر صحابی رسول ﷺ کو نظر بند کر دیا جہاں وہ غربت کی موت مرے۔[۶]

جناب مروان نے اپنے سالے کو خلیفہ ثالث نے باغ فدک عطا کر دیا[۷] اور آفریقہ کا کل خمس بخش دیا۔[۸]

۱۔ مروج الذہب۔

۲۔ مروج الذہب۔

۳۔ مروج الذہب۔

۴۔ مروج الذہب۔

۵۔ ابن عساکر۔

۶۔ کامل ابن اثیر۔

۷۔ طبری۔

۸۔ واقدی، استیعاب۔

جناب عثمان نے اپنے داماد حارث بن حکم کو ایک لاکھ درہم عطا کیا۔[۱]

مہروز کا بازار مدینہ کا مروان کے بھائی کو بخش دیا۔[۲]

جناب عثمان نے عبد اللہ بن خالد بن اسید کو چار ہزار درہم بیت المال سے عطا کر دیے۔[۳]

غرضکہ تمام خزانہ جناب عثمان نے اپنے رشتہ داروں پر لٹا دیا تھا اور سب ہی اٹریل و مالدار ہو گئے تھے۔[۴]

نتیجہ اس کا یہ تھا کہ ایک طرف سرمایہ داری دوسری طرف فقر و مصیبت دولتمندوں کا مقابلہ ایک مسکین و فقیر گروہ کب کر سکتا تھا۔ ان سرمایہ داروں کی سرمایہ داری اور دولت کے نشہ سے مخمور، عیش پسند و جاہ طلب خلقت میں رسول کی اولاد کا کون ساتھ دیتا۔

۳۔ تمام اسلامی ممالک کے گورنر اور اعلیٰ آفیسر یہی حضرات تھے جو پشتینی دشمن خاندان رسالت تھے ۔جناب خالد بن ولید گورنر مصر تھے جناب عمر عاص وزیر اعظم امیر معاویہ تھے جناب مروان وزیر اعظم حضرت عثمان تھے جناب ولید حاکم کوفہ تھے جناب معاویہ خلافت عمریہ کے وقت سے گورنر شام تھے جناب مروان کو امیر معاویہ نے قاضی دین مقرر کیا تھا۔ جناب ابو ہریرہ حاکم بحرین اور کبھی حاکم مدینہ مقرر ہوئے۔ ابن زیاد حاکم بصرہ و کوفہ مقرر ہوئے۔

ظاہر ہے کہ ملک ارباب حکومت کو چھوڑ کر ان لاوارثوں، بے کسوں اور غریبوں کا ساتھ کب دے سکتا ہے آہنی گھونسہ اور زر و جواہر کی بارش میں ایک ولی خدا کا مددگار کون ہو۔ کیا خوب سمجھا تھا فرزدق شاعر جب امام حسینؑ نے کوفہ کا حال ان سے پوچھا تو عرض کی "مولا دل آپ کے ساتھ اور تلواریں یزید کے ساتھ ہیں۔"

---

[۱] ۔ طبری۔

[۲] ۔ محاضرات، راغب اصفہانی۔

[۳] ۔ معارف ابن قتیبہ۔

[۴] ۔ صواعق محرقہ، تاریخ الخلفاء۔

۴۔ بصرہ، کوفہ، مصر کی آبادی و تعمیر انہیں ہاتھوں سے ہوئی تھی اور انہیں لوگوں کی آبادی تھی جو فوجی اور خلافتی نوکر تھے سنہ ۱۶ھ میں بصرہ بحکم جناب عمر عتبہ بن بن غزوان نے آباد کیا تھا اور خلافتی فوج کا کیمپ تھا چند ماہ بعد سعد بن وقاص فاتح عراق نے بحکم جناب عمر کوفہ آباد کیا ملک مصر میں "قسطاط" سنہ ۱۸ھ میں عمر عاص نے آباد کیا لہذا خوب سمجھ لو ولایت بصرہ و کوفہ و مصر کی آبادی ان اقوام عرب سے ہوئی جو اولاد رسول ﷺ کی رہین منت نہ تھی ان کے دیوتا خلافتی لیڈر تھے ان کو اصول و آئین علوم و کمالات علیؑ و اولاد علیؑ کی کیا خبر تھی اور کیا ہمدردی ہو سکتی تھی وہ اقوام اپنے گورنروں کے زیر اثر دشمنی اہلبیتؑ رسول ﷺ کو فریضہ دینی سمجھتے تھے ملک شام کی تو یہ حالت تھی کہ آل رسول ﷺ و علیؑ بتولؑ کا نام بھی نہ سنا تھا بجز اپنے فاتحوں اور خلیفہ وقت کے کسی کو بھی نہ جانتے تھے وہ معاویہ کے سوا کسی کو رسول ﷺ کا قریبی رشتہ دار نہ جانتے تھے۔

لطیفہ:

ایک شامی گروہ بیٹھا علیؑ کی بابت گفتگو کر رہا تھا اپنے اپنے خیالات کا اظہار ہو رہا تھا سامنے سے ایک بوڑھا شامی نمودار ہوا سب نے اس کو بلایا کہ یہ زندہ تاریخ اور بوڑھا آدمی ہے اس سے پوچھیں بوڑھا بولا ہاں ہاں میں خوب علیؑ سے واقف ہوں علیؑ، فاطمہؑ کا باپ عائشہ کا بیٹا تھا مکہ کے اونٹ چرا کر مدینہ میں بیچتا تھا اور رسول ﷺ کے ساتھ جنگ احد میں مارا گیا۔[1]

جواب شبہ:

مانا کہ بصرہ اور کوفہ میں جناب امیرؑ کی فتوحات اور خلافت میں قوم ان سے اور ان کی اولاد سے روشناس ہو گئی تھی لیکن چند روز کے لیے جمل و نہروان و صفین کی لڑائیوں سے علیؑ و اولاد علیؑ کے کمالات کا اظہار کیوں کر ہوتا اور کون سا وقت تھا اور جو چند ہستیاں تعلیمات علوی و آئین حیدری سے بہرور ہوئی تھیں وہ سب کی سب صلح امام حسنؑ کے بعد معاویہ کے فولادی شکنجہ میں آ کر قید خانوں کو آباد کیے ہوئے تھیں۔

---

[1]۔ مروج الذہب مسعودی۔

۵۔ فضائل صحابہ اور مدہت اہلبیتؑ رسول ﷺ میں جناب معاویہ نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے ہزاروں جھوٹی روایتیں گڑھوائی تھیں جو تمام اسلامی ممالک میں ممبروں، مسجدوں میں خطیب و امام مسجد کو عام اشاعت کا حکم تھا سمرہ کو صرف ایک حدیث مدہت جناب امیرؑ میں بنانے پر چار لاکھ درہم خزانہ سے عطا ہوئے تھے۔[1] اور ابوہریرہ کو مذمت امیر المومنینؑ میں ایک حدیث گڑھنے پر دو لاکھ درہم کا عطیہ ملا تھا۔[2]

برسوں ہر منبر پر علیؑ کو گالیاں دینا خطیب اپنا فرض سمجھتے تھے جب منظم اموی پروپیگنڈا علیؑ کے خلاف میں ہوا تو جاہل عربوں کی ذہنیت کی کیا حالت ہو گی۔

۶۔ قتل جناب عثمان کا سازشی مجرم جناب امیرؑ کو بنا کر تمام بلاد اسلام میں قاتل خلیفہ رسول ﷺ و داماد رسول ﷺ قرار دے کر پبلک کو مشتعل کر دیا گیا تھا "بی بی نائلہ" زوجہ جناب عمر عثمان کی کٹی ہوئی انگلیاں اور پیراہن خون آلودہ جناب عثمان منبر پر رکھا جاتا اور دس ہزار شامی روزانہ کھڑے ہو کر سینہ زنی اور ماتم کرتے تھے جنگ صفین و جمل کی لڑائیوں میں تمام عرب کو باور کرا دیا گیا تھا کہ علیؑ اور اس کے ساتھی نعوذ باللہ اسلام کے باغی اور قاتلان جناب عثمان ہیں یہاں تک کہ کربلا کے میدان میں سپاہ شام پکار پکار کر کہتی تھی کہ ہم شیعیان عثمان ہیں ان کے خون کا بدلہ لیتے ہیں۔

ابن زیاد کا خط عمر سعد کو کربلا میں اس مضمون کو واضح کرتا ہے کہ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دینا جس طرح سے جناب عثمان کو پیاسا شہید کیا گیا اور سرہائے شہداء و اسراء اہل بیتؑ راہ کوفہ و شام میں خلیفہ وقت کے باغی کہہ کر پکارے جاتے تھے مذکورہ وجوہ کی بنا پر خون امام حسینؑ کی پبلک میں کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے اور کس کو ہمدردی ہو سکتی ہے رسول خدا ﷺ کے صحابی تک نصرت امامؑ سے منہ چرائے بیٹھے رہے جس کا خمیازہ تاراجی مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے وقت مل گیا۔

---

[1]۔ مروج الذہب مسعودی۔

[2]۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔

ہماری سمجھ اس سے قاصر ہے قتل جناب عثمان کا الزام اگر سچا تھا تو جناب امیرؑ کے ہاتھ پر بیعت کیوں کر صحیح ہوئی اور اگر الزام جھوٹا تھا تو مسلمانوں کی خونریزی اور اصحاب رسول ﷺ کی قتل وغارتی پر قرآن مجید کا صریحی کیا فتوی ہے اگر بیعت علیؑ مرتضی کے دھوکے سے ہوگئی تو ان کی وفات پر حضرت امام حسنؑ پر چھ ماہ کے لیے اجماع کیوں کر ہو گیا اور کس لیے خلیفہ بنائے گئے اور جب بعد امیر المومنینؑ خلافت امام حسنؑ برحق تھی تو بیعت کنندوں نے فرزند رسول ﷺ کا ساتھ کیوں نہ دیا اور صلح معاویہ پر کیوں مجبور ہوگئے اور صلح کے بعد امام حسنؑ کو زہر سے شہید کرنے والے کو سزا کسی نے کیوں نہ دی۔

خلیفہ رسول ﷺ حضرت عثمان بن عفان کے قاتلوں کے مطالبہ کے لیے کوفہ وشام وبصرہ ایک کر دیا اور فرزند رسول ﷺ خلیفہ اسلام امام حسنؑ کے قاتل کی تلاش میں ایک نہ نکلا خود مدینہ کی جب یہ حالت ہو تو امام حسینؑ کو مدینے میں بیٹھنے کا مشورہ دینے والے کیا سمجھ کر مشورہ دیتے تھے ایک تاریخ دان ایسے اہم واقعہ سے کب چشم پوشی کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

جنگ کربلا کے ظاہری اسباب

ہوا کیا بنی امیہ کا دست وبازو اور قوی ہو گیا معاویہ شاہی نے عرب کی ذہنیتوں اور روحوں کو تسخیر کر لیا بلا روک ٹوک ایک بھی مذاحم ومانع نہ رہا بس ایک مظلوم، بے یار و مددگار، غریب و محتاج بے بس و بے کس رسول ﷺ کا پیارا حسینؑ ہی باقی رہ گیا تھا۔

اموی دولت و ثروت کے خزانے اڑا رہے تھے عرب کا بچہ بچہ عیش وراحت میں خود فراموش تھا شریعت الہی اور احکام خداوندی پس پشت ڈال دیے گئے تھے شراب کا ساغر ہر وقت گردش میں تھا نماز تک شراب پی کر پرھائی جاتی تھی لونڈی تک امامت کے لیے مسجد میں بھیجی جاتی تھی نردہ شطرنج ہر وقت کا مشغلہ تھا ماں، بہن، بیٹی، کوئی بھی ان شہوت پرستوں سے چھوٹی ہوئی نہ تھی نہ حلال تھا نہ حرام ولید گونر مدینہ کو حکم پہنچتا ہے کہ حسینؑ سے بیعت لو یا سر بھیجو۔[1]

---

[1] طبری۔

سفر امام حسین علیہ السلام

ایک خانہ نشین مظلوم و تنہا کے بس کی کیا بات تھی اس غیور و بہادر خود دار حق کو حق پسند حافظ شریعت وامین امت حسینؑ کے لیے یہی ایک بات رہ گئی تھی کہ اپنی جان دے دیں اور دین الٰہی کو بچالیں۔

امام حسینؑ نے صاف صاف کہہ دیا:

ان کان دين محمد لم يستقر الا بقتلي يا سيوف خذيني

اگر محمد ﷺ کا دین میرے قتل بغیر درست نہ ہو گا تو اے تلواروں تم مجھے لے لو

اور کربلا کے آخری حملے کے وقت حسینی نعرہ یہ تھا۔

الموت اولي من ركوب العار والعار اولي من دخول النار

موت ہر گز ننگ و عار سے ہزار مرتبہ بہتر ہے (بیعت یزید شر ابخوار اور ظالم و ستمگار کی یقیناً ننگ و عار ہے) اور ہر ننگ و عار و ذلت و رسوائی کا (جو کربلا میں وحشی درندوں کے ہاتھوں ہوئیں گوارا کر لینا حسینؑ ایسے باہمت و مستقل مزاج و حافظ دین الٰہی کے لیے سہل و آسان ہے بجائے اس کے کہ جہنم مول لے بس حسینؑ کی شہادت کا یہی فلسفہ تھا۔

اپنے عزیز و اقارب بال بچوں کو مدینہ سے لے کر نکل پڑے اس طرح سے کہ پہلے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا جناب مسلم کے خط کا بھی انتظار نہ کیا اور قید یا قتل ہو جانے کے خوف سے قبر رسول ﷺ کو چھوڑ کر مکہ معظمہ پہنچے وہاں بھی یزیدی جاسوس پہونچ چکے تھے خونریزی کا خوف اور حرمت خانہ کعبہ کی حفاظت سے مجبور ہوئے اور حج کو عمرہ سے بدل کر ۸ ذی الحجہ یوم ترویہ سنہ ۶۰ھ کو کوفہ روانہ ہو گئے۔

تاریخ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر امام حسین علیہ السلام کا ان راستوں سے نہ تھا جدھر سے قافلوں کی آمد و رفت رہتی ہے لیکن ٹھیک پتہ نہیں لگتا کہ کن راستوں سے گزرا ہوا تھا اس لیے کہ چند مقامات کے سوا کسی منزل کا پتہ تاریخ سے نہیں ملتا اور اور کیوں کر صحیح راستہ سفر کا معلوم ہو سکتا ہے جبکہ عمداً پوشیدہ کیا گیا لہذا

جو راستے معین ہوں گے فرضی ہیں لہٰذا نقشہ کربلا معلی میں جو ہم نے تیروں سے نشانات دیے ہیں وہ صرف سمتوں کے نشان ہیں اور مختصر نقشہ صرف کربلائے معلی کے جائے وقوع کو بتاتا ہے۔

نقشہ

بحساب اہل تنجیم حجاز کا طالع عقرب ہے اور بابل کا طالع حمل ہے مکہ معظمہ پر زحل مستولی ہے اور کوفہ پر مشتری عرض بلد کا ۳۲ درجہ اور طول بلد ۲/۱ ۴۴ درجہ ہے اور کربلائے معلی کا عرض بلد ۳/۲ ۳۲ اور طول بلد ۴۴ درجہ ہے اور کربلا بغداد سے ۵۹ میل اور کوفہ سے ۳۳ میل کی مسافت پر ہے۔

عراق عرب کا طول عبادان سے موصل تک ہے اور عرض قادسیہ سے حلوان تک ہے جو فرات اور دجلہ سے محصور ہے فرات کا طول ۱۸۰۰ میل ہے اور دجلہ کا طول ۱۲۰۰ میل ہے (ٹرکی کی جغرافیہ کی بنا پر) فرات آرمینیا کے پہاڑ سے نکل کر خلیج فارس میں گرتا اور دجلہ بھی جبال آرمینیا سے نکل کر نہر فرات میں گرتا ہے واضح رہے کی طول عراق کا قدیم جغرافیہ سے ہم نے لکھا ہے اور اس طول و عرض حدود میں مملکتوں کے ہمیشہ اختلاف ہوتا رہتا ہے۔

شہادت حضرت مسلمؑ

جناب مسلم خاص اسی تاریخ ابن زیاد گورنر کوفہ کے حکم سے شاہی محل کی چھت سے ڈھکیل کر شہید کر دیے گئے جناب ہانی حسینؑ کے ناصر کی بھی یہی گت کی گئی سر کاٹ کر یزید کو شام میں بھیج دیے گئے۔

حالات تاریخ ہائے ماہ محرم اور ورود امامؑ

امام حسینؑ اپنے ننھے ننھے بچوں اور عورتوں کے لیے عرب کی ریگستانی تپتی ہوئی زمین کو طے کرتے ہوئے ۲ محرم سہ ۶۱ھ کو کربلائے معلی پہونچ گئے اور تیسری محرم کو عمر سعد یزیدی فوج کا کمانیر چار ہزار سواروں کے ساتھ کربلا کوفہ سے آگیا اور اپنا خیمہ فرات کے اس پار مشرقی سمت میں نصب کیا۔[1]

اور ابن زیاد چوتھی محرم کو افواج کوفہ سے بھیج کر خود بھی کوفہ سے کربلا کی سمت روانہ ہوا اور بمقام نخیلہ جو کربلا سے نو کوس تخمیناً واقع شام کی سمت خیمہ زن ہوا۔[2]

۱۔ مقتل ابو مخنف۔

۲۔ امالی شیخ صدوق۔

اور خیام حسینیؑ فرات سے اکھاڑ کر دور نصب کرائے گئے ساتویں تاریخ سے حسینؑ اور ان کے اطفال پر پانی بند کر دیا نویں تاریخ تک یزیدی سپاہ بر اویت ابی مخنف ایک لاکھ بیس ہزار سوار و پیادہ جمع ہو گئے اور فرزند رسول ﷺ کی فوج میں کل نفوس ایک ہزار سوار اور ایک سو پیادہ تھے شب شہادت آپ نے سب کو رخصت کر دیا لیکن جن صفدر وصف شکن جان نثاروں نے ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا تھا اور آخر وقت تک امام علیہ السلام کے ساتھ رہے وہ ایک سو پنتالیس نفر تک کہے گئے ہیں۔

افسران فوج یزید مع تعداد افواج باختلاف روایات

نمبر شمار	اسم افسر	تعداد فوج	نمبر شمار	اسم افسر	تعداد فوج
۱۔	عمر ابن سعد بن وقاص	۴۰۰۰ سوار	۱۲۔	زبیدی	۵۰۰ سوار محافظ فرات
۲۔	ابن نوفل	۱۰۰۰ سوار	۱۳۔	محکم بن طفیل	۲۰۰۰ سواروں سے
۳۔	ابن قدار باہلی	۹۰۰۰ سوار	۱۴۔	طارق بن ابی ظبیان	شہد کے سر کوفہ سے شام لے گیا۔
۴۔	اعور اسلمی	۴۰۰۰ فرات روکنے کے لیے	۱۵۔	زہیر بن قیس	شہد کے سر کوفہ سے شام لے گیا۔
۵۔	درید غلام عمر سعد	علمدار لشکر	۱۶۔	بشر ابن مالک	شہد کے سر کوفہ سے شام لے گیا۔
۶۔	شمر بن ذی الجوش صبابی	میسرہ لشکر کا کماندار	۱۷۔	ابو بردہ بن عوف ازدی	شہد کے سر کوفہ سے شام لے گیا۔
۷۔	شیث ابن ربعی	۴۰۰۰ سوار	۱۸۔	خولی بن یزید اصبحی	نیزے پر سر امام رکھا
۸۔	عامر بن صریمہ تیمی	۶۰۰۰ سوار	۱۹۔	حر بن یزید ریاحی	ایک ہزار سواروں سے امام کو روکا بعد میں امام پر نثار ہوئے۔
۹۔	عبد الرحمن بن ہبیرہ جعفی	جاسوس	۲۰۔	حجر بن ابجر	۴۰۰۰ سوار
۱۰۔	عروہ بن قیس احمصی	افسر سوار	۲۱۔	اسحاق بن حشوہ	۲۰۰۰ سوار
۱۱۔	عمر بن حجاج	میمنہ لشکر کا کماندار	۲۲۔	ازرق شامی	۴۰۰ سوار محافظت فرات کے لیے۔

شہداء کربلا کی تعداد میں اور ان کے اسماء میں بھی سخت ترین اختلاف ہے مشہور بہتر ہیں لیکن ہم نے صرف ۸۴ شہیدوں کے نام لکھے ہیں جن پر مورخین کا اتفاق ہے۔ واللہ یعلم

دسویں رات فرزند رسول ﷺ نے عبادت الٰہی میں بسر کی بعد فراغ نماز صبح جنگ شروع ہوئی اور چھ مہینہ کا شیر خوار بچہ تک حسینؑ کا شہید ہو گیا بوقت عصر شمر نے چراغ ہدایت گل کر دیا اور سر اقدس تن

سے جدا کر کے نوک نیزہ پر بلند ہوا خیام فلک احتشام لوٹ لیے گئے اور آگ لگا دی گئی اس طرح نبی کی اولاد کا خاتمہ کر دیا گیا۔ یہ خلاصہ شہادت امام مظلوم تھا شہیدوں کی فہرست و نقشہ جنگ ملاحظہ ہو۔

شہداء راہ خدا (روحي لهم الفداء) باختلاف روایات

نمبر شمار	شہداء راہ خدا	ولدیت	قاتل	نمبر شمار	شہداء راہ خدا	ولدیت	قاتل
۱۔	سید الشہداءؑ	علی مرتضیٰؑ	شمر بن ذی الجوش صبابی	۲۔	علی اکبرؑ	امام حسینؑ	مرہ بن منقذ بن نعمان عبدی حصین بن نمیر
۳۔	علی اصغرؑ	امام حسینؑ	حرملہ بن کاہل اسدی	۴۔	عبداللہ	علی مرتضیٰ	ہامی بن ثبیت حضرمی
۵۔	ابو الفضل عباس	علی مرتضیٰؑ	یزید بن وقار جہنی حکیم بن طفیل طائی	۶۔	جعفرؑ	علی مرتضیٰؑ	ہانی بن ثبیت حضرمی
۷۔	عثمانؑ	علی مرتضیٰؑ	خولی بن یزید اصبحی ایادی الدارمی	۸۔	محمدؑ	علی مرتضیٰؑ	ایادی الدارمی
۹۔	ابو بکرؑ	امام حسنؑ	عبد اللہ بن عتبہ غنوی	۱۰۔	عبداللہؑ	امام حسنؑ	حرلہ بن کاہل اسدی
۱۱۔	قاسمؑ	امام حسنؑ	عمر بن سعد بن عروۃ بن نفیل ازدی	۱۳۔	عونؑ	عبداللہ	عبداللہ بن قطبہ بن ہانی
۱۳۔	عونؑ	عبداللہؑ بن جعفر طیار	عبد اللہ بن قطبہ بن ہانی	۱۴۔	محمدؑ	عبداللہ بن جعفر طیار	عامر بن سہل تمیمی
۱۵۔	عبد الرحمنؑ	عقیل	عمر بن صبیح صیدادی	۱۶۔	ابی عبداللہ	مسلم بن عقیل	عمر بن صبیح صیدادی
۱۷۔	محمد	ابو سعید بن عقیل	لقیط بن ناشر جہنی	۱۸۔	سلیمان	غلام امام حسینؑ	
۱۹۔	قبیح			۲۰۔	مسلم	ابن عوسجہ اسدی	عبداللہ صبابی، عبداللہ بن خشکارہ بجلی
۲۱۔	سعد	عبداللہ جعفی		۲۲۔	بشر	عمر بن خضرمی	
۲۳۔	علی یزید	حصین ہمدانی		۲۴۔	عمر	کعب انصاری	
۲۵۔	نعیم	عجلان انصاری		۲۶۔	زہیر	قین بجلی	کثیر بن عبداللہ شعبی
۲۷۔	عمر	قرطہ انصاری		۲۸۔	حبیب	مظاہر اسدی	
۲۹۔	حُر	یزید ریاحی		۳۰۔	عبداللہ	عمر کلبی	سالم غلام بن زیاد
۳۱۔	ہلال	نافع بجلی مروی		۳۲۔	انس	کاہل اسدی	
۳۳۔	قیس	مسہر صیدادی	حصین بن تمیم	۳۴۔عبداللہ	عروہ بن حراق غفاری		

نمبر شمار	شہداء راہ خدا	ولدیت	قاتل	نمبر شمار	شہداء راہ خدا	ولدیت	قاتل
۳۵۔	عبدالرحمن	عروۃ بن حراق غفاری		۳۶۔	جون	غلام ابوذر غفاری	
۳۷۔	شبیب	عبداللہ نہشلی		۳۸۔	حجاج	زید سعدی	
۳۹۔	کراوس	زہیر ثعلبی		۴۰۔	قاسط	زہیر ثعلبی	
۴۱۔	کنانہ	عتیق		۴۲۔	حزغانہ	مالک	
۴۳۔	عمر	ضبیعہ ضبعی		۴۴۔	یزید	ثبیت قلیسی	
۴۵۔	عبداللہ	یزید بن ثبیت قلیسی		۴۶۔	عبداللہ	یزید بن ثبیت قلیسی	
۴۷۔	عامر	ابن مسلم		۴۸۔	تعشب	عمرو التمری	
۴۹۔	مولی عامر	مسلم		۵۰۔	سیف	مالک	
۵۱۔	زہیر	بشر خثعمی		۵۲۔	زید	معقل جعفی	
۵۳۔	حجاج	مسروق جعفی		۵۴۔	مسعود	حجاج	
۵۵۔	یسر	مسعود بن حجاج		۵۶۔	مجمع	عبداللہ عائدی	
۵۷۔	عمار	حسان بن خریج طائی		۵۸۔	حیان	عارث سلیمان ازدی	
۵۹۔	جندب	حجر خولانی		۶۰۔	عمیر	خالد صیدادی	
۶۱۔	سعید	غلام عمر بن خالد		۶۲۔	یزید	زیاد بن مظاہر کندی	
۶۳۔	حوی	مالک ضبعی		۶۴۔	زاہر	غلام عمو بن حمقق خزعی	
۶۵۔	جنابد	علی بن شیبانی		۶۶۔	سالم	غلام بن مدینہ کلبی	
۶۷۔	اسلم	کثیر ازدی اعرج		۶۸۔	زہیر	سلیم ازدی	
۶۹۔	قاسم	حبیب ازدی		۷۰۔	عمر	جندب خضرمی	
۷۱۔	ابی تمامہ	عمر بن عبداللہ صیدادی		۷۲۔	حنظلہ	اسعد سیبانی	
۷۳۔	عبدالرحمن	عبداللہ بن کوراز جنی		۷۴۔	عمار	ابی سلامہ ہمدانی	
۷۵۔	عالس	ابی شبیب شاکری		۷۶۔	شوذب	غلام شاکر	
۷۷۔	شبیب	حارث بن سریع		۷۸۔	مالک	عبداللہ بن سریع	
۷۹۔	سوار	ابی حمیر نہمی ہمدانی		۸۰۔	عمر	عبداللہ جندعی	
۸۱۔	جابر	عروہ غفاری		۸۲۔	وہب کلبی	عبداللہ بن عمیر	
۸۳۔	بریر	خضیر ہمدانی	مسر بن اوس حلبی، کعب بن جابر ازدی	۸۴۔	ام وہب	زوجہ عبداللہ بن عمیر	رستم غلام شمر

نقشہ معرکہ کربلا
شمال
نوٹ:- واضح ہو کہ افواج شام تمام سڑکوں
کو کربلا کے روکے ہوئی تھیں اور خیام امامؑ
کو ہر سمت سے محصور کیے ہوئے تھیں۔
فرات
راہ کوفہ
روضہ حضرت
عباسؑ
مشرق
مغرب
میدان القتال
روضہ امام حسینؑ
خیمہ حضرت
حرؑ
خیمہ حضرت حرؑ
جانب
مغرب
زہیر قین
فوج حسینی
خیام ملک احتشام امام حسینؑ
یہاں زینب خاتون
بار بار تشریف لا کر بھائی
کا حال دریافت کرتی
تھیں
خندق
جنوب
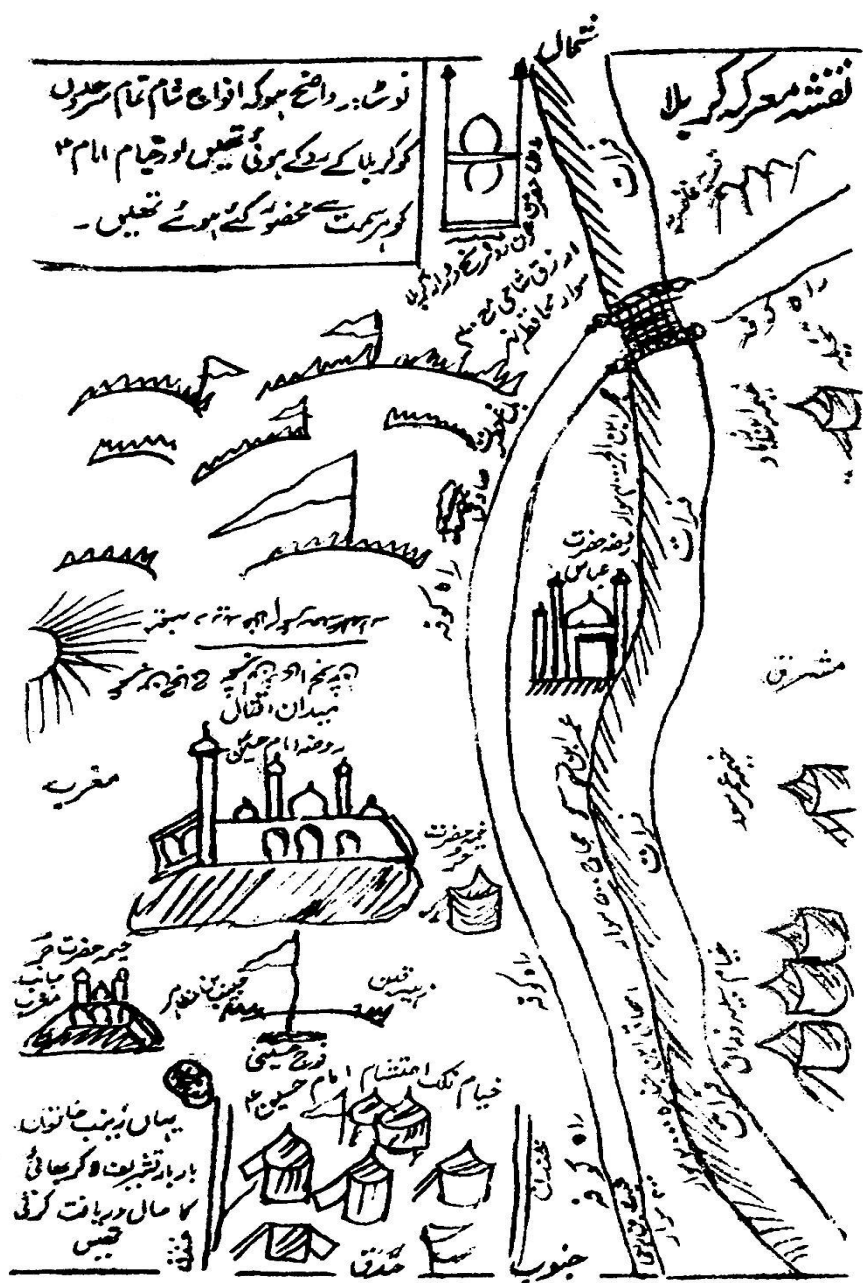
شہادت کے بعد اہم تاریخی واقعات

سب سے پہلا زائر

قبر حسینؑ کا صحابی رسول ﷺ جابر بن عبد اللہ انصاری ہیں جنہوں روز اربعین نبی زادے کی قبر کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔

پہلی صدی:

پہلی ہی صدی میں جناب محمد بن ابراہیم بن مالک اشتر نے ایک مختصر حجرہ قبر اطہر پر تعمیر فرمایا لیکن وہ حجرہ اور نشان قبر اطہر تھوڑے ہی عرصہ بعد مٹا دیا گیا مومنین نے ایک بیری کا درخت قریب قبر اطہر لگا کر اس امام مظلوم کی قبر کا نشان قائم کیا۔

دوسری صدی:

خلیفہ عباسی ہارون رشید نے وہ بیر کا درخت کٹوا کر قبر حسینؑ پر ہل چلوا دیے اور یہی زمانہ شروع آبادی کربلا معلی کا ہے اس وقت بھی مومنین نے مخفی قبر مطہر کا نشان بنا دیا تھا۔

تیسری صدی:

۲۳۶ھ میں متوکل شاہ عباسی نے "دیرج" یہودی کو بربادی قبر حسینؑ پر مامور کیا زمین پر ہل چلائے نہر فرات کاٹ کر قبر حسینؑ کو غرق کر دینا چاہا لیکن معجزات قبر مطہر کے ظہور سے یہوری مذکور نے بے ادبی سے گریز کی اسی زمانے میں زائرین کے سخت سزائیں اور بندشیں کی گئیں اور بار بار قبر اقدس کے مٹانے کی کوششیں ہوئیں سہ ۲۴۷ھ میں منتصر باللہ نے اپنے باپ متوکل کو قتل کر دیا اور تجدید روضہء اقدس کی گئی۔

چوتھی صدی:

سنہ ۳۵۲ھ میں معز الدولہ نے عزائے امام مظلوم مین عام اجازت ہی نہیں دی بلکہ خود نوحہ و ماتم و سوگواری کو ترقی دی ایام محرم میں بازار بند کرائے حکومت آل ایوب تک نے روز بروز عزائے امام میں ترقی ہوئی لیکن آل ایوب نے مروان کی پیروی سے پھر بندشیں عائد کیں لیکن معز الدولہ، رکن الدولہ، عضد الدولہ نے روضہء مقدسہ کی از سر نو تعمیر کی اور شہدائے کربلا کے مزاروں کی تزئین ہوئی اور امام علیہ

السلام کے نام سے ایک خزانہ قائم کیا گیا اسی صدی میں کثرت سے لوگوں نے کربلا معلی کی مجاورت اختیار کی اور شہر کی آبادی بڑھ گئی بنی ہاشم میں سب سے پہلے اولاد جناب عباس اور اولاد امام موسیٰؑ بن جعفرؑ اور اولاد جناب جعفر طیار نے کربلا کی مجاورت اختیار کی۔

پانچویں صدی:

عربوں نے کربلا معلی میں تاخت کی لیکن سیف الدولہ نے حلہ سے فوج بھیج کر مفسدوں کو قتل کیا۔

چھٹی صدی:

سنہ ۵۴۸ھ میں مسترشد خلیفہ عباسی نے خزانہ حضرت کا لوٹ لیا اور اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا لیکن اس لوٹ کے بعد مسترشد مع اپنے پسر کے راستے میں قتل ہو گیا۔

آٹھویں صدی:

سلطان محمد خدا بندا نے خُداموں کو روضہ ءاقدس کے وظائف مقرر کیے سہ ۷۹۵ھ میں سلطان احمد والی عراق نے عراق کو لوٹ لیا لیکن امیر تیمور نے اپنی فوج لے کر مقابلہ کیا اور شکست دی اور مال عراق کا واپس لیا۔

دسویں صدی:

سنہ ۹۱۴ھ میں شاہ اسماعیل صفوی نے روضہ ءمقدسہ امام حسینؑ اور روضہ ءعباس کی تعمیر کی اور قندیلہائے طلائی آویزاں کیں ضریحیں بنوائیں اور سہ ۹۵۷ھ میں نہر کربلائے معلی کی تعمیر کی۔

گیارھویں صدی:

شاہ عباس صفوی نے کاشی کی اینٹیں ضریح اقدس میں لگائیں۔

تیرھویں صدی:

میں عبد الوہاب نجدی نے کربلائے معلی پر حملہ کیا ضریح اقدس توڑ ڈالی اور قتل عام کیا سلطان روم وخدیو مصر نے اپنے افواج بھیج کر اس سرکش کو شکست فاش دی۔

سنہ ۱۲۶۳ھ میں حضرت جد علام سید العلماء علیین مکان جناب سید حسین طاب ثراہ نے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ حجت الاسلام آقا شیخ محمد حسن نجفی مصنف جواہر الکلام کو بھیج کر نہر آصفی تعمیر کرائی اور دیوار شہر نجف اشرف دوبارہ پندرہ ہزار روپیہ بھیج کر روضہ ء حضرت مسلم و حضرت ہانی کی تعمیر کرائی اور نجف اشرف میں قناتی کنویں بنوائے اور مبلغ تیس ہزار روپیہ حجت الاسلام آقا سید ابراہیم قزوینی کو بھیجا تعمیر ایوان طلائی حضرت عباس کے لیے اور ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ واسطے تعمیر نہر حسینیؑ کے سنہ ۱۲۸۲ھ میں ناصر الدین شاہ قاچار مرحوم نے روضہ ء اقدس امام کی مزید تزئین کی اور سنہ ۱۲۹۵ھ میں در قبلہ امام حسینؑ پر سونا چڑھایا گیا اور روضہ ء کی جابجا سے مرمت ہوئی آینہ بندی کی گئی اور کاشی کی اینٹیں لگیں۔

چودھویں صدی:

روضہ ء امام علیہ السلام اور روضہ ء حضرت ابو الفضل العباسؑ کے پھاٹکوں پر دو گھڑیاں نصب ہوئیں اور روضہ ء حضرت عباس کی توسیع ہوئی اور چھوٹی چھوٹی برجیاں بنائی گئیں۔

احمد النقوی

مورخہ ۵ مئی سنہ ۱۹۳۵ھ

شہید انسانیت

تالیف: آیت اللہ سید علی نقی نقوی المعروف نقن صاحب

- تمثال مبارک مؤلف کتاب "شہید انسانیت"
- مؤلف کے بارے میں
- کتاب کے بارے میں
- متن کتاب
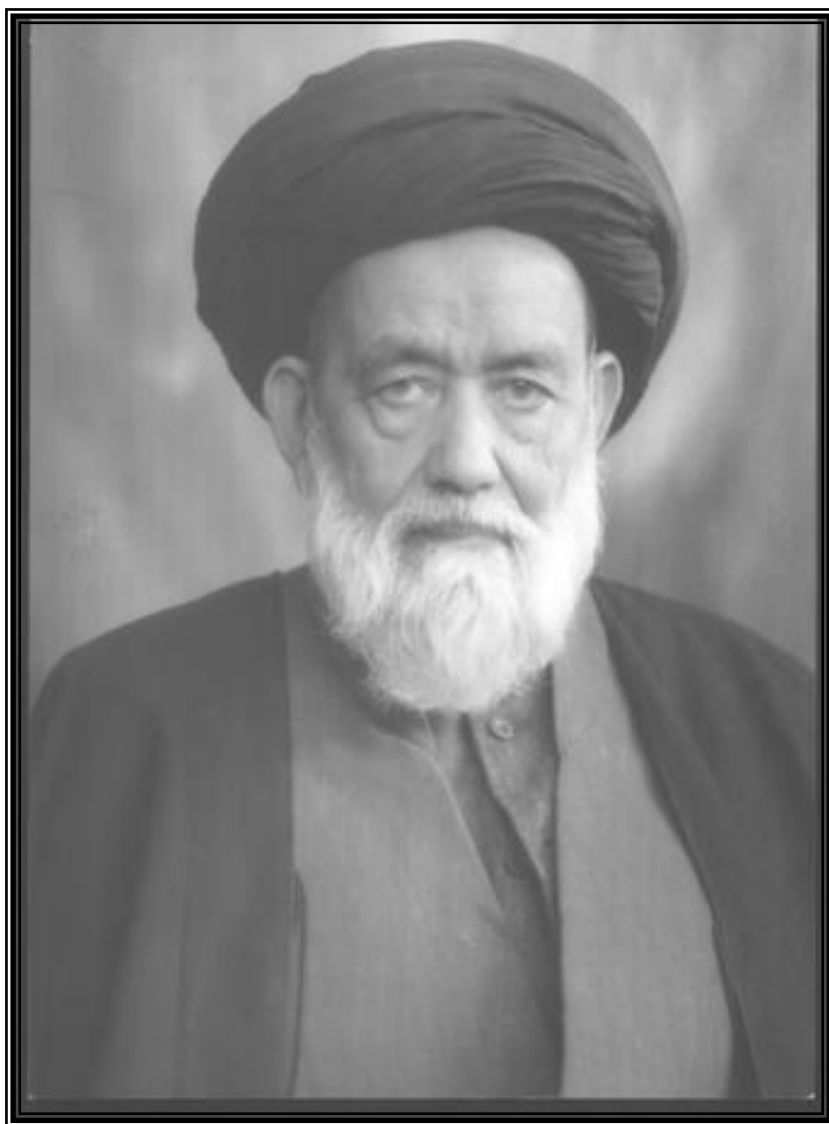
تمثال مبارک مؤلف کتاب "شہید انسانیت"

☙ از قلم: علامہ سعید اختر رضوی گوپال پوری مرحوم

مؤلف کے بارے میں

سید العلماء سید علی نقی جناب ممتاز العلماء ابو الحسن (منن صاحب) کے فرزند تھے۔[1] جو شمس العلماء سید ابراہیم بن جنت مآب سید تقی بن سید العلماء سید حسین علیین مکان ابن غفران مآب دلدار علی کے فرزند تھے۔ مولانا سید علی نقی ۲۶/رجب ۱۳۲۳ھ /۱۹۰۵ء کو لکھنو میں متولد ہوئے۔ ابھی آپ کی عمر ۳-۴ سال کے درمیان تھی کہ آپ کے والد ماجد ۱۳۲۷ھ میں مع متعلقین تکمیل علوم کے لئے نجف اشرف تشریف لے گئے۔ آپ کی عمر ۹/برس کی تھی جب ۱۳۲۳ھ میں آپ کے والد گرامی ہندوستان واپس آئے۔

اس وقت تک آپ کی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں ختم ہو چکی تھیں۔ لکھنو واپس آکر آپ کے والد صاحب طاب ثراہ نے آپ کی تعلیم اپنے ذمے رکھی۔ والد کی علالت کے زمانے میں آپ کے برادر معظم مولانا سید محمد عرف میرن صاحب آپ کو پڑھاتے تھے۔ سرکار سید العلماء نے مدرسہ ناظمیہ اور سلطان المدارس دونوں جگہ داخلہ لیا۔ مدرسہ ناظمیہ کے فاضل اور سلطان المدارس کے سند الافاضل کا ایک ہی ساتھ امتحان دیا۔

پھر دوسرے سال دونوں درجوں کے ضمیموں کا اور تیسرے سال ممتاز الافاضل اور صدر الافاضل کا ایک ہی ساتھ امتحان دیا اور اس ذیل میں نجم الملۃ اور جناب باقر العلوم دونوں سے تلمذ حاصل ہوا۔ عربی ادب میں آپ کی مہارت اور فی البدیہہ قصائد و مراثی لکھنے کے اسی دور میں بہت سے مظاہرے ہوئے اور عربی شعر وادب میں آپ کے اقتدار کو شام و مصر و عراق کے علماء نے قبول کیا۔ علامہ امینی (صاحب

---

[1]۔ سید العلماء کے مفصل حالات اور اجازہ اجتھادوروایت دیکھنے کے شائقین مجلہ میراث برصغیر شمارہ ۱۔۲ سید العلماء نمبر کی طرف مراجع فرمائیں سر دست، ہم جناب علامہ سعید اختر رضوی کی کتاب خورشید خاور سے یہ حالات لکھ رہے ہیں۔

الغدیر) نے آپ کا ایک قصیدہ (الغدیر) میں شامل کیا ہے۔ اور آغائے بزرگ تہرانی طاب ثراہ نے شیخ طوسی کے حالات کو آپ کے لکھے ہوئے مرثیے پر ختم کیا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی سرفراز لکھنو، الواعظ لکھنو اور شیعہ لاہور میں آپ کے علمی مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ اور ۳-۴ کتابیں بھی عربی اور اردو میں اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔ تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کچھ عرصے تک بحثیت مدرس ناظمیہ میں بھی معقولات کی تدریس کی اس دور کے شاگردوں میں مولانا محمد بشیر صاحب فاتح ٹیکسلا۔ علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری اور جناب حیات اللہ انصاری شامل تھے۔

سفر عراق

سید العلماءؒ ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں تکمیل علم کے لئے عراق تشریف لے گئے۔ قیام عراق کا پانچ سالہ دور مرحوم کا ایک زریں باب ہے۔ ان پانچ برسوں میں آپ نے فقہ واصول میں وہ ملکہ پیدا کیا کہ اس دور کے ۳/ مجتہدین یعنی آیۃ اللہ اصفہانی آیۃ اللہ نائینی اور آیۃ اللہ سید ضیاء الدین عراقی نے آپ کو واضح الفاظ میں اجازہای اجتہاد دیئے۔ علم کلام اور دفاع مذہب میں آپ کی مہارت کا لوہا سید محسن امین عاملی، شیخ جواد بلاغی محمد حسین کاشف الغطاء اور سید عبد الحسین شرف الدین موسوی نے مان لیا۔

نجف میں عربی تصانیف

نجف میں پہنچ کر سب سے پہلے جو کتاب آپ نے تصنیف کی وہ وہابیت کے خلاف تھی جو بعد میں کشف النقاب عن عقائد عبد الوہاب کے نام سے شائع ہوئی۔ عراق وایران کے مشہور اہل علم نے اس کتاب کو ایک شاہکار قرار دیا۔ دوسری کتاب (اقالۃ العاثر فی اقامۃ الشعائر) ماتم وغیرہ کے جواز میں۔ تیسری کتاب "السیف الماضی علی عقائد الاباضی" خوارج کی رد میں چار سو صفحہ کی کتاب ہے۔

پانچ سال بعد رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ میں جب سید العلماء ہندوستان واپس آئے تو مندرجہ بالا تین مراجع تقلید کے علاوہ دوسرے مجتہدین کبار نے بھی آپ کو اجازہ ہائے اجتہاد دیئے تھے۔ مثلاً آیۃ اللہ شیخ عبد الکریم یزدی حائری (مؤسس حوزہ علمیہ قم) آیۃ اللہ محمد حسین اصفہانی، آیۃ اللہ ابراہیم معروف بہ مرزا

آقائے شیرازی، آیت شیخ ہادی کاشف الغطاء، آیت اللہ میرزا علی یزدانی، آیت اللہ شیخ محمد حسین تہرانی، آیت اللہ شیخ کاظم شیرازی، آیت اللہ میرزا ابوالحسن مشکینی، اور آیت اللہ سید سبط حسن مجتہد۔

سید العلماءؒ نے علم تفسیر اور علوم قرآن نیز عقائد اور علم کلام سے متعلق جو تحقیقی تصانیف اردو میں لکھے ہیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔

وہابیت کے خلاف تحریک:

جب وہابیوں نے حجاز پر اپنا تسلط قائم کیا اور ۱۹۲۵ء میں اہل بیت اطہارؑ، ازدواج نبی، اور صحابہ کبار کے مزارات کو منہدم کر دیا۔ اس وقت ہندوستان کے تمام مسلمانوں خصوصا شیعوں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ فرنگی محل میں انجمن خدام الحرمین قائم ہوئی۔ شیعوں کی طرف سے سرکار نجم الملۃ کی سرپرستی میں وہابیت کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی اس میں سید العلماء اپنے استاد کے قوت بازو تھے۔ اس سلسلہ میں جو کتابیں اپیلیں اور مضامین لکھے گئے۔ ان کا ذکر اس مضمون کو بہت طویل کر دے گا۔

امامیہ مشن

۱۳۵۰ھ میں آپ کی تشریف آوری کے بعد سید ابن حسین صاحب نقوی مرحوم نے امامیہ مشن کی بنیاد رکھی۔ جس کا خاص مقصد تھا سید العلماء کی اردو کتابوں اور تحریروں کی نشر و اشاعت۔ ابتدائی دور میں اس میں بہت ہی وقیع اور موقر کتابیں شائع ہوئیں۔ اگر چہ آخری دور میں یہ سلسلہ ۸۔۸۔ اور ۱۶۔۱۶ صفحات کے مختلف پمفلٹوں کی اشاعت تک محدود ہو گیا۔

یادگار حسینی (اور کتاب شہید انسانیت کی تالیف)

۱۳۶۱ھ میں امام حسینؑ کی شہادت کو ۱۳۰۰ سال پورے ہو رہے تھے۔ اس مناسبت سے دو، تین سال قبل سے آپ نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں یہ تحریک پھیلائی کہ ۱۳۶۱ھ میں یادگار حسینی اس طرح منائی جائے کہ جس میں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں کو شریک کیا جائے۔ اور وہ لوگ امام حسینؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کریں۔ یادگار حسینی کا ایک سب سے بڑا منصوبہ واقعہ کربلا پر ایک مبسوط کتاب شائع کرنا

تھا۔ اس کتاب کی تدوین کے لئے ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل کی گئی۔ لیکن غیر منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ممبران بورڈ کا اجتماع عملاً غیر ممکن ثابت ہوا۔ آخر میں سید العلماء نے ایک میٹنگ میں جس میں صرف چند حضرات شریک تھے۔ یہ صورت تجویز کی کہ وہ کتاب لکھ کر بورڈ کی میٹنگ میں استصواب کے لئے پیش کر دیں۔

ربیع الاول ۱۳۶۴ھ (فروری، مارچ ۱۹۴۵ء) میں اس کتاب کا مسودہ طبع کرا کے بورڈ کے ممبران کے پاس بغرض استصواب بھیجا گیا۔ ادارہ یادگار حسینی لکھنو نے اس ضمن میں ایک فیصلہ یہ کیا کہ اس مسودہ شہید انسانیت کے بچے ہوئے نسخوں کو قیمتاً عام پبلک کو فروخت کیا جائے۔ مقصد چاہے نیک رہا ہو لیکن اس اقدام نے قوم میں انتشار اور افتراق پیدا کر دیا۔ مسودہ شہد انسانیت کی مخالفت ہوئی اور کھل کر ہوئی۔ قضیہ اس حد تک بڑھا کہ چالیس چالیس برس کے نکاح طلاق کا شکار ہو گئے۔ بیٹا باپ کا اور بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا۔ یہ وہ ہنگامہ خیز دور تھا جب ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اور آخر کار ۱۵/ اگست کا ہندوستان اور پاکستان تقسیم ہو گئے۔

لیکن قوم کی تمام تر توجہ شہید انسانیت کے حق یا باطل ہونے پر مرتکز رہی۔ علمی مسائل میں اختلافات خود شہر لکھنو میں پہلے بھی اٹھتے رہے تھے۔ لیکن وہ مناظرہ یا ردو قدح تحریر ہوئی تھی اور وہ بھی اکثر فارسی زبان میں۔ اس لئے عوام الناس تک اس کا اثر بہت زیادہ نہیں پہونچتا تھا۔ شہید انسانیت کے سلسلے میں ایک قیامت یہ ہوئی کہ منبر کو میدان مناظرہ اور عوام الناس کو علمی مسائل کا قاضی بنا دیا گیا۔ اور اس طرح یہ آگ بیسوں برس تک بھڑکتی رہی۔ میرا مقصد اس تحریر سے شہید انسانیت کی تائید یا تردید نہیں ہے۔ میں صرف اس تکلیف دہ صورت حال کا تذکرہ کر رہا ہوں جو اس قضیے سے پیدا ہو گئی تھی۔

خطابت

سید العلماء کی خطابت کا ایک خاص رنگ تھا جو عبارت آرائی و سستی نکتہ آفرینی کے بجائے علم اور تحقیق پر مبنی تھا۔ اور ایک گھنٹہ کی مجلس میں حقائق کے کتنے دروازے وا ہو جاتے تھے ان کی تقریر اور تحریر میں بہت

کم فرق ہوتا تھا۔ دوسری خاص بات ان کی تقریروں میں یہ تھی کہ کہ ہر مذہب وملت کا ماننے والا اسے اطمینان قلب کے ساتھ سن سکتا تھااور فیض یاب ہو سکتا تھا۔ کسی جملہ سے کسی کی دل آزاری کا خطرہ نہیں تھا۔

لکھنو یونیورسٹی

عراق سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۳۲ء میں آپ لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے وابستہ ہوگئے اور ستائیس برس تک طلباء کو فیض پہنچاتے رہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی

۱۹۵۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کو شیعہ دینیات کے شعبے میں بحیثیت ریڈر مدعو کیا اور آپ علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ پھر آپ شیعہ دینیات کے پروفیسر بنائے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے علی گڑھ ہی میں سکونت اختیار کرلی۔ ۱۹۷۷ء میں لکھنو کے کچھ شر پسندوں نے آپ کے لکھنو کے مکان میں آگ لگادی۔ جس میں ہزاروں قیمتی کتابیں جل کر راکھ ہوگئیں۔ اس میں آپ کے عربی تصانیف کے غیر مطبوعہ مسودات بھی تلف ہوگئے جن کا ان کو آخر عمر تک صدمہ رہا۔

وفات

آپ نے یکم شوال روز عید الفطر ۱۴۰۸ھ / ۱۸ مئی ۱۹۸۸ء کو لکھنو میں رحلت فرمائی۔ اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔

تصانیف

سید العلماء کی تصانیف ایک سو اکتالیس کتابوں اور کتابچوں پر مشتمل ہے۔ بخوف طول اسے نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ شائقین مزید وضاحت کے لیے "مجلہ برصغیر کے شمارہ اول دوم سید العلماء نمبر" کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔ [1]

[1] ۔ خورشید خاور تذکرہ علماء ہند و پاک، ص ۲۶۳- ۲۶۸۔ (سید العلماء کے حالات وآثار کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے (مجلہ میراث برصغیر شمارہ ا و ۲ سید العلماء نمبر) کی طرف مراجعہ فرمائیں۔

کتاب کے بارے میں

ہر قوم وملت کے دانشوروں اور علماء کے درمیان ہر زمانہ میں فکری اختلاف موجود رہا ہے اور رہے گا۔ یہ اختلاف فکری در حقیقت فطری اختلاف ہے۔ ان کا انکار فطرت کا انکار ہے۔ البتہ کچھ مفاد پرست عناصر ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ دیگر ادیان کو چھوڑ کر صرف دین اسلام میں ۷۳ نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں فرقوں کا وجود اور ایک دوسرے سے نفرت و فتاوی تکفیر اس کی بہترین دلیل ہے۔

برصغیر میں برادران اہل سنت کے داخلی فرقوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ البتہ اہم ترین فرقوں کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے کے لیے متعدد کتب تحریر کی جاچکی ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب ''ادیان باطلہ اور صراط مستقیم'' ہے۔ جس میں ہر فرقے کے خلاف لکھی جانے والی کتب کی فہرست بھی کسی حد تک موجود ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ دوسرے کو باطل ہی سمجھتا ہے۔

اسی طرح شیعیان برصغیر کے حوالہ سے بھی کچھ تلخ حقائق موجود ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اصولیت اور اخباریت کا ٹکراؤ تھا۔ یعنی جب آیت اللہ العظمیٰ سید دلدار علی غفران مآب کہ جو ابتدا میں اخباری تھے، لیکن جب نجف و کربلاء جاکر آیت اللہ العظمیٰ استاد کل آقای وحید بھبھانی و آیت اللہ العظمیٰ سید مہدی بحر العلوم وغیرہ سے درس حاصل کیا تو واپس آکر اخباریت کے رد میں کام شروع کیا تو علامہ میرزا محمد اخباری مقتول اور آقای دلدار علی غفران مآب کے شاگردوں نے ایک دوسرے کے خلاف خوب لکھا اور یہ سلسلہ سالوں تک جاری رہا۔

پھر خواجہ عابد حسین سہارنپوری مرحوم نے کتاب ''یا علی مدد'' اور رسالہ ''انذار الناذرین'' تحریر فرمایا تو دوسری طرف اصلاح الرسوم کے مصنف جناب مرتضی جونپوری مرحوم نے ایک زمانہ تک ان کے خلاف خوب لکھا اور یہ اختلاف بھی سال ہا سال باقی رہا۔ اور طرفین کے افراد نے دسیوں کتب تحریر کیں۔

اور جب حیدر آباد دکن سے بحث مساوات چلی تو سالوں تک ملت اس میں مصروف رہی اور شیعہ دانشور ایک دوسرے کے خلاف لکھتے رہے آقای غلام حسین صدر العلماء مرحوم قائل نظریہ مساوات اور علامہ لقاء علی حیدری مرحوم وعلامہ اعجاز حسین صدیقی مرحوم وغیرہ نے اس نظریہ کی ڈٹ کر مخالفت کی۔

کتاب شہید انسانیت

۱۳۶۱ھ۔ق۔ میں واقعہ کربلاء کو رونماہوے پورے ۱۳۰۰سو سال گزر رہے تھے، سید العلماء و دیگر علماء نے ارادہ کیا کہ سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی کی مناسبت سے ایک بین الاقوامی طرز تفکر کی ایسی کتاب تحریر کی جاے جس میں دنیاانسانیت کا ہر فرد اس کو پڑھ کر امام حسین کو انسانیت کا نجات دہندہ قبول کرنے پر مجبور ہو جاے، اس منصوبے کی پایہ تکمیل کے لیے کافی نشستوں کے بعد یہ طے ہوا کہ خود بانی تحریک یعنی سید العلماء سید علی نقی نقن صاحب ہی اولا ایک جامع کتاب تحریر کریں، پھر اسے تصویب رای کے کے لیے دیگر اعلام کے پاس بھجی جاے، اور بزرگان کی حتمی نظر کے بعد اس کی عام طباعت کی جاے، اس حوالہ سے نقن صاحب مرحوم نے ۱۲ا۷ صفحات پر مشتمل وزیری سائز میں ایک کتاب تحریر فرمائی جو ایک دباچہ تین حصوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل تھی۔ جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے

دیباچہ: واقعہ کربلاء کا اجمالی خاکہ

حصہ اول: شہید کربلاء کا تعارف (۵ ابواب پر مشتمل)

حصہ دوم: واقعات کربلاء کے اسباب و تفصیلات (۷ ابواب پر مشتمل)

حصہ سوم: واقعہ کربلاء کے نتائج (۱۰ ابواب پر مشتمل)

خاتمہ کتاب: عالم اسلام کو اصلاح عمل اور اتباع اسوہ حسینی کی دعوت۔

اس کتاب کی محدود اشاعت کر کے اس اعلان کے ساتھ اسے اہل قلم تک پہنچادیا گیا۔

اعلان (مخصوص اڈیٹوریل بورڈ کے افراد اور منتخب اہل قلم کے لیے)

لیکن جو حالات شہید انسانیت کی طباعت کے بعد شیعوں میں رونما ہوئے۔ یہ تو ایک لمبی داستان ہے جسے ہم شہید انسانیت کی رد و اثبات میں لکھی جانیں والی تمام تحریرات کو یک جا پیش کرتے وقت تحریر

کریں گے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کتاب "شہید انسانیت" کی پہلی محدود اشاعت کے بعد ایسے قیامت خیز منظر دیکھنے میں آئے کہ برصغیر کی تاریخ میں شیعوں کے ایسے داخلی نزاعات آج تک چشم فلک نے نہ دیکھے ہوں گے۔

سردست ان اختلافات کے خاتمہ کے لیے جو مختلف تدابیر بزرگان تشیع نے پیش کی تھیں۔انہیں یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم یہاں پر اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجاے خود سید العلماء اور دیگر اعلام نے جو کچھ لکھا ہے وہی کافی و شافی ہے۔ سردست اس جگہ پر جناب جعفر شیروانی آف حید رآباد کن کی مرتب کردہ کتاب اظہار حق سے چند بیانات جو خود سید العلماء اور علامہ سید کلاب حسین لکھنوی نے کی قلم سے تحریر ہوئے پیش کئے جاتے ہیں۔

لہذا قارئین ان مطالب کا دقت سے مطالعہ فرمائیں۔

ا۔ بیان بصیرت افروز
جناب عمدۃ العلماء مولانا مولوی سید کلب حسین صاحب قبلہ مجتہد العصر لکھنو[1]
شیعہ کانفرس میں کیاہوا

ایک لابنی چوڑی داستان ہے جو میں زبان قلم سے انصاف پسند ناظرین کے سامنے پیش کر رہاہوں۔ میں جانتاہوں کہ بڑے بڑے صاحبان دولت، ارکان حکومت، شیعہ کانفرس کے کرتا دھرتا اور بعض علماء اور ان

---

[1]۔ عمدۃ العلماء علامہ سید کلب حسین عرف کبن صاحب ولد قروۃ العلماء سید آقا حسن شعبان ۱۳۱۱ھ بمطابق ۱۹۹۲ء لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نجف اشرف روانہ ہوئے۔ وہاں سے واپس آ کے تبلیغ دین اور اتحاد بین المسلمین کو اپنا شعار بنایا۔ لکھنو جیسے علمی و ادبی ماحول میں خطابت کے میدان میں اپنوں اور بیگانوں سے علم و ادب کا لوہا منوایا۔ بالآخر ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۳ء بمطابق جمادی الاولی ۱۳۸۳ھ دار فانی سے دار بقاء کی طرف سفر کیا۔ آپ کے جنازہ میں۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ جنازہ کے ساتھ ماتمی دستے ماتم کرتے جارہے تھے۔ تدفین کے بعد بعض لوگ آپ کی قبر کی مٹی کو بطور تبرک محفوظ کیا۔ (رجوع کریں: مطلع انوار، ص ۴۳۳۔۴۳۶۔)

کے زر خرید اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد میری بیحد مخالفت کریں گے مجھ کو ہر قسم سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں گے، مجھ کو جھوٹا کہیں گے۔ اپنے اقوال سے پلٹیں گے۔ افعال سے مکریں گے۔ شیعہ کانفرس کے جلسے میں مجھ سے بعض اخبارات کے نمائندوں نے دریافت کیا تھا وہ کون سی سیاست ہے جس کے نہ جاننے کا تم نے اس جلسہ میں اقرار کیا تھا۔ تو میرا جواب ہے کہ وہ وہی سیاست ہے جو میں نہیں جانتا۔

میرے والد نے شیعہ کانفرس کی بنیاد رکھی۔ تمام علماء نے مدد کی پہلے صدارت علماء سے مخصوص تھی تو کانفرس دن دُونی رات چوگنی ترقی کرتی رہی بڑی شورش کے بعد صدارت میں تعمیم ہوئی پہلے تو یہ صورت ہوئی کہ صدارت کے واسطے انتخاب تو علماء ہی کا ہو مگر وہ جس کو چاہیں اپنی طرف سے نائب کر دیں چند دن یہ آڑ باقی رہی آخر میں یہ پردہ بھی اُٹھ گیا اور دولت مند ڈیوڑھیاں ڈھونڈی گئیں۔ ہاں! ایک مرتبہ جناب صفی مرحوم کو بھی صدارت مل گئی۔

چند دن تو ان حالات میں بھی علماء اعلام مرحومین کانفرس کے ساتھ رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تمام وہ علماء جو بانیان کانفرس میں تھے الگ ہوگئے۔ ارباب کانفرس جانتے تھے کہ علماء کی علیحدگی کے بعد کانفرس بے روح ہو جائے گی۔ لہٰذا مجلس نظارت شرعی کے نام سے دیگر علماء کی ایک جماعت قائم کی، مگر ارکان مجلس نظارت کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ یہ صرف ڈھونگ ہے حقیقت کچھ نہیں۔ لہٰذا یہ سب حضرات بھی کانفرس سے دست بردار ہوگئے کانفرس کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ ڈھول تو بہت پیٹے جائیں مگر اس میں شک نہیں کہ شیعہ کانفرس وہ مردہ تھا جس کی ہر سال برسی ہوتی تھی۔ مگر بقدر واجب جنازہ اٹھانے والے بھی کہیں دستیاب نہ ہوتے تھے۔

صرف جناب ''خان بہادر سید کلب عباس'' صاحب جنرل سکریٹری شیعہ کانفرس باین امید ہے کہ شاید کوئی خدا رس فقیر کسی جڑی بوٹی کے ذریعہ سے اس مردہ کو زندہ کر دے کانفرس کی لاش اپنے کاندھوں پر لادے لادے شہروں شہروں پھر رہے تھے۔ آخر آج سے دوڑھائی سال قبل جانسٹھ کے جلسہ میں سر ''سلطان احمد'' صاحب بالقابہ کی صدارت نے کچھ جان ڈالی، جن کے متعلق اب کی سال کے جلسے میں تائید

صدارت کرتے ہوئے بعض حضرات نے فرمادیا کہ آج تک جتنے صدر آئے سب نے محض تین دن صدارت کی اس کے بعد اپنے گھر کی صدارت فرماتے رہے۔

اس جلسے سے پہلے پھر علماء کو دعوت شرکت دی گئی میرے سوا تمام وہ علماء جو شیعہ کانفرس کے دعوت نامہ کو قابل جواب سمجھے ان سب حضرات نے اپنی شرکت کی شرط قیام مجلس نظارت قرار دی جانسٹہ کے جلسہ میں تو مجلس نظارت کی بنیاد نہ پڑی، مگر سال گذشتہ الہ آباد کے جلسہ میں مجلس نظارت کا رزولیوشن پاس ہوا، جس کے ذریعہ سے ایک مجلس نظارت کا انتخاب محض تین سال کے واسطے کیا جائے حلقہ انتخاب تمام ہندوستان پر شامل ہو۔

ووٹرس کی نامزدگی سکریٹری صاحب شیعہ کانفرس کے اختیار میں ہو۔ بمبئی میں کانفرس کو دعوت دی گئی اور سکریٹری صاحب کی طرف سے دوٹنگ کے واسطے کاغذ جاری ہوئے مگر خدا بھلا کرے ان حضرات کا جنہوں نے صرف سکریٹری صاحب شیعہ کانفرنس کو بدنام کرنے کے واسطے ایسی کوشش کی کہ بمبئی میں کانفرنس نہ ہو اوراس کے بعد فوراً لکھنو میں دعوت دے دی گئی کیوں اور کس لیے لوگ تو بہت کچھ کہتے ہیں خدا جزائے خیر دے ہز ہائی نس آف رام پور کو جن کی سوجھ بوجھ اور عزم مستحکم کی بدولت یہ تمام اسکیم تارِ عنکبوت ہو گئی۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب بمبئی میں کانفرس ملتوی ہوئی تو مجلس نظارت کا انتخاب بھی ملتوی ہوا اور جب لکھنو میں کانفرس کا جلسہ قریب آگیا تو ۱۹ اگست کو مجلس نظارت کے انتخاب کے واسطے جلسہ ہوا۔ میرا تو یہ مطالبہ تھا ہی نہیں مگر بعض حضرات نے رزولیوشن منظور کردہ اجلاس الہ آباد پر غور کر کے اس کو بالکل ناقابل اطمینان قرار دیا اور مجھ سے فرمائش کی کہ تم ۱۹/ اگست کے جلسہ میں تحریک التواء پیش کرو کہ ہم جلسہ عام میں پہلے رزولیوشن کی ترمیم کرالیں تو پھر مجلس نظارت کا انتخاب کر دیا جائے۔

میرا کیا بنتا بگڑتا تھا۔ جلسہ ہوا میں نے تحریک کی اور حضرات نے تائید کی اور انتخاب ملتوی ہو گیا۔ چند دن کے بعد رزولیوشن کی ترمیم کا مسودہ مجھے دیا گیا جو میں نے اپنے اور جناب مولانا میرن صاحب قبلہ کے دستخط سے سکریٹری صاحب سبجکٹ کمیٹی کے حوالے کر دیا اور دیکھ لیا کہ نمبر ۳۶ میں منسلک ہے۔

درمیان کی باتیں تو بہت کچھ ہیں مگر اس سلسلہ کو ختم کر دوں تو مناسب ہے ۱۵ اگست رات کے وقت جو سبجکٹ کمیٹی ہوئی اس کے درمیان ہی سے میں اٹھ کر باہر چلا آیا تھا۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ صدر محترم نے بعض علماء کی منظوری سے مجلس نظارت کی ترمیم کے رزولیوش کا سال آئندہ کے واسطے ملتوی کر دیا اور میں تو یہ جانتا ہوں کہ اب یہ ترمیم آخر عمر کانفرس تک کبھی کسی اجلاس میں نہ آئے گی۔ کیونکہ جن علماء کا یہ مطالبہ تھا جب وہ مجلس نظارت شرعیہ بننے سے پہلے ہی جلسوں میں شرکت کیسی بلکہ کانفرس کے لکھنو میں دعوت دینے والے اور جان وروح سے کوشاں اور منہمک ہو چکے تو اب ارکان کانفرس کو کیا پڑی ہے کہ وہ مجلس نظارت کی ڈکٹیٹری قائم کریں ہم تو کہیں گے کہ یہ صرف صدر محترم کی عظمت بلکہ اقبال تھا کہ شرط شرکت سے دست برداری اختیار کر لی گئی یہ سیاست مجھ کو نہیں آتی۔

بہر حال دعوت کانفرس منظور ہوئی اور استقبالیہ کمیٹی ادھر اُدھر جمع کر کے بنگئی استقبالیہ کمیٹی کے ارکان بھی چن لیے گئے، صورت انتخاب کیا تھی اس کی تصریح میرے قلم سے مناسب نہیں۔

"زر رازر می کشد" اعلیٰ حضرت کے اثر کا موقعہ تھا کہ روپیہ سمٹ کے آنے لگا اس مفلسی کے عالم میں جب کہ سیکڑوں بچے ہوائیں فاقوں مر رہے تھے۔ ہزاروں روپیہ محض پروپیگنڈہ اعلان اشتہار سجاوٹ میں صرف کر دیا گیا۔ ہر جگہ کے جلسہ میں قاعدہ یہ تھا کہ جس شہر میں دعوت دی جاتی تھی محض وہیں سے استقبالیہ کا چندہ جمع کیا جاتا تھا اور بیرون جات میں جو ٹکٹ بکتے تھے وہ رقم صدر دفتر کو جاتی تھی مگر اب کی سال بیرون جات سے استقبالیہ کا چندہ لے کر صدر دفتر کی رقم پر چھاپا مارا گیا۔ شاید اس امید پر کہ ان شاء اللہ رام پور کے خزانہ سے ہر رقم پوری ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ارکان مجلس استقبالیہ نے بڑی زحمت و مشقت اور بڑی جانفشانی سے چندہ جمع کیا تمام انتظامات کئے استقبالیہ کے ممبروں کی تعداد بڑھائی یہاں تک کہ بعض علماء نے وہ وہ کام کئے جس کی ان سے امید نہ تھی مگر ایک میں نافہم تھا کہ جب مجلس انتظامیہ نے اپنی رکنیت میں منتخب کیا تو میں نے سکریٹری صاحب مجلس استقبالیہ کی خدمت میں استعفیٰ روانہ کر دیا کہ میں اپنے امراض و اسقام و مصائب میں مبتلا ہوں کوئی خدمت نہیں کر سکتا لہٰذا مجھ کو انتظامیہ و استقبالیہ دونوں کی ممبری سے معاف فرمایا جائے۔

میں ممنون ہوں کہ جناب "مولوی سید محمد سعید صاحب" اور "جناب راجہ صاحب مٹھوارہ" اور "جناب قیصر حسین صاحب ایڈوکیٹ" نے فقیر خانہ تشریف لا کے استعفیٰ واپس لینے کی خواہش کی۔ میں نے غور مزید میں یہ بھی عرض کیا کہ میں سیاسیات میں دخل دینا مناسب نہیں جانتا اور قوم کی تباہی کا وہی دن ہو گا جب یہ سیاسیات میں قدم رکھے گی۔

مجھ کو یاد نہیں کہ اس کے بعد یا اسی دن "مولوی سعید صاحب" نے یہ ارشاد فرمایا کہ صدر منتخب نے وعدہ فرمایا ہے کہ خطبہ صدارت کے علاوہ اور کوئی سیاسی تحریک جلسہ میں نہ آئے گی اور پریس کانفرس نے کچھ اسی سے ملتا جلتا مجلس استقبالیہ کے ارکان کا بیان بھی شائع کیا۔ اس بیان سے مطمئن ہو کر میں نے استقبالیہ کا کوئی کام لکھنو میں تو نہیں کیا مگر بیرونجات میں جہاں گیا وہاں کے مومنین کو دعوت شرکت دیتا رہا۔

"نواب سید قیصر حسین صاحب ایڈوکیٹ" نے مجھ سے ایک اپیل میں دستخط کرنے کی خواہش کی اور میں نے عرض کر کے عذر کیا کہ اور حضرات سے پہلے لکھوا لیا جائے۔ چند دن کے بعد جب اکثر علماء کے دستخط اس اپیل پر موجود تھے مجھ سے دوبارہ دستخط کی خواہش کی گئی اور میں نے دستخط کر دئے مگر صرف اس اطمینان پر کہ کوئی سیاسی تحریک نہ آئے گی۔

صلح کی کوشش میں کیا ہوا؟

سب سے پہلے میں یہ بھی کہتا چلوں کہ قوم نے بالاتفاق اعلیٰ حضرت ہز ہائینس آف رام پور اقبالہ العالی کو آل انڈیا شیعہ کانفرس کا صدر منتخب کیا اعلیٰ حضرت نے منظوری صدارت میں یہ شرط قرار دی کہ شیعوں

کی تمام جماعتیں متفق ہو کر شیعہ کانفرس میں شرکت کریں اس اعلان سے مومنین کی ہمت افزائی ہوئی اور اعلی حضرت کو جلسوں اور اخبارات موریلوں اور ذاتی خطوط کے ذریعہ سے توجہ دلائی گئی کہ سب سے بڑی نزاع جس نے شہروں قصبوں دیہاتوں بلکہ ہر گھر میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔

"شہید انسانیت" کی نزاع ہے۔ مولانا علی نقی صاحب (جن کے متعلق بعض حضرات کا یہ عہد ہے کہ جس مقام پر وہ ہوں گے یہ حضرت شرکت نہ کریں گے۔) ان کو بھی کانفرس کی طرف سے دعوت نامہ بھیجا جائے۔

۱۹ اگست کو کانفرس کی مرکزی کمیٹی کا جلسہ ہوا اور اس میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا۔ اعلی حضرت نے اپنی رولنگ صادر فرمائی کہ مجلس استقبالیہ کو اختیار ہے کہ وہ مولانا سید علی نقی صاحب کے نام دعوت نامہ جاری کرے یا نہ کرے لیکن اگر مولانا سید علی نقی صاحب ٹکٹ لے کر آل انڈیا شیعہ کانفرس کے جلسے میں آجائیں تو کسی بھی قانون سے ان کو روکا نہیں جاسکتا اور فرمایا کہ اس معاملے کو میرے سپرد کر دیا جائے میں طے کر دوں گا۔

مرکزی کمیٹی کا جلسہ برخاست ہونے کے بعد یہ بہ ایماء اعلی حضرت دام اجلالہ جنرل سکریٹری شیعہ کانفرس "خان بہادر سید کلب عباس صاحب" نے صلح کی کوشش شروع کی اور "مولوی... صاحب" وغیرہ[1] کی طرف سے ایک مسودہ سکریٹری صاحب کو دیا گیا کہ اگر "مولوی علی نقی صاحب" اس مسودے پر دستخط کر دیں تو پھر کوئی نزاع باقی نہ رہے گی۔

مجھ کو نہ یہ خبر تھی کہ مرکزی کمیٹی میں کیا ہوا اور نہ یہ خبر تھی کہ صلح کی گفتگو شروع ہوئی ہے۔ ۱۹ اگست ۵ بجے سہ پہر کو جناب "سید علی ظہیر صاحب" وزیر اترپردیش کی کوٹھی پر عصرانہ تھا۔ جس میں مجھ کو بھی دعوت دی گئی تھی جب میں اس عصرانہ میں گیا تو اعلی حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ تم فوراً واپس جاؤ

---

[1] نوٹ: اس نزاع میں طرفین کے تمام اسماء گرامی عمدۃ العلماء کبن صاحب کے "بیان" میں موجود ہے۔ جسے ہم نے حفظ تقدس کی خاطر حذف کر دیا ہے۔

کیونکہ میں نے "کلب عباس صاحب" کو ایک صلح کا فارمولا دیکر تمہارے یہاں بھیجا ہے کہ تم کو لے کر مولوی علی نقی کے یہاں جائیں اور صلح کی کوشش کریں۔

جناب "قیصر حسین صاحب" ایڈوکیٹ نے اس فارمولے کی نقل بھی مجھ کو دکھائی۔ جناب "مولوی... صاحب"، جناب، "مولوی... صاحب"، "جناب مولوی... صاحب" وغیرہ بھی عصرانہ میں موجود تھے۔ میں نے وہ فارمولا دیکھ کر کہا کہ اس کو "مولوی علی نقی صاحب" منظور نہ کریں گے۔ مگر اعلی حضرت کے حکم کے مطابق فوراً مکان آیا معلوم ہوا کہ جناب سکریٹری صاحب اور جناب "صدر الاسلام صاحب" اور "جناب وصی الحسن صاحب زیدی" اور "جناب کلب مصطفی صاحب" بہت دیر ہوئی مجھکو تلاش کرتے ہوئے آئے تھے مگر جب میں نہ ملا تو "مولوی علی نقی صاحب" کے یہاں چلے گئے چونکہ بہت دیر ہو چکی تھی، اس وجہ سے میں نے علی نقی صاحب کے یہاں جانا مناسب نہیں سمجھا مگر میں رات تک منتظر رہا کہ شائد سکریٹری صاحب واپس تشریف لائیں تو مجھ کو کچھ حال معلوم ہو (جناب عم محترم خان بہادر سید کلب عباس صاحب ہمیشہ فقیر خانے ہی پر قیام فرماتے ہیں) مگر جب موصوف تشریف نہ لائے تو میں سو رہا صبح کو معلوم ہوا کہ سکریٹری صاحب ۵ بجے صبح کی گاڑی سے رائے بریلی گئے مگر میرے نام تحریر چھوڑ گئے ہیں جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

میں ۳ بجے سہ پہر سے ساڑھے گیارہ بجے شب تک صلح کی کوشش کرتا رہا۔ پہلے مسودے "مولوی علی نقی صاحب" نے منظور نہ کیا اور کچھ الفاظ کا تغییر و تبدل کیا مگر اس کو "مولوی... صاحب" وغیرہ نے منظور نہ کیا اور بعض الفاظ کم کر کے ایک مسودہ بنایا اس کو "مولوی نقی صاحب" نے منظور نہ کیا۔ اب میں جارہا ہوں اور میں نے اعلیٰ حضرت سے آپ کے متعلق عرض کر دیا ہے کہ آپ اسی کام کے تکمیل میں کوشش کریں گے۔

لہذا دونوں مسودوں کو پیش رکھ کے کوئی فارمولا منظور کرانے کی کوشش کیجئے۔ "مولوی... صاحب" کی طرف سے دونوں فارمولے مذکورہ بالا تحریر کے ساتھ منسلک تھے۔ صبح کو خود "مولوی علی نقی صاحب"

میرے پاس تشریف لائے اور تمام تذکروں کے بعد وہ مسودہ دیا جو موصوف نے اپنی طرف سے پیش کیا تھا۔

۱۲ بجے دن کو اعلی حضرت کے طلب فرمانے پر سرکار کی خدمت میں گیا۔ اعلی حضرت نے فرمایا تم اس صلح میں کوشش کرو میں نے عرض کیا کہ " جناب... صاحب " قبلہ کی شرکت ضروری ہے چنانچہ اعلی حضرت نے موٹر بھیج کر "مولوی... صاحب" اور "... صاحب" کو طلب فرمایا اور دونوں حضرات کے ساتھ جناب "مولوی... صاحب"، "جناب مولوی... صاحب"، "جناب مولوی... صاحب"، "جناب مولوی... صاحب" تشریف لائے اور اعلیٰ حضرت اور راجہ صاحب پیر پور کی موجودگی میں تبادلہ خیالات شروع ہوا۔ "خان بہادر نواب مہدی حسن" قبلہ سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک مسودہ تحریر کریں جو فریقین کے لیے قابل منظوری ہو سکے۔

تقریباً ۳ گھنٹے کے بحث و مباحثہ اور کمی و زیادتی کے بعد "جناب خان بہادر صاحب" کے تحریر کردہ دو مسودے منظور ہوئے۔ ایک وہ جس پر مذکورہ بالا تمام حضرات دستخط کر کے یہ اعلان کریں کہ جو تحریر "مولوی علی نقی صاحب" نے دیدی اس کے بعد کوئی نزاع ہم لوگوں کو "مولوی علی نقی صاحب" سے باقی نہ رہی جس کے بعد سب حضرات کی رائے ہوئی کہ میں اور "خان بہادر نواب" "مولوی مہدی حسن صاحب" قبلہ ان تحریروں کو لے کر "مولوی علی نقی صاحب" کے پاس جائیں اور ان سے منظوری حاصل کرنے کی کوشش فرمائیں خان بہادر صاحب نے ہر چند عذر کیا، لیکن اعلیٰ حضرت نے کوئی عذر مسموع نہیں فرمایا اور ارشاد کیا کہ پندرہ برس کے بعد آپ سے یہ دینی کام لے رہا ہوں اسے آپ کو منظور کرنا ہوگا جس کے بعد خان بہادر صاحب نے منظور کیا لیکن یہ شرط کر لی تھی کہ اگر ان تحریروں میں کوئی ایسی ترمیم از "جناب علی نقی صاحب" پیش کی گئی جسے قابل غور سمجھوں گا تو اسے آپ حضرات کی طرف سے منظور تو نہیں کروں گا لیکن آپ سب حضرات کی خدمت میں پیش ضرور کر دوں گا۔ میں اور جناب خان بہادر صاحب مسودہ لے کر "مولوی علی نقی صاحب" کے یہاں گئے۔

دیر تک گفتگو ہونے کے بعد "مولوی علی نقی صاحب" نے کل منظور کر کے محض ایک لفظ (بیان) کے اضافہ کی خان بہادر صاحب سے اجازت حاصل کی اور اس لفظ کے اضافہ کے ساتھ اپنے قلم سے پوری عبارت مسودے کی لکھ کر دستخط کر دے۔ "مولوی علی نقی صاحب" کی مذکورہ بالا تحریر لے کر میں اور "خان بہادر صاحب" "مولوی ... صاحب" کے دولت کدہ پر گئے۔ "مولوی ... صاحب" نے مع لفظ اضافہ شدہ تحریر کو منظور کر لیا مگر اور حضرات نے انکار کر دیا اور پھر مولوی ... صاحب نے بھی انکار فرمادیا۔

ہم لوگ پھر "مولوی علی نقی صاحب" کے پاس آئے اور "مولوی علی نقی صاحب" نے "خان بہادر صاحب" کی ذاتی منظوری کی بناء پر لفظ (بیان کاٹ کر لفظ موافقت) کا اضافہ کیا اور جناب خان بہادر صاحب سے یہ فرمایا کہ میں نے آپ کی فرمائش کے مطابق اس مسودے پر دستخط کر دئے۔ اب مجھے امید ہے کہ اگر اس مسودے کو بھی "مولوی ... صاحب" وغیرہ نے منظور نہ کیا تو آپ میری تائید کریں گے اضافہ شدہ لفظ نے میری نظر میں "مولوی ... صاحب" وغیرہ کے مقصود کی مکمل ترجمانی کرنی تھی۔ لہذا جناب خان بہادر صاحب نے تو اس لفظ کو فوراً منظور کر لیا مگر میں نے "مولوی علی نقی صاحب" کو توجہ دلائی کہ یہ اضافہ شدہ لفظ وہ حضرات تو ممکن ہے منظور کر لیں اگر آپ خود اس لفظ پر غور کر لیں کہ آپ کے واسطے مناسب ہے یا نہیں۔

مولانا نے جواب دیا کہ جب میں مصالحت پر تیار ہی ہوں تو اس پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں سمجھتا رات بہت زائد گزر چکی تھی لہذا میں اور "خان بہادر صاحب" مکان واپس آ گئے۔ صبح ۸ بجے میں خان بہادر صاحب کی خدمت میں گیا تو فرمایا کہ "محسن نواب صاحب" شب ہی کو تشریف لائے تھے اور مسودے کو مع اس اضافہ کے پسند فرمایا (لیکن مزید غور اور مشورے پر قطعی رائے کو محول کیا ہے۔) اب صبح کو میں اور حضرات سے بھی مل لوں گا۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے خان بہادر صاحب فقیر خانہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اس لفظ کا اضافہ ان حضرات کو منظور نہیں اس کے بعد میں اور خان بہادر صاحب تقریباً ۳ بجے سہ پہر کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے "مولوی ... صاحب"، "مولوی ... صاحب" اور "نواب ... صاحب" پہلے سے تشریف فرما

تھے اور جناب راجہ صاحب پیرپور بھی تھوڑی دیر تشریف فرما رہے اعلیٰ حضرت کے روئے مبارک سے کچھ آثار برہمی نمایاں ہو رہے تھے، بعض دیگر حضرات سے گفتگو کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت نے بہت بے اعتنائی کے انداز میں مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آخر علی نقی صاحب نے انکار کر دیا نا؟

میں نے عرض کی کہ "سرکار علی نقی صاحب" نے تو انکار نہیں فرمایا بلکہ یہ حضرات جو سرکار کی خدمت میں حاضر ہیں۔(مولوی ... صاحب اور مولوی... صاحب)ان حضرات نے انکار فرمایا کل حالات خان بہادر سے دریافت کر لیجئے۔ اعلی حضرت میری عرض پر بے حد متعجب ہوئے اور جناب خان بہادر صاحب نے مفصل حالات بیان کئے جس کے بعد اعلی حضرت نے وہ مسودہ جس پر مولوی علی نقی صاحب نے دستخط کئے تھے ملاحظہ فرمایا اور اضافہ شدہ لفظ پر خاص توجہ مبذول کی مولوی... صاحب کی طرف مخاطب ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ اس لفظ سے آپ حضرات کے مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

مولوی... صاحب نے کہا کہ اعلیٰ حضرت یہ طے ہوا تھا کہ اب اس تحریر میں کسی لفظ کا اضافہ نہ ہوگا سرکار نے ارشاد فرمایا کہ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے میں نے سیکڑوں مقدموں میں صلح کرائی ہے ہائی کورٹ چیف کورٹ... غرض جب بھی کسی مقام پر کوئی صلح ہوتی ہے تو ہر فریق کو بڑھانے گھٹانے کا اختیار ہوتا ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ مطلب بدلنے نہ پائے "مولوی... صاحب" نے فرمایا کہ جی نہیں اس لفظ سے بڑا فرق ہو گیا مگر اعلی حضرت کے بار بار اصرار کے بعد بھی "مولوی... صاحب" اور "مولوی... صاحب" نے کوئی فرق پیش نہ فرمایا صرف یہ جواب دیا کہ سرکار اگر فرق نہ تھا تو مولوی علی نقی صاحب نے یہ لفظ بڑھائی کیوں؟

آخر میں "مولوی... صاحب" نے فرمایا کہ اگر "مولوی علی نقی صاحب" نے ایک لفظ کا اضافہ فرمایا تو ایک لفظ کا اضافہ میں بھی کر دوں۔ موافقت کی لفظ کے بعد وغیرہ بڑھا دیا جائے "مولوی... صاحب" کے ارشاد کی نسبت اعلیٰ حضرت نے "جناب خان بہادر صاحب" سے ارشاد فرمایا کہ آپ کی کیا رائے ہے انہوں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک تو مولوی علی نقی صاحب کو اس لفظ پر عذر نہ ہونا چاہئے اور میں نے اعلیٰ حضرت کو مطمئن کر دیا کہ مولوی علی نقی صاحب ضرور منظور کر لیں گے۔

جس پر اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مولوی علی نقی صاحب کی طرف سے اس لفظ کو میں منظور کرتا ہوں۔ اس کے بعد مولوی... صاحب نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے مولوی... صاحب سے استمزاج کیا اور یہ جواب ملا کہ چونکہ مولوی... صاحب (ناسازی مزاج کی وجہ سے) یہاں نہیں آسکتے اور اس مسئلہ میں دیگر حضرات سے استصواب کی بھی ضرورت ہے۔

جنہوں نے شہید انسانیت کے خلاف دستخط کئے ہیں لہذا آج ۶ بجے شام کو ان حضرات کو مدعو کر کے بعد استصواب جواب دیا جائے گا جس کو سن کر اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ بہتر ہے لیکن میں بھی اس جلسہ میں شریک ہوں گا۔ اور مجھ سے اور خان بہادر صاحب سے بھی باصرار فرمایا کہ آپ حضرات بھی شریک ہوں خان بہادر صاحب نے اعلیٰ حضرت کی شرکت کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ بلا مطلب کے عام افراد بھی وہاں آجائیں۔ جو اعلی حضرت کے پریشانی کا باعث ہوں جس کی تائید "مولوی محسن نواب صاحب" نے بھی کی جناب خان صاحب نے فرمایا کہ سرکار بہتر یہ ہے کہ یہ معاملہ اس وقت ملتوی کر دیا جائے کانفرنس کے بعد تصفیہ کرایا جائے۔

اعلی حضرت نے صاف انکار فرمادیا کہ میں ہر روز یہاں نہیں آسکتا نہ مہلت ہے کہ ان جھگڑوں میں مزید وقت ضائع کروں۔ مختصر یہ کہ اعلی حضرت دوبارہ بڑی دیر تک "مولوی... صاحب" اور "مولوی ... صاحب" سے گفتگو فرماتے رہے اثناء کلام میں "مولوی... صاحب" نے فرمادیا کہ اب دلوں میں صفائی کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی صلح ہو سکتی ہے۔ بعض مرتبہ اعلی حضرت کو بہت سی باتیں ناگوار بھی ہوئیں۔ اور آپ نے فرمایا کہ میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی مذہبی نزاع نہیں ہے صرف ذاتیات ہیں۔

آخر میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ اچھا بہتر ہے میں اس کمیٹی میں نہ آؤں گا۔ مگر مشورہ اس حد تک محدود رہے گا کہ جو لفظ مولوی... صاحب نے اضافہ کی ہے اس کے اضافہ کے بعد صلح منظور ہے یا نہیں مولوی... صاحب نے وعدہ کیا کہ آج شب ہی کو خان بہادر صاحب کو اور حقیر کو مشورہ کے نتیجہ سے مطلع کر دیں گے۔ مذکورہ بالا کمیٹی ہوئی یا نہیں اس کا مجھ کو علم نہیں۔ آٹھ بجے رات کو میں نے ایک بزرگ کو بھیج کر جواب کا مطالبہ کیا۔ تو جواب ملا کہ صبح کو "مولوی... صاحب" فقیر خانہ پر تشریف لاکے جواب سنائیں گے مگر اس وقت تک کوئی جواب نہیں ملا البتہ اکثر معتبر حضرات سے بطور خبر یہ معلوم ہوا کہ جلسہ میں

شب کو بہت کم حضرات تشریف لائے اس لیے یہ طے ہوا کہ جب تک دیگر حضرات شریک نہ ہوں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب پہلا مسودہ دیا گیا تو کسی سے مشورے کی کوئی شرط نہ تھی جب دوسرا مسودہ دیا گیا تو کوئی شرط نہ تھی اور جب تیسرا مسودہ دیا گیا تو اسکے ساتھ وہ مسودہ بھی لکھ لیا گیا تو مولوی علی نقی صاحب دستخط کے بعد مولوی ...صاحب وغیرہ کی طرف سے لکھا جائے گا۔ اس وقت بھی مشورے کی کوئی شرط نہ تھی۔ البتہ جب اعلی حضرت نے فیصلہ کر دیا کہ لفظ موافقت بڑھنے سے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ فیصلہ فرما دیا کہ صرف ایک لفظ یعنی وغیرہ کا اضافہ اور ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ فرمادیا کہ جو کچھ تصفیہ کرنا ہو قبل کانفرنس کر لیا جائے بعد کو میں وقت نہیں دے سکتا۔ تو اب یہ عذر پیش ہوا کہ سب کے مشورے کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا شہید انسانیت کو دیکھ کر جو جذبات خلاف مولف برانگیختہ ہوئے تھے کیا وہ ذاتی تھے یا مشورہ کے بعد ہوئے تھے۔ جواب ان مخالفتوں کو ختم کرنے کے واسطے مشورہ کی ضرورت ہے۔ ایمان کا معاملہ انفرادی ہوا کرتا ہے جمہوریت اور مشورہ کا تو اس میں کبھی کوئی دخل ہی نہیں رکھا گیا۔ بہر حال میں نے دوسرے دن اعلیٰ حضرت سے بالکل تخلیہ کا وقت حاصل کیا۔ اور اپنی کچھ خواہشیں اس معاملہ کے واسطے پیش کیں اور اعلیٰ حضرت نے انہیں میں سے دو منظور کیں۔ مگر وہ کیا تھیں اس کی تفصیل عرض کرنا مناسب نہیں...

مختصر یہ کہ میں نے اپنی بے وقوفی سے سرکار کو مطمئن کر دیا کہ مولوی علی نقی صاحب کسی جلسے میں نہ آئیں گے اور یہ کہ سرکار جلسوں کے بعد ایک بیان اس موضوع پر شائع کریں گے۔ جو بیان قومی آواز میں شائع ہوا ہے یہ وہی ہے جس کا مجھ سے وعدہ تھا یا کچھ اور ہے اس کے متعلق بھی کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میرے مذکورہ بالا تمام بیانات کو پڑھ کر از خود سمجھ سکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا بیان کیا ہونا چاہئے تھا۔

اعلی حضرت کے اس بیان میں علماء کو دعوت دی گئی ہے کہ رام پور آکر اس معاملے کو طے کر لیں مگر میری بادب عرض ہے کہ مجھ کو اس معاملہ میں دخل دینے سے معاف فرمایا جائے میں اب اس قابل نہیں ہوں کہ کسی معاملہ میں دخل دے سکوں۔

شیعہ کانفرنس کے کھلے جلسوں میں اور کیا ہوا۔ سب جکٹ کمیٹیوں میں کیا کیا ہوا سب کے متعلق خاموشی ہی بہتر ہے۔ (اس بیان میں جہاں تک میری شرکت کا اور میرے متعلق ذکر ہے وہ صحیح ہے۔)

خان بہادر مولوی، محمد مہدی حسن رضوی

صلح کا پہلا مسودہ جو مولوی محمد سعید صاحب وغیرہ کی طرف دیا گیا

کتاب شہید انسانیت چونکہ بین الاقوامی حیثیت سے لکھی گئی تھی اس لیے اس میں موافقین اور مخالفین دونوں کی روایات آگئی ہیں جس کی وجہ سے بعض چیزیں مسلمات وعقائد شیعہ کے موافق نہیں ہیں۔ اس لیے نہ تو یہ سند میں شیعوں کے خلاف پیش کی جاسکتی ہیں نہ وہ میرے ذاتی عقائد ہیں۔

صلح کا دوسرا مسودہ

جو خان بہادر صاحب نے دیا اور سب حضرات نے اور مولوی علی نقی صاحب نے منظور کر کے صرف ایک لفظ بیان کا اضافہ کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہید انسانیت اور بعض دیگر مضامین چونکہ بین الاقوامی حیثیت سے لکھے گئے ہیں اس لیے ان میں غیر شیعہ افراد کے بیانات و روایات و عقائد بھی درج کر دئے گئے ہیں اور عقائد و مسلمات شیعہ کی جو خود میرے بھی ذاتی عقائد و مسلمات ہیں (بیان / موافقت) کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور جب کہ وہ شخصی طور پر ایک شیعہ عالم ہونے کی حیثیت سے نہیں لکھے گئے ہیں۔ تو ان کو بطور سند کبھی فرقہ شیعہ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

والسلام
نقل دستخط
علی نقی النقوی عفی عنہ
۱۶/ ذی العقدہ ۱۳۷۰ء[1]

---

[1] اظہار حق، جعفر شیروانی، ص ۷ تا ۱۸۔

۲۔ سید العلماءؒ کے بیانات کتاب "شہید انسانیت" کے متعلق

یاد گار حسینی ۱۳۶۱ھ کی تجویز شدہ کتاب کی تکمیل اہل قلم وارباب نظر کو توجہ دانی (سرفراز لکھنو، مورخہ ۵/اکتوبر ۱۹۴۴ء) خدا کا شکر ہے کہ سیز دہ صد سالہ یاد گار حسینی ۱۳۶۱ھ کے سلسلہ ہمیں جتنی تجویزیں بنیادی حیثیت سے طے پائی تھیں وہ سب اپنی اپنی حد میں پایہ تکمیل پہنچیں۔ ایک تجویز تھی تمام ملک میں مسلسل بین الاقوامی حسینی جلسوں کا ہونا۔ افراد قوم اور اہل ملک کے انہماک اور توجہ سے یہ تجویز جس حیرت انگیز اور نتیجہ خیز طریقہ پر عمل میں آئی وہ دیکھنے والوں کی نگاہوں میں اور اخباروں کے صفحوں پر کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔

دوسری تجویز دار الآثار حسینی کی تشکیل تھی۔ اس دار الآثار کا افتتاح بھی ہو گیا اور ایک معتدبہ ذخیرہ کتاب اور تصاویر کا فراہم ہوا اور برابر فراہم ہو رہا ہے۔ ایک تجویز جو اپنی نوعیت اور افادیت میں سب سے اہم تھی وہ ایک مکمل اور جامع کتاب کی اشاعت تھی جس میں واقعہ کربلا کے اسباب، حالات اور نتائج پر اس طرح تبصرہ کیا جائے کہ ہر مذہب وملت کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے اس کے لیے بہت سے اہل قلم کو دعوت دی گئی تھی اور طے پایا تھا کہ ان تمام حضرات کے نتائج قلمی کو سامنے رکھ کر اس کتاب کی تکمیل کی جائے۔

تین برس کی مسلسل محنت اور جانفشانی کے بعد شکر ہے کہ یہ کتاب مکمل ہوگئی ہے اس میں تراسی (۸۳) اہل قلم کے قلمی نتائج اور دماغی کاوشیں شریک ہیں اور (۷۱۲) صفحات کی ضخامت پر کتاب ختم ہوئی۔ کاغذ ملنے کی بے انتہا دشواریوں اور گراں باریوں کے ساتھ آیندہ مکمل اور وسیع اشاعت کے لیے سرمایہ کو محفوظ رکھنے کے واسطے اس ضخیم کتاب کی چھ روپیہ قیمت رکھ دی گئی ہے اور چونکہ یہ کتاب ابھی مختتم اور قطعی حیثیت سے شائع نہیں کی گئی ہے اس لیے زیادہ تعداد میں نہیں طبع کی گئی ہے اور جو حضرت جلد طلب نہ فرمائیں گے بہت ممکن ہے کہ انہیں پھر آئندہ ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔ اصل مقصد اس پہلے ایڈیشن کی طباعت کا استصواب اور دریافت آراء ہے۔

اس لیے تمام اہل قلم اور ارباب نظر سے گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ فرما کر آزادی کے ساتھ جو کچھ ان کے خیالات انتقادات یا اعتراضات ہوں انہیں تحریر فرما کر ناظم ادارہ مرکزی اور ناظم شعبہ تصنیف کے نام ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ کے اختتام تک روانہ فرمائیں اس لیے کہ آیندہ محرم ۱۳۶۳ھ سے وصول شدہ آراء و انتقادات کی روشنی میں ان شاء اللہ کتاب پر نظر ثانی اور دوسری بار طباعت کے لیے از سر نو ترتیب کا کام شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا اپنی زرین رائے سے اس کے قبل مطلع فرما کر صدی کے اس اہم کارنامہ تاریخی کی تکمیل میں حصہ لیں۔

کتاب "شہید انسانیت" کے کسی ایک لفظ کے بھی باقی رکھے جانے پر مجھے اصرار نہیں۔

(سرفراز لکھنو مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۴۵ء) مدیر محترم اخبار سرفراز دہم مجدکم تسلیم۔ سرفراز کی ایک قریبی اشاعت میں آپ کا افتتاحیہ جو شہید انسانیت کے متعلق اظہار رائے پر مشتمل ہے سے گذرا ہمیں اس کے پہلے خود اصل کتاب کے صفحہ ۲ پر اور پھر کتاب کی طباعت مکمل ہونے کے بعد اخبار سرفراز میں اپنے سب سے پہلے اعلان میں اس کو واضح کر چکا ہو کہ یادگار حسینؑ کی تجویز شدہ کتاب کا یہ ابتدائی خاکہ ہے جو بغرض استصواب و اظہار آراء طبع ہوا ہے اور یہ کہ تمام انتقادات اعتراضات اور مشوروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایڈیٹوریل بورڈ کی جانب سے اس کتاب کی آخری تشکیل و ترتیب کا فیصلہ ہو گا۔

نیز اس کے بعد ادارہ کی جانب سے کارکن ادارہ جناب قیس رضوی کے بیان میں بھی اس کی تشریح کی جا چکی ہے مگر آپ کے اس افتتاحیہ کے بعض الفاظ سے یہ انداز ہوتا ہے کہ شاید یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ میں اپنے اس سابقہ اعلان پر قائم نہیں ہوں اس لیے میں اس تحریر کے ذریعہ سے آپ کو اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ کتاب پر نظر ثانی کے متعلق سابقہ اعلانات اپنی جگہ پر برقرار ہیں جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب کوئی میری ذاتی تصنیف یا تالیف نہیں ہے۔

اس لیے اس کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی باقی رکھے جانے پر اصرار کی مجھے کوئی وجہ نہیں ہے یہ تو "پنچائتی ادارہ کی کتاب ہے۔" اس لیے کسی اعتراض کے متعلق میری انفرادی رائے کا سوال ہی نہیں پیدا

ہوتا۔ اگر کوئی اعتراض مجھے تسلیم نہ بھی ہو لیکن ایڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اسے قابل لحاظ سمجھ کر کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو اس میں بھی عذر نہیں ہو سکتا۔

اب تک ایڈیٹوریل کا کام شروع ہو جاتا لیکن چونکہ ایک کتاب کا اعلان ہو چکا ہے جس میں مزید اعتراضات شائع ہوں گے اس لیے اس کتاب کی اشاعت کا انتظار اصولاً ضروری ہو گیا۔ تمام اعتراضات کے سامنے آنے کے بعد یقیناً پھر اس کام میں کوئی تعوق نہ ہو گی امید ہے کہ آپ کو میری اس تحریر کے بعد کوئی تشویش باقی نہ رہے گی۔

والسلام
علی نقی النقوی عفی عنہ
یکم ربیع الاول ۶۴ھ

ایک غلط فہمی کا دفعیہ

(شہید انسانیت کے خلاف ۱۹ علماء کے فتاوے دیکھنے کے بعد منشور شائع ہوا) ''شہید انسانیت'' کے متعلق ایک مطبوعہ اشتہار شائع ہوا ہے جس میں چند اہل علم کی طرف سے اس کا اعلان ضروری سمجھا گیا ہے کہ وہ اس کتاب کو ''شیعوں کی کتاب'' تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ اعلان بالکل بلا ضرورت ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب بہ حیثیت ''شیعوں کی کتاب'' کے پیش ہی نہیں کی گئی ہے۔

وہ ایک ایسے ادارہ کی جانب سے شائع ہوئی ہے جس کے ارکان اور عہدہ داران اور ایڈیٹوریل بورڈ ہر شعبہ میں غیر شیعہ بلکہ غیر مسلم افراد بھی داخل ہیں ابھی تو وہ اصل تجویز شدہ کتاب کا ابتدائی خاکہ ہے جو بغرض استصواب واظہار آراء طبع ہوا ہے۔ لیکن اگر ایڈیٹوریل بورڈ کے اجتماعی فیصلہ کے بعد وہ قطعی طور پر بھی پیش ہو تب بھی یہ سمجھنا درست نہ ہو گا کہ وہ کسی فرقہ کی مذہبی کتاب ہے اور نہ اسے فرقہ وارانہ اختلافی مسائل میں کسی فرقہ کے خلاف حجت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

رہ گیا یہ امر کہ اس کی کوئی عبارت مسلمات فرقہ شیعہ کے منافی ہے اور اس سے اساس مذہب شیعہ کو نقصان و مضرت پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس کا صحیح فیصلہ آسانی سے ہو جاتا اگر وہ بزرگ شخصیتیں اس وقت موجود ہوتیں جو نہ صرف اپنی عمر بلکہ علم و بصیرت اور تدین کے لحاظ سے بھی اس بحث میں حکم بننے کی صلاحیت رکھتی تھیں، مگر افسوس کہ وہ دنیا سے اٹھ چکی ہیں اس لیے ہر ایک صاحب علم اور واعظ اور ذاکر کو موقع ہے کہ وہ "فقیہ" اور "عالم" کے لقب کو اختیار کر کے حسب منشاء فتاوے صادر کرے۔ ﴿انا للہ وانا الیہ راجعون﴾.

معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کتاب کوئی میری ذاتی اور شخصی تصنیف نہیں ہے جس میں میں خود ترمیم و تبدیل کروں یا کسی تبدیلی کا وعدہ کر لوں بلکہ اب اعتراضات پر غور کرنے اور ان کے مطابق کسی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف ادارہ یادگار حسینی کے ایڈیٹوریل بورڈ کو ہے جس کا کام ان مزید اعتراضات کے انتظار میں رکا ہوا ہے جن کی اشاعت کا ایک کتاب کی صورت میں اعلان ہوا ہے۔ یہ خیال کہ میں نے کسی اعتراض یا اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی بنا پر کتاب کی ترمیم کا وعدہ کیا تھا اور اس سلسلہ میں کسی بیان کا مسودہ لکھا تھا بالکل غلط ہے۔ والسلام علی من اتبع الہدی

علی نقی النقوی

یکم ربیع الاول ۱۳۶۴ء

میں نہ ذاتی طور پر اور نہ بحیثیت ناظم ادارہ یادگار حسینی تشنگی امام کا منکر ہوں

(سرفراز لکھنو مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۴۵ء) جناب ایڈیٹر صاحب اخبار سرفراز دام مجدکم تسلیم۔ آپ کے اخبار کی تازہ اشاعت میں آپ کا نوٹ دیکھ کر اس امر کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میں ذاتی طور پر یا بحیثیت ناظم ادارہ یادگار حسینی کسی طور پر بھی معاذ اللہ تشنگی حضرت سید الشہداء علیہ السلام کا منکر ہوں نہ شہید انسانیت میں کسی جگہ تشنگی امام حسین علیہ السلام کا انکار کیا گیا ہے۔ بلکہ تمام کتاب میں کم از کم ۲۲ جگہ امام علیہ السلام، اصحاب امام علیہم السلام یا اطفام امام علیہم السلام کی پیاس

کا تذکرہ ہے۔ یہ ایک بالکل غلط پروپیگنڈا ہے جو میرے خلاف کیا جارہا ہے جس سے مقصود صرف عوام کو میرے خلاف برانگیختہ کرنا ہے اور کچھ نہیں یہ بھی غلط ہے کہ کوئی رسالہ اس سلسلہ میں میری تصنیف سے شائع ہوا ہے نہ ایسے کسی رسالہ یا مضمون کو جس میں تشنگی کا انکار ہو میں پسند کرتا ہوں۔

والسلام
علی نقی النقوی عفی عنہ
۱۸ ربیع الاول ۱۳۶۴ھ

تشنگی امام علیہ السلام کے متعلق سید العلماء مولانا علی نقی صاحب سے صرف ایک سوال

(از جناب نواب حاجی احسان علی خان صاحب آف مالیر کوٹلہ) صدر پنجاب شیعہ کانفرس و کنویز محاذ حسینی لکھنو)(سرفراز مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۴۵ء)جناب نے اپنے بیان شائع شدہ سرفراز مورخہ ۱۰ ربیع الاول ۶۴ء میں ارشاد فرمایا:"میں تشنگی امام حسین علیہ السلام کا منکر نہیں ہوں۔" حالانکہ آپ نے خود کتاب "شہید انسانیت" میں صفحہ ۴۱۸ اور صفحہ ۴۴۹ میں ساتویں یا آٹھویں شب کے متعلق حضرت ابو الفضل علیہ السلام اور جناب نافع بن ہلال کے متعلق یہ تحریر کیا ہے کہ یہ حضرات بیس سوار اور تیس پیادے ہمراہ لے کر پانی لینے گئے اور دشمن کی فوج کو شکست ہوئی اور پانی خیام حسینی میں پہنچادیا گیا۔

اسی طرح صفحہ ۳۳۳ پر اور صفحہ ۳۷۶ پر جناب بریر اور جناب عبد الرحمن کے مطائبہ کی روایت کا ایک جزو یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام علیہ السلام صبح عاشور غسل فرمایا۔ اب یہ ارشاد ہو کہ آپ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی تین دن کی بھوک اور پیاس کے قائل ہیں۔

یا صرف چند گھنٹہ کی پیاس جس کا غسل کے بعد بھی امکان ہے یہ بھی ارشاد کہ آپ محض تشنگی کے قائل ہیں یا بھوک کے بھی آپ قائل ہیں یہ بھی فرمایئے کہ آپ کے نزدیک یہ جائز ہے کے بچے بھوک پیاس سے تڑپتے رہیں اور امام غسل کرلیں۔ قوم کو جناب کے بیان کا سخت انتظار ہے۔

تشنگی کے متعلق مزید تشریح

(سر فراز مورخہ یکم مارچ ۱۹۴۵ء) یہ جواب سوال عالی جناب نواب حاجی احسان علی خان صاحب آف مالیر کوٹلہ تحریر ہے کہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی تین دن کی بھوک اور پیاس کا قائل ہوں جیسا کہ شہید انسانیت میں بھی متعدد مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے۔ جس روایت کا جناب نے حوالہ دیا ہے وہ چونکہ اس کے پہلے برابر علماء و مورخین درج کرتے آئے تھے اس لیے بہ موقع استصواب درج کتاب کی گئی۔

بے شک میں امام علیہ السلام کے صبر و ثبات کو عاجزانہ و مجبورانہ نہیں بلکہ کامل اقتدار نہ اختیار کے ساتھ سمجھتا ہوں اور امام علیہ السلام کے افعال کو اس سے بلند سمجھتا ہوں کہ معاذ اللہ ان کے جواز و عدم جواز کے متعلق کوئی فتوی صادر کیا جائے۔ انکار تشنگی کے متعلق کسی رسالہ کی تصنیف و اشاعت سے انکار کے متعلق جو بیان پہلے دے چکا ہوں اس پر قائم ہوں۔ باور کرنے نہ کرنے کا ہر شخص کو اختیار ہے۔

والسلام
علی نقی النقوی عفی عنہ
۱۱ ربیع الاول ۶۴ھ۔

مزید وضاحت کی استدعاء

(سر فراز مورخہ ۵ مارچ ۱۹۴۵ء) جناب سید العلماء مد ظلہ السلام علیکم۔

اخبار سر فراز کے ذریعہ تشنگی عاشور کے متعلق میں نے حضور کی خدمت میں جو سوال پیش کیا تھا اس کے چار اجزاء تھے:

۱۔ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب بھی جناب کے نزدیک تین دن کے بھوکے پیاسے تھے یا نہیں؟ جناب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ "امام حسین علیہ السلام تین دن کے بھوکے پیاسے تھے۔" براہ کرم میرے سوال کے دوسرے جزو کا جواب بھی مرحمت ہو کہ اصحاب و اطفال بھی تین دن کے بھوکے پیاسے تھے یا نہیں؟

۲۔ یہ روایت صحیح ہے یا نہیں کہ ساتویں آٹھویں شب کو خیام حسین علیہ السلام میں پانی پہنچ گیا تھا؟ اس کو جواب مرحمت نہیں ہوا۔

۳۔ صبح عاشور عبد الرحمن بن عبد ربہ اور بریر کے مزاح المومنین کی روایت تو بعض جگہ مل جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ غسل امام کا کہیں تذکرہ نہیں لہذا یہ تصریح ارشاد ہو کہ وہ کون سی کتابیں ہیں جن میں اس روایت کا ایک جزو غسل امام بھی ہے۔

۴۔ کیا یہ جائز ہے کہ سب بچے بھوک سے تڑپ رہے ہوں اور پانی غسل میں صرف کر دیا جائے۔ اس کا جواب جناب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ امام علیہ السلام کے بارے میں فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اس موقع پر عرض کرنا ہے کہ میرا مقصد معاذ اللہ ہرگز یہ نہیں کہ امام علیہ السلام کے بارے میں حضور فتویٰ صادر فرمائیں بلکہ یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا یہ امر کسی عالم دین نے خصوصیات امام علیہ السلام میں لکھا ہے کہ بچوں کے پیاس سے جاں بلب ہونے کی حالت میں امام پانی کو غسل مستحب میں خرچ کر سکتے ہیں۔ اگر شریعت محمدی ﷺ کے احکام میں امام علیہ السلام کے لیے ایسا استثناء ایا ہو تو براہ کرم کتاب کا حوالہ مرحمت ہو۔

مجھے امید ہے کہ میرے سوال کے جو پہلو تشنہ جواب رہ گئے ہیں حضور والا ان کا جواب عنایت کر کے رہنمائی فرمائیں گے۔ فقط (بندہ علی)

(نواب) احسان علی خان (آف مالیر کوٹلہ صدر صوبہ پنجاب شیعہ کانفرس)

عالیجناب نواب احسان علی خان صاحب آف مالیر کوٹلہ کے سوالات کا جواب

(سرفراز مورخہ ۷ مارچ ۱۹۴۵ء) دام مجدکم السامی۔ سلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ حسب فرمائش سامی جواب مطابق ترتیب سوالات درج ذیل ہے:

۱۔ اصحاب امام علیہ السلام کی وفاداری کا تقاضہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی تشنگی میں وہ شریک رہے ہوں اور اطفال امام علیہ السلام کا بھی تین دن شدائد تشنگی اٹھانا مسلم ہے۔

۲۔ سند کے اعتبار سے یہ مثل دیگر روایات واقعہ کربلا کے ہے جن کے اعتبار کا دار و مدار صرف ان علماء کی جلالت قدر پر ہے جنہوں نے ان روایات کو درج کیا ہے۔

۳۔ عبد الرحمن ابن عبد ربہ اور بریر کے مزاح المومنین کی روایت کے ملنے کا جن مقامات پر جناب نے تذکرہ فرمایا ہے۔ ان ہی میں آداب طہارت بجالانے کا تذکرہ ہے اور غسل کا تذکرہ اس سے علیحدہ متعدد کتب میں ہے۔ جیسے خصائص حسینیہ۔ بناء الاسلام اور مواعظ حسنہ وغیرہ لیکن اس کے ساتھ تشنگی امام علیہ السلام برابر مسلم رہی ہے۔

۴۔ جی ہاں۔ جناب فقیہ اجل شیخ جعفر تستری اعلی اللہ مقامہ (المتوفی ۱۳۰۳ء) نے اس کو خصوصیات امام علیہ السلام میں ذکر فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب الخصائص مطبوعہ بمبیٔ کتاب العبادات البدنیہ، باب طہارت)

والسلام

علی نقی النقوی عفی عنہ (۹ع ۱۳۶۴ھ)

کتاب میں تبدیلیاں میں خود پیش کروں گا

سرفراز کی حالیہ اشاعت میں آپ نے شہید انسانیت کی مخالفت کے سلسلہ میں جو نام تحریر فرمائے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد اس فہرست میں آسکتے ہیں جو نظر ثانی کے موقع پر کتاب میں تبدیلیاں ہونے کے طرفدار ہوں۔ اس صورت میں میرا نام بھی اس فہرست میں درج کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے جیسا کہ بار بار اعلان ہو چکا ہے کتاب کا یہ خاکہ بغرض مشورہ واستصواب ہی شائع ہوا تھا۔ اس کا بھی اعلان کیا جاچکا ہے کہ تمام اعتراضات ایڈیٹوریل بورڈ میں پیش کر دئے جائیں گے اور بورڈ کو ہر طرح کی ترمیم کا کامل اختیار ہوگا مگر بعض لوگ شائد اس سے یہ مطلب نکال رہے ہیں کہ میں صرف دوسروں کے اعتراضات رسمی طور پر پیش کر کے اپنی طرف سے کتاب کے ہر جز کو باقی رکھنے پر اصرار کروں گا اور اس بارے میں ضد و کد سے کام لوں گا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اعتراضات، انتقادات اور مشورے سے طلب کرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں خود ان تمام انتقادات اور مشوروں کی روشنی میں اس امر پر غور کروں کہ کتاب کے کون اجزاء باقی رکھے جائیں کون حذف کر دئے جائیں اور کن میں مناسب ترمیم کر دی جائے۔

اس غرض سے اعتراضات طلب کئے گئے تھے اور اب بھی میری یہی خواہش ہے کہ مزید اعتراضات جو کچھ ہوں وہ ادارہ کو بھیج دئے جائیں۔ میں ہرگز ایڈیٹوریل بورڈ میں اس امر کی حمایت صحیح نہیں سمجھتا کہ

پوری کتاب بصورت موجودہ قائم رہے اور یقیناً ایسی تبدیلیاں ہیں جنہیں میں خود ضروری سمجھتا ہوں اور انہیں ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔

کتاب "شہید انسانیت" سے قوم کو اختلاف ہونے کی وجہ سے جناب سید العلماءؒ نے اس کتاب کو واپس لے لیا۔ موصوف کا ایک اہم بیان

(سرفراز مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۴۵ء) عالی جناب مہاراجکمار محمد امیر حیدر خان صاحب صدر یادگار حسینی نے ۲۴ مارچ ۱۹۴۵ء کو محمود آباد ہاوس قیصر باغ سے حسب ذیل تحریر ایڈیٹر سرفراز کے پاس روانہ فرمائی ہے۔

مکرمی تسلیم۔ جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ ناظم شعبہ تصنیف یادگار حسینی نے حسب ذیل تحریر کے ذریعہ سے کتاب "شہید انسانیت" کا مسودہ واپس لے لیا ہے۔ لہذا براہ مہربانی تحریر مذکور کو اخبار میں فوراً شائع فرمادیجئے۔

مخلص (دستخط مہاراجکمار) محمد امیر حیدر خان صدر یادگار حسینی (مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۵ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تسلیم۔ ادارہ یادگار حسینی کے بنیادی تجاویز میں سے ایک تجویز کی تکمیل میں میں نے ایک کتاب کا مسودہ شہید انسانیت کے نام سے مرتب کیا جو بغرض استصواب و دریافت آراء طبع کیا گیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ سے اس کتاب کی اشاعت رائے عامہ کے مطابق نہیں معلوم ہوتی اس لیے بہ نظر رفع اختلافات اس کتاب کو واپس لیتا ہوں۔

دستخط (سید العلماء علی نقی صاحب قبلہ مجتہد ناظم شعبہ تصنیف یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ)

جناب سید العلماء سے سوالات اور ان کے جوابات (اخبار حقیقت مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۴۵ء)

مسئلہ آپ کے متعلق مثل دیگر امور کے مرتب کتاب شہید انسانیت سے در حقیقت اسی وقت تبادلہ خیالات کیا جاچکا تھا جبکہ یہ مسودہ کتاب تھوڑا تھوڑا کر کے نکل رہا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جس طبقہ نے افہام

و تفہیم اپنا شیوہ قرار دیا وہ ہمیشہ مطمئن رہا۔ آج بھی در حقیقت یہ سوالات و جوابات ایسے ہی حضرات کے لیے شائع کئے جارہے ہیں جو نوعیت معاملہ کو سمجھنا چاہتے ہیں۔(سائل)

سوال نمبر ا:۔ کتاب شہید انسانیت جو من جناب ادارہ تحریری یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ جناب نے مرتب فرمائی تھی اور جس کا مسودہ بغرض استصواب رائے کتابی شکل میں شائع ہوا اور بعد میں بعض حالات کے ما تحت آپ نے اس کو واپس لے لیا ہے کیا آپ کے نزدیک ایسا نسخہ ہے کہ جس میں کسی ترمیم و تنسیخ اور تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں؟ نیز کیا آپ اب اس کو بجنسہ اپنی ذاتی تالیف یا تصنیف قرار دینے پر تیار ہیں؟

الجواب:۔ کتاب مذکور بحیثیت ذاتی کتاب کے نہیں لکھی گئی تھی۔ ذاتی کتاب کی حیثیت سے شائع کرنے کے موقع پر یقیناً بہت سی تبدیلیاں اس کتاب میں ضروری ہیں۔ نیز بہ حالت موجودہ بھی بعض تبدیلیاں مناسب ہیں۔

سوال نمبر ۲:۔ کتاب شہید انسانیت مذکور میں آپ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ صبح عاشور ان حضرات نے غسل مندوبی فرمایا۔ یہ واقعہ جناب نے اپنی طرف سے لکھ دیا ہے یا کتب سابقہ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اور اگر پچھلی کتابوں میں تذکرہ ہے تو ان میں سے چند کتب کے نام تحریر فرمایئے اور یہ بھی فرمایئے کہ حضرت کے غسل صبح عاشور کی روایت معتبر بھی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غسل فرمانے کا تذکرہ شب عاشور یا صبح عاشور متعدد کتب میں ہے جیسے خصائص حسینیہ، بناء الاسلام، مواعظ حسنہ، وغیرہ لیکن خصوصیت سے صبح عاشور کو غسل کا ذکر عربی میں تاریخ ابن کثیر اردو میں شہید اعظم اور انگریزی میں بھی بعض تواریخ میں موجود ہے پھر بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس روایت کو معتبر سمجھا جائے جبکہ اکثر کتب غسل کی رایت سے خالی ہیں۔

سوال نمبر ۳:۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے قبضہ میں پانی ہو اور آپ اس سے غسل فرمالیں اور نہ خود نوش فرمائیں نہ اصحاب و عزاؑ کو پلائیں؟

الجواب:۔ اگر بہ حیثیت فعل امام ایسا ثابت ہو جائے تو کسی اعتراض کا حق نہیں ہے مگر اصل روایت مستند طریقہ پر ثابت نہیں ہے۔

سوال نمبر ۴:۔ اگر سوال نمبر ۲ کے ماتحت آپ صبح عاشور غسل امام حسین علیہ السلام کی روایت کو معتبر نہیں سمجھتے ہیں تو پھر ارشاد ہو کہ استصواب رائے کے موقع پر اس روایت کے درج کرنے سے آپ کا کیا مقصود تھا؟

الجواب:۔ چونکہ متعدد کتب میں یہ روایت موجود ہے اور بعض علماء نے بہ نظر یہ ظاہر فرمایا ہے کہ وہ منافی تشنگی نہیں ہے بلکہ امام علیہ السلام کی نظر میں عبادت کی اہمیت اس سے ثابت ہوتی ہے اس لیے بہ مواقع استصواب اسے درج کیا گیا تا کہ تبادلہ خیالات کے بعد اگر طے پاجائے کہ وہ روایت خارج کر دی جائے تو یہ اس روایت کے متعلق ایک طرح سے یکسوئی ہو جانے کا ذریعہ ہو۔

سوال نمبر ۵:۔ کتب سابقہ میں کہیں بھی اگر شب عاشور یا صبح عاشور حضرت امام حسین علیہ السلام یا اصحاب امام علیہ السلام کے غسل کی روایتیں موجود ہیں تو کیا ان کتابوں میں ان حضرات کی سہ روزہ تشنگی سے انکار کیا گیا ہے یا سہ روزہ تشنگی کو تسلیم کرتے ہوئے بھی غسل کی روایت درج کی گئی ہے؟

الجواب:۔ سہ روزہ تشنگی سے انکار کسی کتاب میں نہیں ہے۔ بلکہ سہ روزہ تشنگی کو تسلیم کرتے ہوئے اس روایت کو درج کیا گیا ہے۔

سوال نمبر ۶:۔ کیا آپ شہدائے کربلا اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی سہ روزہ تشنگی کے منکر ہیں؟

الجواب:۔ ہر گز ایسا نہیں ہے۔

سوال نمبر ۷:۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مختلف رسائل اور پمفلٹ اور ہینڈ بل آپ کی جماعت میں اس قسم کے شائع کئے گئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام اور ان کے اعزا اور احباب تین روز کے پیاسے نہ تھے اور اگر ان رسائل پمفلٹ اور ہینڈ بلوں سے یہ ثابت نہ ہوتا ہو تو پھر ان کا مفہوم کیا ہے؟

الجواب:۔ جہاں تک مجھے علم ہے ایسا کوئی رسالہ یا پمفلٹ شائع نہیں ہوا ہے جس کا مقصد سہ روزہ تشنگی کا انکار ہو بلکہ جہاں تک میں نے دیکھا ہے ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ روایت غسل خود ساختہ نہیں ہے بلکہ اس کے پہلے بھی اس قسم کی روایات کتب میں موجود ہیں۔

سوال نمبر ۸:۔ کیا یہ ضروری ہے کہ شہیدان کربلا اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی سہ روز تشنگی کا یقین رکھتے ہوئے یہ بھی مانا جائے کہ شب عاشور یا صبح عاشور امام اور اصحاب امام علیہ السلام نے غسل فرمایا؟

الجواب:۔ ایسا ماننا ضروری نہیں ہے۔

سوال نمبر ۹:۔ کیا آپ کربلا میں خیام حسینی اور لشکر حسینی میں سہ روزہ قحط آب کے منکر ہیں؟

الجواب:۔ ایسا نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۰:۔ طہارت بدن وغیرہ کے لیے میدان کربلا میں کیا صورت اختیار کی گئی تھی۔ جناب کی تحقیق اس میں کیا ہے؟

الجواب:۔ روایات اس بارے میں خاموش ہیں صرف ظن و احتمال کی بناء پر اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

سوال نمبر ۱۱:۔ صبح عاشور اگر غسل کی روایت کو تھوڑی دیر کے لیے صحیح بھی مان لیا جائے تو کیا اس موقع کے بعد پھر دن بھر میں کسی وقت کے لیے کسی ایک کتاب میں یہ لکھا ہے کہ حسین علیہ السلام یا ان کے اعزا و انصار و اہل بیت علیہم السلام کے پاس ایک قطرہ آب موجود تھا؟

الجواب:۔ کسی روایت سے ایک قطرہ آب کا بھی وجود ثابت نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۱۲:۔ اگر شہید انسانیت کا آیندہ کوئی ایڈیشن آپ اپنی تالیف یا تصنیف کے طور پر بھی نکالیں گے تو کیا آپ اس روایت غسل صبح عاشور کو کتاب میں باقی رکھیں گے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس روایت کے درج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

دستخط علی نقی النقوی عفی عنہ

مرسلہ اظہار حیدر سیتاپوری

حضرت سید العلماء دام ظلہ کے واضح اور صریح جوابات (اختر فیض آباد، ۴جولائی ۱۹۴۵ء)

بحضور اقدس والا سرکار شریعت مدار حجۃ الاسلام والمسلمین حضرت علامہ سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر والزمان دام ظلہم العالی۔

سوال نمبر ا:۔ کیا سرکار والا نے وجود آب شب عاشور یا صبح عاشورا کو کہیں موثق و معتبر ہے لکھا؟

جواب نمبر ا:۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نہیں میں نے کہیں موثق و معتبر نہیں لکھا ہے۔ اسے بعض علماء نے اپنے کتب میں درج فرمایا ہے بس اس کے سوا کوئی وثوق و اعتبار اس کا نہیں ہے۔

سوال نمبر ۲:۔ کیا سرکار والا امام حسین علیہ السلام اور اصحاب کی سہ روزہ تشنگی کے قائل نہیں ہیں یا حضور والا کو اس میں کوئی شک ہے؟

جواب نمبر ۲:۔ بلاشک وشبہہ سہ روزہ تشنگی کا قائل ہوں۔

سوال نمبر ۳:۔ کیا سرکار والا اس پر مصر ہیں کہ خواہ مخواہ وجود آب کی روایت مان ہی لی جائے؟

جواب نمبر ۳:۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

سوال نمبر ۴:۔ کیا جناب والا کا یہ خیال تھا یا ہے کہ مسودہ شہید انسانیت بالکل صحیح اور ناقابل ترمیم ہے؟

جواب نمبر ۴:۔ نہیں میں نے ایسا کبھی خیال نہیں کیا ہے۔

سوال نمبر ۵:۔ کیا سرکار والا اس کے مقر نہیں ہیں کہ مسودہ شہید انسانیت میں بعض امور قابل اصلاح وترمیم تھے اور ہیں؟

جواب نمبر ۵:۔ بے شک اس میں بعض امور قابل ترمیم ہیں۔

سوال نمبر ۶:۔ کیا حضور والا زیر بحث مسودہ شہید انسانیت کو دوبارہ بعینہ چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں یا اس کا کبھی ارادہ ظاہر کیا ہے؟

جواب نمبر ۶:۔ نہیں ایسا میرا ارادہ نہیں ہے۔ نہ اس کا کبھی ارادہ ظاہر کیا ہے۔

سوال نمبر ۷:۔ کیا سرکار والا کے علم میں مسودہ شہید انسانیت دوبارہ طبع ہوا ہے یا صرف ایک بار؟

جواب نمبر ۷:۔ یقیناً وہ صرف ایک بار طبع ہوا ہے۔

سوال نمبر ۸:۔ کیا حضور والا کی نظر میں کوئی شخص جو توہین امام حسین علیہ السلام کرلے شیعہ کہا جا سکتا ہے؟

جواب نمبر ۸:۔ ہر گز نہیں بلکہ قصداً توہین کرنے والا مسلم بھی نہیں ہے؟

سوال نمبر ۹:۔ کیا سرکار والا خلافت خلفاء ثلاثہ کو برحق سمجھتے ہیں؟

جواب نمبر ۹:۔ ہر گز ایسا نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۰:۔ کیا سرکار والا کے نزدیک قاتلین عثمان خاطی اور جہنمی اور اس طرح کے باغی تھے جیسے نبی یا امام سے بغاوت کرنے والا؟

جواب نمبر ۱۰:۔ نہیں ہر گز نہیں۔

دستخط علی نقی النقوی عفی عنہ

۸ رجب ۱۳۶۴ھ

مکتوب گرامی حضرت سید العلماء مد ظلہ العالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب محترم ایڈیٹر صاحب اختر تسلیم۔ اختر کے تازہ پرچہ میں آپ کی غیر جانبدارانہ رائے نظر سے گزری۔ میں اس کے پہلے برابر یہ اعلان کر تا رہا ہوں کہ مجھے مسودہ شہید انسانیت کے کسی ایک لفظ کے باقی رکھے جانے پر اصرار نہیں ہے۔ نیز یہ بھی اعلان کر چکا ہوں کہ میری نظر میں خود کچھ تبدیلیاں کتاب میں ضروری ہیں۔ اس کے بعد یہ آپ کا مشورہ کہ کتاب کو ان اجزاء کے نکالے جانے کے بعد شائع کیا جائے جن پر کسی جماعت کو اعتراض ہو رہا ہے میرے لیے یقیناً قابل قبول ہے۔ میں آپ کو اس بے لوث معتدل طریقہ کار پر جو آپ نے اپنے اس تبصرہ میں اختیار کیا ہے مبارکباد دیتا ہوں۔

والسلام

دستخط علی نقی النقوی عفی عنہ

۱۰ رجب ۱۳۶۴ھ

شہید انسانیت کے متعلق جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ کا بیان (رضا کار، لاہور، مورخہ ۱۶جولائی ۱۹۴۵ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدیر محترم تسلیم۔ شہید انسانیت کے بارے میں کچھ عرصہ سے قوم شیعہ کے ایک طبقہ میں جو اضطراب رونما ہو گیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے میں نے ابتداء ہی میں چند بیانات اخبار ''سر فراز'' لکھنو میں شائع کئے۔ جن کا مقصد اصلاح حال اور قوم میں سکون پیدا کرنا تھا۔ مگر میرے ان بیانات سے بعض حضرات کو اختصار کی شکایت ہے اور ایک زیادہ واضح بیان کی ضرورت بتائی جا رہی ہے۔ اس لیے حسب ذیل بیان بغرض اشاعت روانہ کیا جاتا ہے:

''شہید انسانیت'' کتاب کسی خاص شخص کی طرف سے نہیں پیش کی جا رہی تھی بلکہ وہ ایک ایسے ادارے کی طرف سے پیش کرنے کے لیے مرتب کی گئی تھی جس کے ارکان اور مجلس مصنفین ہر شعبہ میں غیر شیعہ اور غیر مسلم افراد بھی موجود ہیں۔

ذاتی طور پر اور عہدہ کی حیثیت سے اب مجھ پر دو ذمہ داریاں تھیں۔ ایک اپنے ضمیر اور عقیدہ کی بناء پر یہ کہ عقائد شیعہ اور مفاد ملت حقہ کا تحفظ لازمی ہے۔ دوسری اس حیثیت کے لحاظ سے کہ مجھے ایک ایسے ادارے کی طرف سے کتاب مرتب کرنا ہے جس میں غیر شیعہ افراد بھی موجود ہیں اور کتاب ایسی ہونا چاہئے جسے وہ بھی اپنی جانب منسوب کر سکیں۔

میں نے حتی الامکان ان دونوں پہلوؤں کی حفاظت کی یعنی ایک طرف دوسرے پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ شیعہ معتقدات جن کا تذکرہ اہل سنت گوارا نہیں کر سکتے کہ اگر اس کتاب میں اس طرح نہیں لکھے گئے جس طرح خود میں نے اپنی دوسری کتابوں میں لکھے ہیں یا اب جو ذاتی کتاب لکھی جائے اس میں لکھے جا سکتے ہیں۔ تو دوسری طرف واقعات کے تسلسل میں اجمال کے پردوں میں، ابہام کے طریقوں سے ملت

حقہ کے صحیح عقائد کی حفاظت بھی کر دی جائے۔ اس طرح کہ ملت شیعہ کے خلاف کتاب سے کوئی فائدہ بھی نہ اٹھایا جاسکے اور غیر شیعہ افراد اسے اپنی طرف منسوب بھی کر سکیں۔

مجھے احساس تھا کہ یہ کام مشکل ضرور ہے اور میں چاہتا تھا کہ اس بارے میں ہر طبقہ اور خیال کے لوگوں کی رائے اور ان کے جذبات کا اندازہ کیا جائے۔ اسی لیے میں نے چاہا کہ اس کا پہلا ایڈیشن بہ طور استصواب شائع ہو جائے اور قبل مختتم اور قطعی حیثیت میں شائع ہونے کے وہ لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔ اس اعلان کے ساتھ کہ جس کو کوئی اعتراض ہو، جس کی کوئی رائے ہو۔ جس کو کوئی مشورہ دینا ہو وہ ادارے کو مطلع کر دے تا کہ انہی اعتراضات، انتقادات اور مشوروں کی روشنی میں اس کتاب کی دوسری مرتبہ تالیف و تدوین ہو اور وسیع اشاعت کی جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ نیک نیتی کے ساتھ اس بارے میں جو اعتراضات ہوں گے جو مشورے دے جائیں گے جو نکتہ چینیاں کی جائیں گی۔

وہ ہمارے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ہوں گی۔ اسی لیے میں نے اعتراضات سے کوئی ناگواری محسوس نہیں کی نہ ان کو جواب دینے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ وہ اعتراض ت تو میری خواہش کے مطابق اور میرے مقصد کے لیے معین و مدر گار تھے۔ مگر ایک طبقہ نے بجائے علمی حیثیت سے اعتراض و انتقاد کے ہنگامہ آرائی اور شورش مناسب سمجھی۔

چونکہ میرا مقصد ہر گز خدانخواستہ اپنی جماعت کے کسی مفاد کو نقصان پہنچانا یا جذبات کو مجروح کرنا نہیں تھا بلکہ نیک نیتی کے ساتھ ایک کوشش تھی۔ اس بات کی کہ مختلف اقوام کو حسینیت کے نقطہ پر جمع کیا جائے۔ اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے کارنامہ جاوید کی عظمت کو سب کی طرف سے متفقہ طور پر ظاہر کیا جائے اور اس لیے مجھے خود اپنی قوم کے مفاد اور جذبات کی قدر تھی اور ان کے ساتھ ہمدردی تھی اور یہ بھی امکان محسوس ہوتا تھا کہ کسی مقام پر تعبیر مطلب میں فرد گذاشت ہو گئی ہو۔ جس کی وجہ سے کسی کو میری مراد کے خلاف توہم پیدا ہوتا ہو۔

اسی لیے میں نے ایک لمحہ بھی ضد اور کد سے کام نہیں لیا۔ بلکہ یہ اعلان کر دیا کہ مجھے ایک لفظ کے بھی باقی رکھے جانے پر اصرار نہیں ہے۔ بلکہ ایڈیٹوریل بورڈ میں تمام اعتراضات پر غور کیا جائے گا اور مناسب تبدیلیاں کی جائیں گی۔ اس کے بعد جب یہ خیال کیا گیا کہ میں صرف دوسروں کے اعتراضات کو رسمی طور پر پیش کروں گا۔ لیکن خود اس کے خلاف بحث کروں گا اور ہر جزو کے باقی رکھنے پر اصرار کروں گا تو اس غلط فہمی کے دور کرنے کے لیے میں نے یہ اعلان کیا کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔

بلکہ تمام اعتراضات پر غور کر کے میں خود تبدیلیاں تجویز کروں گا اور ایڈیٹوریل بورڈ میں پیش کروں گا۔ میرے خیال مین نیک نیتی کے ساتھ تحفظ مفاد شیعیت کا مقصد حاصل ہونے کے لیے یہ صورت مناسب تھی کہ ایڈیٹوریل بورڈ میں ان تمام چیزوں کو پیش کر دیا جاتا اور وہاں سے ہر اعتراض پر غور کر کے مناسب تبدیلیاں ہو جاتیں مگر اس کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ رفع نزاعات کے لیے تمام وکمال اس کتاب کا ادارہ سے واپس لینا مناسب ہو گا۔ اس وقت یہی معلوم ہو تا تھا کہ اس واپسی کے بعد تمام نزاع ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے کتاب واپس لے لی اور اس اعلان واپسی کی بناء پر ادارہ کی مجلس عاملہ کی طرف سے بھی اس کو کالعدم کر دیا گیا۔ اس کے بعد چند دن ایسا محسوس ہوا کہ ہنگامہ فرد ہو گیا۔

مگر پھر ایسا معلوم ہوا کہ ہنوز روز اول ہے۔ اعتراضات جو اس سلسلہ میں کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تعبیر مطلب میں کسی کوتاہی کا نتیجہ ہیں جیسے ڈاکٹر وحید مرزا صاحب کی انگریزی عبارت کے ترجمہ مشرکین کے خیالات بیان کرتے ہوئے انہیں یہ محسوس ہوا کہ یہ نرا پاگل نہ تھا اور بعض مقامات پر بغاوت یا باغی کی لفظ کا اطلاق۔

حالانکہ مراد وہاں وہ نہیں ہے جو معترضین الفاظ سے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر زیادہ تر ایسے ہیں جو غلط بیانی پر مشتمل ہیں یا ان میں تحریف سے کام لیا گیا ہے۔ یا نوعیت تحریر پر غور نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ اس کتاب میں قاتلان حسین علیہ السلام کو شیعہ کہا گیا ہے بالکل غلط الزام ہے۔ بلکہ اس میں شیعیان کوفہ سے قتل امام حسین علیہ السلام کے الزام کو رفع کیا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ اس کتاب میں خلفائے ثلاثہ کی مدح

ہے یا ان کی خلافت کی حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس میں ایسی چیزین موجود ہیں جن سے شیعی نقطہ نظر سے ان کی خلافت کا بطلان ثابت ہو جاتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ وہ ایسے طریقہ سے ہیں جن کو سنی جماعت بھی مسترد نہ کر سکے اور ناگواری محسوس نہ کرے۔ ان کی خلافت کی کامیابی دنیاوی طریقہ پر مذکور ہے جو شیعہ نقطہ نظر سے معیار حقانیت نہیں ہے اور مسلم الثبوت خلیفہ ان کے خود ساختہ اصول کی بناء پر ہے جس اصول ہی کو شیعہ نہیں تسلیم کرتے۔ اور اسی اعتبار سے ان کے مخالف گروہ کی کوششوں پر بغاوت کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر غیر مسلم سلطنتوں تک کی مخالفت کرنے والوں کو باغی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ سلطنیتں کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتیں نہ ان کے مخالف شرعی حیثیت سے باغی کی تعریف میں داخل ہیں۔

جب کہ کتاب کے اندر وہ چیزیں موجود ہیں جن سے شیعی نقطہ نظر سے اس حکومت کا حکومت جور ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس لیے ہر گز یہ کتاب شیعوں کے خلاف حربہ نہیں بن سکتی سب سے زیادہ وہ چیز جس پر عوام میں ہیجان پیدا کیا جاتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا ایک خیمہ میں غسل اور آداب طہارت ادا کرنے تشریف لے جانا ہے۔ اس بارے میں بالکل غلط طور پر یہ چیز پھیلائی گئی ہے کہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی تشنگی کا معاذ اللہ منکر ہوں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ تشنگی امام علیہ السلام ایک مسلم اور متواتر حقیقت ہے ساتویں سے پانی بند ہونا بھی یقینی ہے تین دن تک امام علیہ السلام، اصحاب امام علیہ السلام اور اطفال امام علیہ السلام کا شدائد تشنگی اٹھانا بھی مسلم ہے۔ خود شہید انسانیت میں ۲۲ جگہ امام علیہ السلام کی پیاس اور سہ روزہ تشنگی کا ذکر ہے۔

لیکن اس کے ساتھ کتابوں میں مختلف اوقات میں بعض اصحاب یا اعزا مثلاً حضرت عباس علیہ السلام یا حضرت علی اکبر علیہ السلام کا اٹھویں یا نویں کو پانی لانے کا ذکر ملتا ہے اور اسی کے ساتھ بعض کتابوں میں شب عاشور یا صبح عاشور غسل کا تذکرہ بھی ہے۔ کبھی علماء نے اس کے پہلے ان روایات پر نقد و تبصرہ نہیں کیا۔ اور نہ ان کے خلاف اس سے پہلے آواز بلند کی گئی۔ اس بناء پر میں نے بھی دو جگہ اس کا تذکرہ شہید انسانیت میں کر دیا۔ جس کے ساتھ میرے زاویہ خیال میں ہر گز یہ تصور نہ تھا کہ اس کو امام علیہ السلام کی تشنگی کی نفی کے مرادف سمجھا جائے گا۔

نہ اس پر اس حیثیت سے کوئی ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جس طرح سے احکام فقیہ کے استنباط میں احادیث کی جانچ کی جاتی ہے کہ روایت کی جانچ پر تال ہو اور صحیح یا حسن روایت قبول کی جائے اس طرح واقعات تاریخی کے تفصیلی حالات میں جانچ کی ہی نہیں جاسکتی۔

اس لیے کہ اس طرح سے روایات کی سند موجود نہیں ہے یا موجود ہے تو اس امر پر منطبق نہیں ہے اور جب تک کہ اس طرح کی روایات نہ موجود ہوں بحیثیت واقعہ کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ واقعاً ایسا ہوا۔ یہی صورت اس روایت کے بارے میں ہے کہ نہ وہ متواتر ہے نہ صحیح السند ہے۔ اس لیے ہر گز یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ واقعاً ایسا ہوا۔ ہاں تشنگی امام اور ساتویں سے قحط آب مسلم اور قطعی ہے اور اس کے خلاف جو روایت ہو وہ یقیناً رد کرنے کے قابل ہے۔

والسلام
علی نقی النقوی[1]

---

[1] اظہار حق، جعفر شیر وانی، ص۳۸تا۵۶۔

عکس کتاب ''شہید انسانیت''

ا
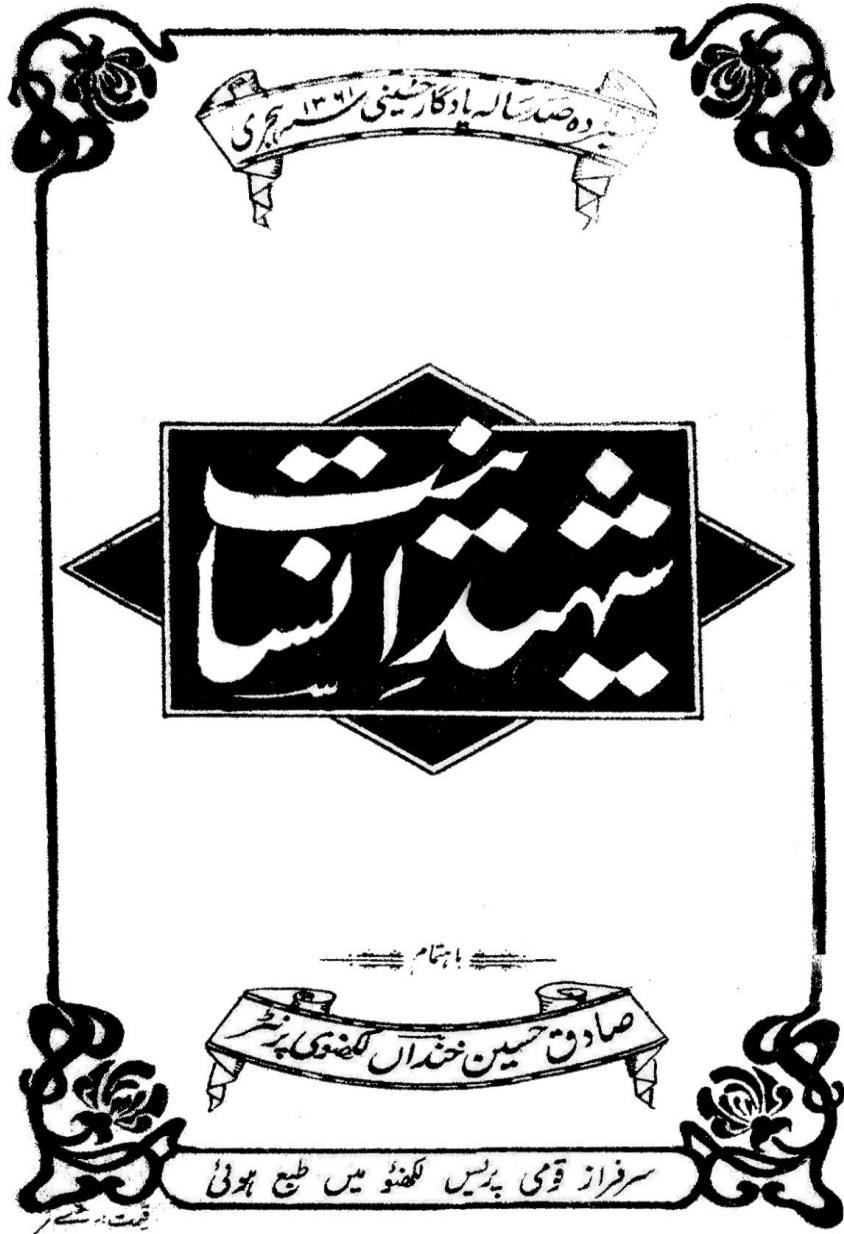
کتاب تجویز شدہ متعلق یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ھ

شہید انسانیت

(مرتبہ)

ادارۂ تحریری مرکزی سیزدہ صد سالہ
یادگار حسینی لکھنؤ

مخصوص ایڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اور
منتخب اہل قلم کے لئے

مطبوعہ
سرفراز قومی پریس لکھنؤ

شہید انسانیت ۲

بیان حال

یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ ہجری کے سلسلہ میں واقعہ کربلا کے اسباب، حالات، اور نتائج کے متعلق جس کتاب کا اعلان ہوا ہے اس کی ترتیب و تدوین کیلئے ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل ہوئی تھی مگر عملی صورت سے یہ صورت غیر ممکن ثابت ہوئی کہ تمام ارکان مجتمع ہوکر اس کی ترتیب میں حصہ لیں اس لیے تمام مضامین اور عناوین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادارہ کی جانب سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے۔ اور اب اس کو طبع کرا کر تمام ایڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اور منتخب اہل قلم کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ ان حضرات سے گزارش ہے کہ اس کتاب کے تمام اجزاء کا نظر غائر سے مطالعہ فرمائیں۔ اور جس مقام پر اضافہ کی ضرورت ہو یا کمی لازم ہو یا ترتیب کا بدلنا مناسب معلوم ہو۔ وہاں اپنا نوٹ تحریر فرما دیں اور اس کتاب کے ان کے پاس پہونچنے کے بعد ایک ماہ کے اندر اپنی زرّیں رائے سے ادارہ کو مستفید فرمائیں تاکہ ان کے آراء اور قیمتی مشوروں کی روشنی میں اس کتاب کی آخری تدوین و ترتیب کا کام انجام پائے اور پھر اس کتاب کی وسیع اشاعت کی جائے۔ والسلام

ناظم شعبۂ تصنیف یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ

۲ ر رجب ۱۳۶۱ھ ہجری

وہ افراد اہل قلم جن کے نتائج قلمی اور دماغی کاوشیں اس کتاب کی تالیف میں شریک ہیں

(ہر ایک نام کے مقابل ہیں وہ مقدار صفحات یا سطور کی درج ہے جو کسی ایک صاحب قلم کے اس کتاب میں یک جا یا متفرق طور پر درج ہیں)

شمارہ	نام	تعداد سطور	تعداد صفحات
۱	گبن مصنف زوال سلطنت روما	۲	۰
۲	مسٹر جان پونگ	۲	۰
۳	سوامی شنکر اچاریہ	۲	۰
۴	ریویرنیڈ فادر پیلاشس ایس جے پی، ایچ ڈی ڈی سابق پرنسپل سینٹ ایکسویرس کالج بمبئی	۲	۰
۵	ہز ہائنس ناصر الملک آف چترال	۲	۰
۶	کارلائل	۳	۰
۷	ہز ہائنس نواب صاحب خنجرہ	۳	۰
۸	قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ (بمبئی)	۳	۰
۹	خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری (موگا کالج)	۳	۰
۱۰	سر بہرام جی جی جی بھائی (بمبئی)	۴	۰
۱۱	بابو راجندر پرشاد ایم اے۔ ایم ایل۔ ایل، ایل، ڈی سابق صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس (پٹنہ)	۴	۰
۱۲	دستور کیخسرو مہیار کتور پیشوائے اعظم فرقہ پارسی (بمبئی)	۴	۰
۱۳	مولانا اختر علی صاحب تلہری (شاہجہانپور)	۴	۰
۱۴	ہز اگزالٹیڈ ہائنس محمد عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن	۵	۰
۱۵	مصور فطرت خواجہ حسن نظامی (دہلی)	۵	۰
۱۶	ہز ہائنس مہاراجہ ہلکر آف اندور	۵	۰
۱۷	مہاتما گاندھی (واردھا)	۶	۰
۱۸	مسٹر براؤن (مصنف تاریخ ادبیات ایران)	۶	۰
۱۹	سر رادھا کرشنن وائس چانسلر ہندو یونیورسٹی بنارس	۶	۰

شہید انسانیت

(ی)

شمارہ	نام	تعداد مسلوم	تعداد [illegible]
۲۰	سر فریڈرک جیمس گولڈ	۶	۰
۲۱	مولانا شبلی نعمانی (مصنف سیرۃ النبی)	۶	۰
۲۲	ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی صدر شعبۂ تاریخ لکھنؤ یونیورسٹی	۶	۰
۲۳	مسٹر بی، جی کھیر سابق وزیر اعظم (بمبئی)	۷	۰
۲۴	مولانا محمد عبد الحامد صاحب بدایونی	۷	۰
۲۵	مولانا سید آغا مہدی صاحب رضوی (لکھنؤ)	۷	۰
۲۶	کیپٹن ایل، ایچ بنٹ جے، پی	۸	۰
۲۷	جسٹس سر شاہ محمد سلیمان	۸	۰
۲۸	مہاتما شانتی پرکاش صدر شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ	۸	۰
۲۹	ہز ہائنس مہاراجہ جیواجی راؤ سیندھیا آف گوالیار	۹	۰
۳۰	سکریٹری سید واڑہ حسینی یادگار کمیٹی بلگرام (مصنف حسین بیتی)	۱۱	۰
۳۱	سید ارشاد حسین صاحب اظہر بی، اے۔ ایل، ایل۔ بی۔ رائے بریلی	۱۱	۰
۳۲	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری (الہ آباد یونیورسٹی)	۱۲	۰
۳۳	ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (شانتی نکیتن)	۱۴	۰
۳۴	ذاکر حسین صاحب فاروقی بی، اے (بمبئی)	۱۴	۰
۳۵	سید عابد حسین صاحب کجھوی ایڈیٹر مسلم ریویو لکھنؤ (سیوان)	۱۴	۰
۳۶	سید نواب علی صاحب سفیر سنڈیلوی	۱۴	۰
۳۷	آنریبل ڈاکٹر سر سید سلطان احمد (پٹنہ)	۱۵	۰
۳۸	منشی پریم چند ورما	۱۵	۰
۳۹	مسٹر کے، ایل رلیا رام (لاہور)	۱۵	۰
۴۰	نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر امیر پائگاہ حیدر آباد دکن	۱۶	۰
۴۱	ڈاکٹر سوکمار بنرجی (لکھنؤ یونیورسٹی)	۱۷	۰
۴۲	سید مصور حسین صاحب نجم امروہوی	۱۷	۰
۴۳	پنڈت جواہر لال نہرو سابق صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس	۱۸	۰

(۱۵)

شہید انسانیت

شمارہ	نام	تعداد سطر	تعداد صفحہ
۴۴	آغا طاہر صاحب نبیرۂ آزاد دہلوی	۱۹	۰
۴۵	مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری پرنسپل جوادیہ کالج بنارس	۱۹	۰
۴۶	سید آل رضا صاحب رضا ایڈوکیٹ لکھنؤ	۱۹	۰
۴۷	علامہ کیپٹن چریا کوٹی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)	۲۰	۰
۴۸	سید سبط محمد صاحب نقوی	۰	۱
۴۹	مسز سروجنی نائیڈو (حیدر آباد دکن)	۳	۱
۵۰	ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد سابق دستور اعظم حیدر آباد دکن	۶	۱
۵۱	مسٹر سی، ایس رنگا ایر سابق ایم، ایل، اے سنٹرل مدراس	۷	۱
۵۲	مولانا سید مبارک علی صاحب عالم (آگرہ)	۸	۱
۵۳	پنڈت برج ناتھ صاحب شرغا ایڈوکیٹ (لکھنؤ)	۱۳	۱
۵۴	مولانا سید ابن حسن صاحب رضوی جارچوی ایم، اے۔ ایم، او، ایل لکھنؤ	۱۵	۱
۵۵	مولانا ابوالکلام آزاد صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس	۱۶	۱
۵۶	سید خورشید حسین صاحب نقوی (کانپور)	۶	۲
۵۷	سید احتشام حسین صاحب رضوی ماہلی ایم، اے (لکھنؤ یونیورسٹی)	۱۰	۲
۵۸	علامہ سید محسن امین عاملی (مصنف اعیان الشیعہ) (دمشق)	۱۷	۲
۵۹	بھدنت بودھانند مہاستھویر (لکھنؤ)	۱۸	۲
۶۰	سید غضنفر علی صاحب زیدی (مصنف دور استبداد)	۲۰	۲
۶۱	سید ریاض علی صاحب ریاض بنارسی (مصنف شہید اعظم)	۲۲	۲
۶۲	شاعر انقلاب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی	۱	۳
۶۳	مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی (مراد آباد)	۲	۳
۶۴	مولانا عینی شاہ صاحب نظامی (حیدر آباد دکن)	۸	۳
۶۵	سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم، اے (صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی)	۱۷	۳
۶۶	مرزا محمد عسکری صاحب بی، اے (لکھنؤ)	۱۸	۳
۶۷	علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی (مصنف نہضۃ الحسین) بغداد	۱۸	۳

شہیدِ انسانیت

(ل)

شمارہ	نام	تعدادِ سطور	تعدادِ صفحات
٦٨	مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی (سرپرست رسالہ البرہان لدھیانہ)	١٢	۴
٦٩	نواب الحاج سید محمد عباس صاحب طالب صفوی اخباری (شمس آباد)	١٢	۴
٧٠	سید کلب مصطفیٰ صاحب بی، اے، ایل، ایل، بی (لکھنؤ)	١۴	۴
٧١	مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری (کذا جامعہ از ہر مصر) (ناظمیہ کالج لکھنؤ)	٠	٦
٧٢	مولانا محمد لغت امام صاحب پھلواڑی	١٦	٦
٧٣	پنڈت چندر کا پرشاد جگیاسو (لکھنؤ)	٩	٧
٧۴	محمد صادق حسین صاحب بی، اے (علیگ) ہردوئی	٢	٨
٧٥	علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء (نجف اشرف)	١٦	٨
٧٦	مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی (لکھنؤ)	١٢	١١
٧٧	خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر	٨	١٣
٧٨	سید اشفاق حسین صاحب ایم، اے بار ایٹ لا (سیتاپور)	٢٢	١٣
٧٩	ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی	١١	١٧
٨٠	علامۂ ہند مولانا سید احمد صاحب (لکھنؤ)	۴	١٩
٨١	خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب (مصنف ناموس اسلام) پٹیالہ	٧	١٩
٨٢	سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایم، اے ایڈوکیٹ (پٹنہ)	١٨	٢٠
٨٣	مرتب و مولف کتاب ناظم ادارہ یادگار حسینی علی نقی النقوی (لکھنؤ)	٠	۴٧٨

سوائے ناظم ادارہ کے ہر ایک شخص کا مقولہ یا مضمون جہاں سے شروع ہوا ہے نشان عہ بنا کر فٹ نوٹ میں یا عبارت کے قبل اصل کتاب ہی میں اُس شخص کا نام درج ہے اور جتنی عبارت دو طرفہ واوین (" ") کے درمیان ہے وہ اسی شخص کی ہے جو اجزا اس طرح کے نشان اور واوین کے باہر ہیں انھیں ناظم ادارہ کے قلم کا سمجھنا چاہیئے۔ والسلام

علی نقی النقوی

ناظم مرکزی و ناظم شعبہ تصنیف یادگار حسینی ١٣٦١ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و بہ نستعین

دیباچہ

دنیا میں کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے "عرب" کا نام نہ سنا ہو۔ "عرب" ایک بڑا صحراوی ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر دریائے احمر لہریں مار رہا ہے۔

"عرب" میں قریش کا قبیلہ نسبی شرافت کے اعتبار سے نہایت ممتاز تھا۔ جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے۔ نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے بڑی عزت اور بلندی حاصل کی۔ قصی کے فرزندوں میں عبد مناف کو کعبہ کی تولیت اور قریش کی ریاست حاصل ہوئی۔ وہی کعبہ جس کے پاس آج تمام دنیا کے مسلمان حج کے لیے جاتے ہیں۔ یہ اسلام سے مدتوں پہلے بھی عرب کا سب سے بڑا عبادت خانہ اور مذہبیت اور تقدس کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کی تولیت اور مجاوری ایک بہت بڑا منصب تھا جو اس خاندان سے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ سخاوت، کرم، خدمت خلق اور انسانیت کے تمام اچھے اخلاق و اوصاف میں یہ لوگ نمایاں درجہ رکھتے تھے۔

عبد مناف کے فرزندوں میں ہاشم بڑے صاحب صولت اور با اثر تھے اگرچہ اُن کے بھائیوں میں عبد الشمس کا بھی شمار تھا مگر اپنے باپ کے اوصاف و مراتب کی پوری شان ہاشم ہی میں نظر آتی تھی اس لیے وہ تمام امتیازات جو عبد مناف کو حاصل تھے وہ اُن کے بعد ہاشم کے لیے تسلیم کیے گئے۔

امیہ جو اپنے کو عبد الشمس کا بیٹا کہتا تھا اُس نے ہاشم کا مقابلہ کرنا چاہا اور کوشش کی کہ عزت اور سرداری کا تاج حضرت ہاشم کے سر سے اتارلے مگر نتیجہ میں ناکامی اور رسوائی ہوئی

شہید انسانیت ۴

مخالفت کی آگ کے شعلے حسرت اور بے چارگی کے ساتھ وقتی طور پر بیٹھ گئے مگر دل میں حسد اور عداوت کی چنگاریاں سلگنے کے لیے رہ گئیں۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے اختلافات کی ابتدا یہیں سے ہے

ہاشم کے بعد اُن کے بیٹے عبد المطلب خانۂ کعبہ کے مجاور ہوئے اور اس خدمت سے عظمت حاصل کرنے کے علاوہ اپنے بلند انسانی اوصاف کی بدولت عام ہر دلعزیزی حاصل کی۔

عبد المطلب کے دس بیٹے تھے جن میں سے ایک عبد اللہ اور ایک ابو طالب تھے۔

عبد اللہ کے فرزند حضرت محمدؐ وہ عظیم المرتبت انسان ہوئے جس نے کلمۂ توحید اور دین اسلام کا پیغام پہونچایا اور اپنی پیغمبری کا اعلان کر کے بت پرستی کی مخالفت کی۔

ابو طالب کے فرزند علیؑ تھے جنھوں نے اس آواز پر لبیک کہی اور دوست و بازو بن کر اسلام کی اشاعت میں حضرت محمدؐ کا ساتھ دیا۔

اس موقع پر بنی امیہ کو اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر کہیں لوگوں نے حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول اور اُن کے دین کو مذہب حق تسلیم کر لیا تو بنی ہاشم کے مذہبی اقتدار کے سامنے ہمارا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے گا اگرچہ حضرت محمدؐ کی تعلیم براہ راست کسی خاندان کی بلندی اور کسی خاندان کی پستی کی حمایت نہیں کرتی تھی مگر آپ کی تعلیم میں بلندی اور عزت کا جو معیار قرار دیا گیا تھا وہ صرف کردار کی خوبی اور فرائض انسانی کی بجا آوری تھی۔ اس معیار پر بنی امیہ کے اکثر افراد پورے نہ اُترتے تھے اور اس طرح اُن کے اقتدار کو سخت صدمہ پہونچتا تھا چنانچہ امیہ کے پوتے ابو سفیان نے محمدی تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ عرب کے راسخ العقیدہ بت پرست اس علم کے نیچے جمع ہو گئے اور حضرت محمدؐ کو ستانے اور تبلیغ اسلام میں روڑے اٹکانے لگے۔ پہلے تو آپ مصیبتیں اور سختیاں جھیلتے رہے مگر جب اُن لوگوں نے ایکا کر کے آپ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو مجبوراً آپ اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ میں جا بسے جہاں کے لوگوں نے آپ کی تعلیم کو قبول کیا تھا اور آپ کی امداد کا اقرار کیا تھا اسی واقعہ کو "ہجرت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی ہجرت کے واقعہ سے مسلمانوں میں سنہ ہجری کا حساب کیا جاتا ہے جس کو اب کی اپریل ۱۹۴۲ء میں تیرہ سو اکسٹھ (۱۳۶۱) برس ہوئے ہیں۔

دشمنوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور کئی مرتبہ چڑھائی کر کے آپ کو قتل کرنے آئے۔ مجبوراً آپ کو کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر و احد اور احزاب

[illegible] لڑائیاں ہیں ان میں مخالف جماعت کا سرگروہ وہی ابوسفیان تھا جو حرب بن امیہ کا بیٹا تھا مگر ان تمام لڑائیوں میں ابوسفیان کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور حضرت محمدؐ کے پیرووں کی تعداد اور اُن کی طاقت برابر بڑھتی رہی۔ آخر بنی امیہ کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اب اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اُنھوں نے بھی قبول اسلام کی نقاب ڈال لی اور وہ موقع کے منتظر رہنے لگے کہ کب اسلام کی طاقت ذرا کمزور ہو اور کب اُنھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے۔

حضرت محمدؐ کی زندگی میں اُن کی اس آرزو کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت کی وفات ہوگئی۔ اس بڑے حادثہ نے مسلمانوں کے نظام میں بہت ابتری پیدا کی۔ بہت سے لوگ مختلف اطراف میں جو اس موقع کے منتظر تھے اُنھوں نے سر اٹھایا اور اسلام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا کچھ آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینا بند کر دی مسلمان ان شورشوں کے دبانے میں لگ گئے اور بہت مشکلوں سے اس میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانہ میں روم اور فارس کے بڑے ممالک سے مسلمانوں کو جنگ درپیش ہوگئی۔ یہی پُرآشوب اور انقلابی دور وہ تھا جس کے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھا کر بنی امیہ کو دمشق میں اپنی حکومت قائم کرا لینے کا موقع مل گیا۔ یہ حکومت شروع میں صرف ایک صوبیدار یا گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ آخر میں اُس نے خود مختار حکومت کی حیثیت حاصل کر لی

ان لوگوں نے شام کے ملک میں اپنا قبضہ جماتے ہی حضرت محمدؐ کے رائج کئے ہوئے طریقہ کو اور اسلام کی پھیلائی ہوئی مساوات کو مٹانا شروع کر دیا اور آخر میں تو یہ حالت ہوئی کہ احکام اسلام کی علانیہ مخالفت ہونے لگی اور تختِ حکومت کا ورثہ دار ابوسفیان کا پوتا یزید بن معاویہ قرار پایا جو بڑا ہی شراب خوار اور بدکردار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب تھا جن کا تذکرہ بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔

حضرت محمدؐ کے جانشین اور اُن کی اولاد اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ حضرت علیؑ کا آخری زمانہ اسی گروہ سے مقابلہ میں صرف ہوا تھا۔ حضرت علیؑ کے بعد اُن کے بڑے بیٹے حضرت حسنؑ نے کچھ شرائط کے ساتھ ان لوگوں سے صلح کی تھی مگر اُن شرائط کی پابندی نہیں کی گئی اور خفیہ طور پر زہر دے کر اُن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب پیغمبرؐ کے خاندان میں پوری ذمہ داری حسینؑ

پر تھی جو حضرت محمدؐ کے دوسرے نواسے اور علیؑ کے چھوٹے بیٹے تھے۔

؎ ”یزید نے حکومت کے نشہ میں اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے لیے اسلام کے اصولوں کی مخالفت کھلے خزانوں شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید کے ”من بھائے اصول“ اسلام کے اصول سمجھے جانے لگے اور لوگوں کے دلوں میں خدا کے خوف کے بدلے یزید کا ڈر سما گیا، دنیا یزید کی طرف جھک پڑی۔ اتنی بڑی حکومت کے بعد یزید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دنیا میں مجھے کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ پھر کیا تھا یزید کی نگاہ بغیر کسی خیال کے حسینؑ کی طرف اٹھ گئی اور یہ مشورے ہونے لگے کہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ یزید کی بیعت کریں۔ یزید جانتا تھا اور خوب جانتا تھا کہ اسلام کے وہ اصول جو رسول اسلام نے دین اور دنیا کی کامیابی کے لیے مقرر کئے تھے ان کا حقیقی محافظ رسول کے نواسے کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ممکن ہے کہ سچائی کی آواز پر دنیا سمٹ آئے اور اپنا بنایا ہوا گھروندا زمین پر آرہے۔ اس لیے یزید کو ضرورت ہوئی کہ حسینؑ کو اپنا فرماں بردار بنا لیا جائے تاکہ دنیا یہ سمجھ سکے کہ جب رسول کے نواسے نے یزید کو قابل بیعت سمجھ لیا ہے تو یزید سچائی پر ہے۔“ اس طرح وہ فتح جو حضرت محمدؐ یا اُن کے دین (اسلام) کو بنی امیہ کے خلاف حاصل ہوئی تھی آئینی طور پر شکست میں تبدیل ہو جاتی اور یزید کے بزرگوں کی شکست کا بدلا ہو جاتا۔

حسینؑ ایسے بے نفس انسان تھے کہ اگر صرف شخصی اقتدار کا معاملہ ہوتا تو وہ اس پر تیار ہو جاتے کہ یزید کی سلطنت کو منظور کرلیں مگر وہ یزید کے افعال و اوصاف کو دیکھ رہے تھے جو صاف صاف آئین اسلام سے اعلان جنگ کے مرادف تھے حسینؑ نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

یزید حسینؑ کے عزم و ارادہ کی پوری طاقت سے واقف نہ تھا اس لئے اس نے تشدد کے احکام جاری کئے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح حسینؑ کا سر جھکوا لیا جائے گا مگر جتنا جتنا یزیدی حکومت کا تشدد بڑھتا گیا اُتنا اتنا حسینؑ کے صبر و استقلال میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ہر مصیبت کے برداشت

؎ حسین پیمبر مرتبہ سید اداره حسینی یادگار کمیٹی بلگرام

کرنے پر تیار نظر آئے۔

پہلا ہی حکم جو یزید نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا لکھا یہ تھا کہ حسینؑ سے بیعت لو اور اس معاملہ میں کسی مراعات سے کام نہ لو، حسینؑ نے اس پیغام کے معنی سمجھ لئے اور وہ اسے پہلے سے سمجھے ہوئے تھے۔

"بیعت" اُن کے لیے غیر ممکن چیز تھی۔ سر کا قلم ہونا بے شک آسان تھا مگر حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد جو اسلامی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔

حسینؑ نے اس کے لیے اپنے وطن کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنے تمام گھر کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور اپنے خاص عزیزوں، بھائیوں بھتیجوں اور بیٹوں کو اپنے ہمراہ لیا اور مکہ میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح آپ اپنی مخالف جماعت کو بتلانا چاہتے تھے کہ آپ کسی سے جنگ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کے خواہاں ہیں۔

مکہ عرب کے بین الاقوامی قانون کے مطابق اور پھر اسلام کے آئین کے موافق ایک امن کا مقام تھا جہاں کسی کے لیے خطرہ نہ ہونا چاہئیے مگر حسینؑ کو یہاں اپنے قتل کا سامان دکھائی دیا مجبوراً ایسے وقت پر جب تمام عالم اسلامی مکہ کی طرف کھنچا چلا آ رہا تھا حسینؑ نے مکہ کو ترک کر دیا۔ یہاں سے نکل کر اب آپ کہاں جاتے؟ ناچار کوفہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ آپکے بڑے اصرار کے ساتھ بلا رہے تھے اور آپ سے مذہبی رہنمائی کے طالب تھے۔ آپ اپنے چچا زاد بھائی مُسلمؑ کو وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کیلئے بھیج بھی چکے تھے۔ اب آپ خود اسی طرف روانہ ہوئے مگر اس درمیان میں کوفہ کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی، وہاں سنگدل حاکم عبید اللہ بن زیاد کا اقتدار قائم ہو گیا اور مُسلم بن عقیل قتل کر دئے گئے۔ اب آپ کو کوفہ میں کوئی امید باقی نہیں رہی تھی مگر مکہ اور مدینہ جانے کا بھی موقع نہ تھا اُدھر کوفہ سے آپکے گرفتار کرنے کو فوج بھیجدی گئی جس نے آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی زمین پر اُتر پڑے۔ دوسرے ہی دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا تمام راستے بند کر دیئے گئے اور امام حسینؑ کو ان فوجوں میں گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔

حسینؑ کے ساتھ صرف اُن کے سترہ ۱۷ اٹھارہ ۱۸ عزیز اور چند خاص دوست تھے جو کوفہ سے

شہید انسانیت ۸

یا بعض دوسرے مقامات سے آپ کے پہونچنے کی خبر سُنکر کسی طرح آپ تک پہونچ گئے تھے اُن کی تعداد دو سو سے بھی کم تھی۔

آپ اپنے وظیفۂ منصبی اور فرض انسانی کی بنا پر امن و امان کے محافظ تھے اس لیے آپ نے یزیدی فوج کے افسر (عمر بن سعد) کے سامنے ایسی صورتیں پیش کیں کہ معاملات رفع دفع ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ آپ کا طریقہ کار اتنا سُلجھا ہوا تھا کہ عمر بن سعد اس کا قائل ہو گیا کہ حسینؑ صلح کے راستے پر گامزن ہیں عمر سعد نے کوفہ کے حاکم ابن زیاد کو اس مضمون کا خط بھی بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا اُس نے حسینؑ کو پہچانا بھی نہ تھا کہ وہ مشکلات کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں۔ اُس نے آپ کی صلح پسندی کو کمزوری کا نتیجہ خیال کیا اس لیے اس نے کہا کہ حسینؑ کو یزید کی بیعت کر لینا چاہیئے تب اُن کی جان بچ سکتی ہے یہ وہ بات تھی جسے پہلے ہی حسینؑ طے کر چکے تھے کہ ناممکن ہے۔ انھیں بیعت کرنا ہوتی تو پہلے ہی دن کیوں نہ کرتے۔ اب خطرہ کو سامنے دیکھکر وہ اس بیعت پر تیار ہو جاتے تو وہ ایک کمزور نفس اور ضمیر کے انسان ثابت ہوتے اور وہ حسینؑ نہ ہوتے کوئی اور شخص ہو سکتا تھا۔

آپکے سامنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ آپکے گرد و پیش ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ آپکے عزیزوں، بھائیوں، بھتیجوں اور اولاد کے خوبصورت چہرے آپکے سامنے تھے اور آپکے ساتھ پردہ دار عورتیں تھیں اور چھوٹے بچّے بھی موجود تھے۔ دریا پر فوج کا پہرہ بٹھا دیا گیا تھا اور ایک قطرہ پانی کا حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں تک پہونچنا ممکن نہ تھا۔ چھوٹے بچے پیاس کی شدت سے بیتاب اور مضطرب نظر آرہے تھے مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسینؑ کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر بادشاہ کو اپنا دینی پیشوا تسلیم کر لیں۔

آپ کا ارادہ پہلے ہی سے مضبوط تھا مگر عملی طور پر جتنے مشکلات بڑھتے جاتے تھے آپ کی ہمت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آپ نے آخری بار پھر قطعی طور پر جواب دیدیا کہ میں بیعت نہیں کرونگا نویں محرم کی شام تھی جب اس بڑے لشکر نے آپ پر حملہ بھی کر دیا مگر آپنے ایک شب کی مہلت لے لی آپ چاہتے تھے کہ اپنے ساتھیوں کو آخری بار سوچنے کا موقع دیدیں کہ وہ اگر آپ کا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ آپنے اُن ساتھیوں کو جمع کر کے صاف طور پر بتلا دیا کہ کل ہماری

زندگی کا آخری فیصلہ ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت کی ذمہ داری ہٹائے لیتا ہوں۔ تم اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر ان جانبازوں نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہا۔ انھوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیںگے ان لوگوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔

۵ ان میں چند ضعیف بڈھے۔ کچھ نوعمر لڑکے اور چند معصوم بچے بھی شامل تھے مگر اس منتخب جماعت میں ایک فرد بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنے کارناموں سے حُسینی قربانی کی عظمت اور فخر میں اضافہ نہ کیا ہو۔ جب مہلت کی شب گزر گئی اور امام حسینؑ اپنے ارادہ پر قائم رہے تو یزیدی لشکر جس کی تعداد کم سے کم تیس ہزار بتائی جاتی ہے میدان کربلا میں صف آرا ہو گیا کہ ایک صبر و استقلال کے پہاڑ کو ظلم و جبر کی آندھیوں سے متزلزل کر دے۔ طبل جنگ بجنے لگے۔ امام حسینؑ کا سر لینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے لشکر کا سامنا ہے۔ بھوک پیاس کی شدت سے کسی کے دم میں دم نہیں اپنی اور عزیز ترین ہستیوں کی موت۔ گھر کی تباہی۔ ناموس کی اسیری کے منظر آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مگر امام حسینؑ کی فرض شناسی، اصول پروری، ایثار اور جرأت کا کیا کہنا کہ آپ کی جبین استقلال پر اب بھی شکن نہیں۔

دسویں محرم کو صبح سے دوپہر تک حسینؑ کے جاں باز ساتھی جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے برابر اپنی جانیں حسینؑ اور اُن کے اصول کی خاطر قربان کرتے رہے۔ جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو حسینؑ اور اُن کے عزیزوں کی نوبت تھی۔ اب بہت آسان تھا کہ آپ خود آگے بڑھ کر اپنا سر پیش کر دیں مگر آپ کو اپنی قوت برداشت کا پورا امتحان دینا تھا اب عزیز آپ کے آپ سے جدا ہونے لگے۔ ان میں سے کس کو آپ پہلے موت کے منھ میں جانے کی اجازت دیتے۔ ہاں سب سے پہلے آپ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہ پیغمبر بھی تھا مرنے کے لیے بھیج دیا۔ ماں خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازے پر اور اُن کا چاند فوج دشمن کی گھٹا میں چھپا تھا۔ باپ نے دیکھا اور ماں نے سن لیا کہ علی اکبر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہیں آیا وہ اس قربانی کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ وہ یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ انکی اسکیم کا ایک بڑا جزو

---

۵ سید محمود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی

پایہ تکمیل کو پہونچ گیا۔ اس کے بعد دوسرے عزیز بھی ایک ایک کرکے رخصت ہوئے اور موت کی نیند سو گئے۔ سب سے آخر میں آپ کے جانباز بھائی عباس آپ سے رخصت ہوئے۔ یہ فوج کے علمدار تھے۔ ان کے قتل ہونے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی مگر آپ کی ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ آپ کے پاس اب کوئی سرمایہ سچائی کی بارگاہ میں نذر دینے کے لیے نہ تھا مگر سب سے آخر میں آپ نے ایک وہ معصوم ہدیہ پیش کر دیا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے مجرم ہونے کا الزام نہ آسکتا تھا وہ شیر خوار بچہ جو اپنی ماں کی گود میں پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا حسینؑ نے اس کی حالت دیکھی اور اپنے ہاتھوں پر بلند کیا۔ یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری فدیہ۔ انسانیت کے ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ گیا اور رحم و کرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا جب دشمن فوج کے ایک سپاہی نے تیر حلقہ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنالیا۔ حسینؑ کا یہ آخری تحفہ بھی قبول ہو گیا اب کیا تھا؟ حسینؑ کو حق کی حمایت میں جہاد کا فرض انجام دینا تھا اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنا تھی۔ آپ نے انتہائی خستگی اور بے کسی کے عالم میں تلوار نیام سے نکالی اور جتنی کسی انسان میں طاقت ہو سکتی ہے اُس حد تک انتہائی شدید مقابلہ کیا وہ مقابلہ جو تاریخ عالم میں یادگار رہے۔ مگر کہاں ایک انسانی جسم اور کہاں فولادی تلواروں کا سیلاب! جسم زخموں سے چور ہو گیا، گھوڑے سے زمین پر گرے اور وہ مرحلہ جو آپ کے لیے پہلے ہی آسان تھا آسان ہو گیا۔ آپ کا سر قلم کیا گیا اور نیزے پر بلند کیا گیا۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ پردہ نشین عورتوں کے سروں سے چادریں تک اُتار لی گئیں۔ خیموں میں آگ لگادی گئی۔ مردوں میں ایک فرزند حسینؑ کے زین العابدین زندہ بچے تھے جو بیماری کے عالم میں تھے اُنھیں طوق و زنجیر پہنایا گیا اور عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مند بی بیاں رسیوں میں باندھ کر قیدی بنائی گئیں اور انھیں در بدر پھرایا گیا۔

یہ ہے دنیائے تاریخ کا وہ بڑا حادثہ جو "واقعۂ کربلا" کے نام سے مشہور ہے۔

یوں تو عالم کا ہر واقعہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے کسی خاص جگہ، کسی خاص قوم، کسی خاص طبقہ سے متعلق ہوتا ہے اور اس لحاظ سے واقعہ کربلا بھی عراق کی سرزمین، عرب کے ملک، بنی ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتا ہے مگر واقعات میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے

اُن خصوصیات اور اُن نتائج کے لحاظ سے جو نوع انسانی سے وابستہ ہوں اور جن میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو اور اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو واقعۂ کربلا متعدد وجوہ سے تمام نوع انسانی کے تعلق کا مرکز ہے۔

اوّل یہ کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی فطرت بشری میں داخل ہے اگر کوئی قصہ آپ کے سامنے پیش ہو جس میں ایک طرف ظلم کا مظاہرہ ہوا اور دوسری طرف مظلومیت تو چاہے اُس واقعہ سے متعلق اشخاص کے ناموں سے یا اُن کی شخصیتوں سے آپ واقف نہوں تب بھی اوّل الذکر سے آپ کو نفرت اور دوسرے کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی اس میں کسی مذہب اور خیال کا امتیاز نہیں ہے۔ حضرت امام حسینؑ پر جو مظالم کربلا میں واقع ہوئے اُن کی مثال تاریخ عالم میں ناپید ہے۔ یوں تو اکثر انبیا و مقربین ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوئے ہیں بہت سے بیگناہ افراد مقتول ہوئے ہیں بہت سے لوگوں کا مال و اسباب تاراج ہوا ہے، بہت سے لوگ قید ہوئے ہیں مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جو فرداً فرداً بہت سے اشخاص پر تقسیم تھے وہ حضرت امام حسینؑ کی ذات میں اکٹھا ہو گئے اور ان کے اجتماع سے آپ کی ذات مظلومیت میں اپنی آپ مثال بن گئی۔

عـہ "دنیا میں موجودہ جنگ سے زائد کوئی خونریز جنگ نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مظالم، بیرحمیاں اور ناانصافیاں جس حد تک واقعہ کربلا میں ہوئیں اُن کا عشر عشیر بھی کبھی کسی معرکہ میں نہیں ہوا یہ ہوتا رہا ہے کہ آدمی زائد مارے گئے ہیں۔ یہ دیکھا ہے کہ خون زائد بہا ہے۔ لیکن یہ نہیں دیکھا گیا کہ دل و روح کے پاک و عزیز ترین جذبات کے ساتھ ایسی بیرحمی ہو جیسی کہ کربلا میں واقع ہوئی ہے۔ ہٹ دھرمی، بے انصافی، جور و ظلم اور ہر طرح کی سختی جو اس میدان میں مظلوموں کے ساتھ برتی گئی اس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملتی"۔ پھر جس قدر حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت کا درجہ بلند ہے۔ اور ظالم کے ظلم کا درجہ شدید ہے اُسی قدر وہ محبت جو امام حسینؑ کے ساتھ بحیثیت مظلوم ہونا چاہئے وہ بھی ہر فرد دوسرے شخص سے زیادہ ہے اور جو نفرت ہر انسان کو آپ کے دشمنوں سے بحیثیت ظالم ہے وہ بھی تمام دنیا کے ستمگاروں سے زیادہ ہے۔

عـہ علامہ ہندی۔

دوسرا امر یہ ہے کہ حضرت امام حسین کی مظلومیت صرف ایک بے بسی کی طرح کی مظلومیت نہ تھی جس طرح کسی شخص پر اکیلے جنگل میں ڈاکو حملہ کردیں اور اُسکے مال و اسباب کو لوٹ لیں یا اُسے قتل کرڈالیں۔ مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہوگی۔ مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاق کے نقطۂ نظر سے قابل مدح ہو حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپ نے ایک مسلک حق کی حمایت اور ایک صحیح اصول کی حفاظت کے لیے اُن تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اس کا نام قربانی ہے۔ یوں تو قربانی کے بہت سے اقسام ہوسکتے ہیں مگر سب میں بلند جان کی قربانی ہے اور اگر اس فرض کے عائد ہونے پر کوئی اس منزل میں ثابت قدم نظر آئے تو تمام افراد انسانی کی عزت و احترام کا مرکز ہوگا اور جس قدر مقصد عزت دار اور شریف ہوگا اتنی ہی قربانی اہم اور قابل عزت ہوگی۔ کربلا کی سرزمین پر حضرت حسینؑ بن علیؑ نے جو قربانی پیش کی وہ انسانیت کی تاریخ کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ مساوات، سادگی اور حق پروری کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اور طاقت و اقتدار انسانی آزادی کا سر کچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا اُس وقت حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں بلکہ بچوں تک کو تلواروں سے ٹکڑے کرا کے جبر و استبداد کو کاری ضرب لگائی اور ثبات و استقلال، ضبط و صبر، ایثار و قربانی، حق پروری اور راست کرداری کا بلند نمونہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے حسینؑ کسی قوم اور مذہب سے مخصوص نہیں ہیں حسینؑ تمام دنیائے انسانیت کے ہیں اُنھوں نے وہ کام کیا جس نے مٹتے ہوئے انسانیت کے نقوش کو اُبھار دیا جس نے دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کردیا جس نے انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہونچا دیا۔ اُنھوں نے اپنی جان دے کر دنیائے انسانیت کو وہ پیغام دیا جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُنھوں نے دنیا کو سچائی اور راست بازی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرایا اور اُس موت کے معنی سمجھائے جس میں زندگی کی حقیقت مضمر ہے اس لیے تمام اقوام عالم جو قربانی کی عزت کرتے ہیں مجبور ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں۔

تیسرا امر یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اپنی قربانی سے کوئی ایسا امر نہ تھا جو مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے محل اختلاف ہو۔ انسانی اوصاف و اخلاق کی منزل وہ ہے جہاں تمام

مذاہب متفق ہو جاتے ہیں۔ تمام مذاہب کی اصل اساس جس پر ان کی عمارت کا قیام ہوا ہے اخلاق انسانی کو نقطۂ ارتقا تک پہنچانا ہے۔ ممکن ہے کہ زمانے کے اختلاف سے کچھ احکام میں تبدیلی ہوئی ہو اور ممکن ہے کہ بعض مذاہب کے اصول میں بعد کی آنے والی نسلوں نے بھی کچھ زیادتی یا کمی کر دی ہو مگر اصلی محور سب کا تہذیب اخلاق اور تکمیل انسانیت ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اسی نوع کا تھا۔ یقیناً حضرت امام حسینؑ کی شہادت اور آپ کا اقدام عمل اگر کسی دوسرے مذہب کے افراد کے خلاف ہوا ہوتا یعنی کوئی غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے کتنی ہی حقیقت آپ کے مشن کی ہوتی اور آپ کو کتنی ہی مظلومیت کے ساتھ قتل کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے خلاف آپ کا اقدام ہوا تھا اور جس کے ہاتھوں آپ کو یہ مظالم برداشت کرنا پڑتے کسی حد تک آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے مخاصمت ضرور محسوس کرتی اس لیے واقعہ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہوتی لیکن حضرت امام حسینؑ کی قربانی رسمی طور پر کسی ایک مذہب کو مٹانے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک ہی مذہب کے لوگوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کے قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی اور چونکہ برائی اور اچھائی حدود مذہب و ملت سے بالاتر ہے۔ ہر مذہب والوں کے نزدیک برائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کو حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہوگا اور وہ آپ کی قربانی کو قدر و منزلت کا حامل سمجھیں گے۔

عــه "جہاں کہیں گروہ انسانی کے افعال کا محرک فیاضانہ خیال اور شریفانہ جوش ہوگا جہاں کہیں وہ عظیم المرتبت اور پسندیدہ افعال کی تحسین کریں گے جہاں کہیں وہ ایسی تحریکات کی معاونت کریں گے جن کا مقصود انسانوں کو ظلم و جبر بے انصافی اور خود پرستی کی زنجیروں سے آزاد کرانا ہوگا وہاں حسینؑ کو لوگ قائد اعظم تسلیم کریں گے کیونکہ کسی دوسرے نے ایسی وضاحت کے ساتھ اور اتنے نتیجہ خیز طور پر اس امر کو عمل کر کے نہیں دکھایا کہ انسان حقیقی عظمت اور دائمی حیات اس وقت حاصل کر لیتا ہے جبکہ وہ کسی اچھے اصول سے اپنی زندگی کو متحد کر لیتا ہے اور انسانی خدمت میں

عــه خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر

اپنی ذات کو محو کر دیتا ہے ـــــ مسلمانوں کے لیے ناپسندیدہ تکبر ہو گا اگر وہ حسینؑ کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیں کیونکہ وہ ان اخلاقی اور روحانی قوتوں کے مظہر ہیں جن کا تعلق اپنے اثر اور وسعت کے لحاظ سے تمام اقوام و مذاہبِ عالم سے ہے۔ دنیا کی مختلف اقوام میں مخالفت و مغائرت کے بہت کثیر اسباب موجود ہیں جن کا کم کرنا بلکہ دور کرنا صحیح سیاست کا اقتضا ہونا چاہیے۔ اس پسندیدہ کوشش میں ان تمام کامیابیوں کو جو انسانوں کو کسی بڑے معیار تک پہونچنے میں حاصل کی ہوں مستحق تبریک و تمجید سمجھنا چاہیے جس کے ذریعہ سے تمام گروہ انسان ایک خاندان کے آدمی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ یک زبان ہو کر فطرت انسانی کے بلند جذبات کو متحرک کرتے ہیں اور اُس معراج کمال کی طرف صریح اشارہ کرتے ہیں جہاں تک انسان رسائی کی قدرت رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ سب مل کر بلا لحاظ اس امر کے کہ ہم کس قوم و قبیلہ و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسینؑ کی قدر و قیمت سمجھیں اور اُن کی عزت کریں۔ کیونکہ اُنھوں نے انسان کو خدا کا مظہر اعلیٰ ثابت کرنے میں فاتحانہ کامیابی حاصل کی ؂

چوتھے حضرت امام حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں نے واقعۂ کربلا کے اثنا میں مختلف اخلاق و اوصاف کاملہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عامۂ خلائق کے لیے ایک دائمی درس عمل رکھتی ہیں اس لیے تمام افراد بشر اُن سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اُن سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ ـــــ

کارلائیل نے لکھا ہے :۔ ”بہادرانہ کارنامے محض ایک قوم یا ایک ملک تک محدود نہیں رہتے بلکہ تمام انسانی برادری کی میراث اور ملکیت ہو جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے آنے والی نسلوں میں سلسلۂ شجاعت و استقامت باقی رہتا ہے ؂

ان ہی تمام وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا نے واقعۂ کربلا کے ساتھ اپنے باہمی تفرقہ اور جذبات کی کشمکش کے باوجود یگانگت کا برتاؤ کیا اور اقوام عالم نے یکساں طور پر اُس کی اہمیت کا اعتراف و اقرار کیا اور صدیاں گزرنے کے ساتھ اُن کی دلچسپی اس اہم حادثہ سے نہ صرف قائم رہی بلکہ مختلف اوقات میں اُس میں اضافہ ہوتا رہا۔

اگر کوئی سیاح محرم کے زمانہ میں شرق اور غرب کی سیاحت کرے اور ہر مرتبہ محرم کے پہلے دس دن الگ الگ زمین کے حصوں پر گزارے تو وہ دیکھے گا کہ ہر جگہ اپنے اپنے

معیار زندگی اور طرز معاشرت کے اعتبار سے کسی نہ کسی طرح کربلا کے شہید کو یاد کیا جاتا ہے۔

[۱] "عراق عرب، ایران، مصر اور یمن میں عزائے امام کی جو اہمیت ہے اُس سے سب ہی واقف ہیں شام میں بھی عزائے حسینؑ جاری ہے۔ ٹرکی میں جس شان کے ساتھ مجلس کا انعقاد ہوتا رہا اور امام مظلوم کا ماتم جاری رہا اُس کی شہادت جناب شبلی نعمانی کے سفرنامہ بلاد اسلامیہ سے ملتی ہے۔ حجاز میں صحرانشین عرب عشرۂ محرم کے زمانہ میں اپنے گریہ و ماتم سے ایک انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ افغانستان میں عزاداری کافی انہماک سے کی جاتی ہے خود کابل میں متعدد امام باڑے ہیں جن میں باقاعدہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے۔ برما، تبت اور بربر کے باشندے عزاداری و ماتم کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں چینی مسلمان بھی محرم میں عاشورا قائم کرتے ہیں اور اس دن عزائے حسینؑ کا ماتم برپا کرتے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو قوم بھی امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ گوالیار، اندور، بڑودہ، دھولپور، جے پور، جودھپور، الور، دتیا اور بنارس میں حکمرانوں کی طرف سے عزاداری بڑے تزک و احتشام سے کی جاتی ہے۔

یورپ میں خود لندن میں گزشتہ کئی برس سے برابر خبریں آتی ہیں کہ مجلس حسینؑ برپا ہوتی ہے۔ اور تمام سفرائے ممالک و امرائے دولت عزائے امام میں شرکت کرتے ہیں اور ایک سال تو سر عبدالقادر نے اس مجلس میں امام حسینؑ کے تذکرے سے سامعین کو اشکبار کیا۔"

[۲] "پارسی بھی ایام عزا میں مجالس کرتے ہیں، نذریں مانتے ہیں عزا خانوں میں شمعیں روشن کرتے ہیں اور خوشبو کے لیے بخور سلگاتے ہیں۔ (مجلۂ العرب بمبئی یوم پنجشنبہ ۹ محرم ۱۳۰۶ھ عدد ۱۰)

سکھوں کو عزاداری سے بہت خلوص ہے وہ "گرو حسین کا دیوان" کے نام سے مجالس عزا برپا کرتے ہیں، علاوہ اور تعزیوں کے مہاراجہ شیر سنگھ کا تاریخی بڑا تعزیہ آج تک لاہور میں رکھا جاتا ہے اور اس کا گشت ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ لاہور مصنفہ خان بہادر محمد لطیف سی آئی ای)"

---

[۱] سید علی جعفر کھجوی ایڈیٹر مسلم ریویو لکھنؤ

[۲] ہندو قوم اور عزاداری۔ مولانا سبط الحسن صاحب فاضل ہنسوی

شہید انسانیت

۱۶

تعلیم یافتہ طبقہ سے لیکر خانہ بدوش صحرائی اور پہاڑ کی رہنے والی غیر متمدن قوموں تک وہ جو حضرت امام حسینؑ کے بزرگوں کا نام نہیں جانتے حسینؑ کے نام سے واقف ہیں اور اُن کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں ؎ اودھ میں دیہات کی عورتیں ہندو مسلمان جن کو نہ مذہب سے واقفیت ہے، نہ واقعات عالم سے باخبر ہیں۔ ان کی دنیا ان کے گاؤں ہیں، کھیت ہیں اور ان کے جانور ہیں لیکن شب عاشور کو نہایت دردناک لہجہ میں ٹھیٹھ دیہاتی زبان میں وہ ایسے جملے ادا کرتی ہیں جن کو "نوحہ" کہتے ہیں جن کا مفہوم انتہائی دردناک ہوتا ہے مثلاً "اے فاطمہ بی بی کے بیٹے تمھارے ساتھ کیسی دغا کی گئی" "تم کو مہمان بلایا اور پانی تک پینے کو نہ دیا۔ ظالموں نے بہن کے سامنے بھائی کو حلال کر دیا اور سر کاٹ لیا۔ اے فاطمہ بی بی کے بیٹے۔ آپ تو اپنے بچے کو پانی پلانے لے گئے تھے، دشمنوں نے اُسے تیر مار دیا۔ کیا جس بچہ کی ماں کا دُودھ خشک ہو جائے اُس کی پیاس تیر سے بجھتی ہے" اس قسم کے بکثرت دردناک بیانات ہیں جن کے متعلق یہ پتہ لگانا انتہائی دشوار ہے کہ اُن کا رواج کب سے اور کیونکر ہوا۔ اسی طرح پنجابی اور ملتانی زبان میں بھی واقعات کربلا نہایت مؤثر اور دردناک الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں" یوں ہی پشتو۔ تلگو۔ کشمیری اور دوسری زبانوں میں۔

یورپ کی متمدن دنیا کے مصنفین اور ایشیا کے اہل قلم اور بڑے آدمیوں نے متفقہ طور پر اپنی عقیدت کا خراج حسینؑ کی بارگاہ میں پیش کیا ہے اُن تصانیف میں جو تاریخ اسلام یا تاریخ عالم یا کسی ایسے موضوع پر لکھی ہیں جس کا کسی حیثیت سے واقعۂ کربلا کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوتا ہے؛ یا اُن تقریروں میں جہاں حسینی کارنامہ کا تذکرہ آیا ہے یا اُن پیغاموں میں جو محرم کے موقع پر نشر کئے گئے ہیں بلکہ ڈاکٹر سر سید سلطان احمد کے لفظوں میں "اس حادثہ پر مؤرخین کا قلم خون کے آنسو بہاتا رہا ہے"

مشہور مؤرخ گبن اپنی تاریخ "زوال سلطنت روم" میں لکھتا ہے:-

"وہ بعید ترین زمانوں اور بعید ترین اقلیموں میں بھی حسینؑ کی موت کے اندوہناک مناظر ٹھنڈی سے ٹھنڈی طبیعت کے آدمی میں بھی ہمدردی کے شعلے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے"

؎ سفیر صاحب سندیلوی

مسٹر براؤن اپنی مشہور کتاب "تاریخ ادبیات ایران" میں لکھتے ہیں کہ :-
"حسینؑ کا قتل، مدینہ کی تاراجی اور مکہ کا محاصرہ ان تین تاریخی چیرہ دستیوں میں پہلی چیرہ دستی ایسی تھی جس نے تمام اسلامی دنیا کو لرزہ براندام کر دیا اور ایک شخص بھی جس کے سینے میں جذبات تھے، اس دردناک کہانی کو سن کر بے چین ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔"

مسٹر جان یونگ چار سو شعر میں حسینؑ مظلوم کا دردناک مرثیہ لکھتے ہیں اور کربلا کا خونین منظر دکھلا کر آخر میں حسینؑ کی تعریف کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ حسینؑ دیندار، خدا پرست، فروتن، خلیق اور بے مثل بہادر تھے۔ حسینؑ سلطنت و حکومت کے لیے نہیں لڑے بلکہ خدا پرستی کے جوش میں۔" (رسالہ نظام المشائخ دہلی محرم ۱۳۳۵ھ)

مہاتما گاندھی شہادت حسینؑ کی عظیم الشان نوعیت کا اعتراف ۸ اپریل ۱۹۳۴ء میں یوں کرتے ہیں کہ "میں نے کربلا کی المناک داستان اس وقت پڑھی جبکہ میں نوجوان ہی تھا۔ اس نے مجھکو دم بخود اور مسحور کر دیا۔"

ہز ایکسیلنسی سر کشن پرشاد فرماتے ہیں۔ "نہ فقط دنیائے اسلام بلکہ از آغاز تا انجام کوئی مثال دنیا میں واقعۂ روح فرسائے ارض نینوا کے مثل ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہ سانحہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال خود ہی ہو سکتا ہے۔ واقعۂ کربلا ہی ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے انسان کو تہذیب اخلاق کا پورا پورا سبق ملتا ہے۔ مظلوم حسینؑ نے جس استقلال اور مضبوط ارادہ کے ساتھ دنیا میں صداقت اور حق کا علم گاڑا وہ صرف اسی کی ذات سے ہو سکتا تھا جس کو خدا نے ایسا بہادر دل دیا تھا۔"

سوامی شنکر اچاریہ فرماتے ہیں "میں نے حسینؑ سے بڑھ کر کوئی شہید نہ دیکھا اور حسینؑ کی شہادت کے اثر سے زیادہ کسی شہید کی قربانی کا اثر نہ ہوا۔"

پریم چند کی رائے ہے "معرکۂ کربلا دنیا کی تاریخ میں پہلی آواز ہے اور شاید آخری بھی جو مظلوموں کی حمایت میں بلند ہوئی اور جس کی صدا آج تک فضائے عالم میں گونج رہی ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں "کسی کارنمایاں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ اس کا دوسروں پر کتنا اثر مترتب ہوتا ہے، کس قدر وہ انھیں ابھارتا ہے۔

کس قدر ان کو طاقتور بنا رہا ہے اور کتنی شرافت و تہذیب ان میں پیدا کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کہ لاتعداد نسلیں کربلا کی اس قربانی اور عظیم سانحے سے زبردست طریقہ پر اثر پذیر ہوتی آئی ہیں۔ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قربانی کس قدر لازوال قیمت رکھتی ہے۔"

دوسرے پیغام میں جو آپ نے اسی ۱۳۶۱ھ میں حسین ڈے کمیٹی بمبئی کو بھیجا ہے لکھا ہے "اس شہادت میں ایک عالمگیر پیغام ہے۔ حضرت حسین علیہ السلام نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا مگر ایک ظالم حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ہماری مادی قوت دشمنوں کی قوت کے مقابلہ میں کم ہے۔ ایمان کی قوت ان کے نزدیک سب سے بڑی قوت تھی جو ہر مادی قوت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ ہر فرقہ اور قوم کے لیے یہ قربانی شمع راہ ہدایت ہے۔"

ہز ہائی نس مہاراجہ جیوا جی راؤ سندھیا آف گوالیار محرم ۱۳۶۱ھ کے پیغام میں فرماتے ہیں "رسول اسلام کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؑ نے ظالم کے مقابلہ کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، وہ جور و تعدی کے سامنے سر جھکانے پر تیار نہیں تھے۔ ان میں عقیدہ اور ضمیر کی پختگی تھی۔ اعلیٰ ترین مقاصد اور بلند ترین نصب العین اُن کے سامنے تھے اس لیے انھوں نے ایک بڑی اور طاقتور فوج کا دندان شکن مقابلہ کیا وہ اور ان کے ساتھی اس جنگ میں مارے گئے۔ دشمن کے ظلم و تعدی کا مقابلہ آپ نے خدا کے انصاف پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنے اٹل ارادہ، اپنی بلند ہمت اور اس مستحکم عقیدہ سے کیا کہ چاہے اس وقت جو کچھ بھی ہو مگر آخر میں حق اور صداقت ہی کو فتح نصیب ہوگی۔ تاریخ اسلام کا یہ یادگار واقعہ عقائد کے اختلاف اور نسل، رنگ اور مذہب کے تنگ نظریات سے بالاتر ہے اور اس قابل ہے کہ نسلِ انسانی اس کو اپنے دلوں میں جاگزیں کر لے اور قربانیوں کی پرواہ کئے بغیر ادائے فرض کی اہمیت کو سمجھ لے۔"

ہز ہائی نس نواب صاحب خنجرہ اس موقع پر اپنے پیغام میں لکھتے ہیں "انسانی تاریخ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی جبکہ اتنے مصائب کے مقابلہ میں حقانیت اور مذہب کی خاطر ایسی زبردست قربانی پیش کی گئی ہو۔ بہت سے بلند پایہ مصنفین نے اس بے مثال قربانی کی عظمت اور اس کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے مگر پھر بھی ابھی بہت کچھ باقی ہے۔"

۱۳۶۱ھ کے موقع پر بمبئی کے عظیم الشان بین الاقوامی جلسہ میں سر بہرام جی جیجی بھائی نے

بحیثیت صدر یوم امین کمیٹی تقریر فرماتے ہوئے ارشاد کیا کہ "یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ ایک خالص اسلامی جلسہ کی صدارت ایک ہندو کرے اور اس کا استقبال ایک پارسی کے سپرد کیا جائے مگر تعجب نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ جلسہ اس مجسمۂ ایثار وقربانی کی یادگار منانے کے لیے منعقد کیا گیا ہے جس نے اپنی بے نظیر قربانی اور ایثار سے دنیائے انسانیت پر زبردست احسان کیا ہے۔"

بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر رادھا کرشنن نے اس جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ "امام حسین نے اپنی قربانیوں اور ایثار سے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں حق وصداقت کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لیے ہتھیاروں اور فوجوں کے بجائے جانوں کی قربانی پیش کر کے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ انھوں نے دنیا کے سامنے ایک بے مثال نظیر پیش کی ہے۔ آج ہم اس بہادر جان فدا کرنے والے اور انسانیت کو زندہ کرنے والے عظیم الشان انسان کی یادگار مناتے ہوئے اپنے دلوں میں فخر ومباہات کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ امام حسین نے ہمیں بتا دیا ہے کہ حق وصداقت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔"

بمبئی کے سابق وزیر اعظم مسٹر بی جی کھیر نے تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ امام حسین نے ہمیں جو سبق سکھایا ہے وہ ہماری زندگی کے لیے چراغ کا کام دیتا ہے۔ یہ آسان بات ہے کہ حق اور سچائی کے لیے اپنی جان دے دی جائے مگر یہ کام مشکل ہے کہ ہزاروں دشمنوں کے مقابلے میں چند گنے چنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو لے کر ان کا مقابلہ کیا جائے اور یکے بعد دیگرے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل ہوتا ہوا اور گھروں کو لٹتا اور برباد ہوتا ہوا دیکھیں۔ انھوں نے تیرہ سو سال قبل جو سکھایا تھا وہ سبق آج تک ہم سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امام حسین صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی ہیں اور ہندو ومسلمان ان کے نقش قدم پر چل کر ظلم وستم کے خلاف سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔"

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "حضرت امام حسین نے آج سے تیرہ سو سال قبل دنیا کے سامنے جو پیغام اور اصول پیش کیا تھا وہ اتنا بے نظیر اور مکمل تھا کہ آج ہم اس کی یادگار منا رہے ہیں۔ میرے پاس ایسے کوئی الفاظ نہیں اور نہ دنیا کی کوئی ایسی فصیح وبلیغ زبان ہے کہ جس کے ذریعہ میں ان جذبات عقیدت کو بیان کر سکوں جو اس شہید عظیم

شہید انسانیت ۲۰

کے لیے میرے دل میں ہیں۔ حضرت امام حسینؑ صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ رب العالمین کے سارے بندوں کے لیے ہیں۔ میں مسلمانوں کو مبارکباد دیتی ہوں کہ ان میں ایک ایسا بلند انسان گزرا ہے جسے دنیا کی ہر قوم یکساں طریقہ سے مانتی ہے اور اُن کی عزت کرتی ہے۔"

آپ نے حسین ڈے کمیٹی بمبئی کے نام اپنے پیغام میں بھی کہا ہے "کربلا کا دردناک سانحہ آج بھی ویسا ہی تازہ، ویسا ہی دردانگیز اور ویسا ہی اثر خیز ہے جیسا کہ اس روز تھا جب اسلام کا یہ بہترین رہبر شہید کیا گیا تھا۔ تیرہ سو سال کے بعد بھی امام حسین کی مثال حق و حریت کی تلاش رکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے روشنی کا منارہ بنی ہوئی ہے۔ ان کی ذات تمام اختلافات سے بالاتر ہے۔ وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد ہے اور برائیوں کے مقابلہ میں صداقت کی فتح کا لافانی نشان ہے۔"

حیدرآباد دکن کے اجلاس یادگار حسینی کے موقع پر جو پیغام بھیجا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔
"اکثر جب لوگ مرتے ہیں تو ان کی یاد بھی موسم خزاں میں پتوں کی طرح غائب ہو جاتی اور ختم ہو جاتی ہے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام قسمت انسانی کی ان نادر اور منتخبہ ہستیوں میں سے ہیں جن کے نام افق تاریخ پر ایک روشن ستارہ کی طرح جگمگا رہے ہیں شاید ہی کسی ہستی کو اسلام کے اس ہردلعزیز رہنما کی طرح ایسی غیر فانی شوکت اور حسن نصیب ہوا ہو، شاید ہی کوئی قصہ اتنا المناک اور دلدوز ہو جتنا کہ قصہ کربلا ہے۔ جو آج تیرہ صدیوں کے بعد بھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو خون کے آنسو رُلانے کی قابلیت رکھتا ہے — تیرہ صدیوں کے بعد بھی اس مقدس شہادت کی عظمت و شوکت ظلم اور باطل کے خلاف کشمکش کی اعلیٰ ترین نشانی ہے اور انسانی آزادی اور حق پرستی کی راہ میں سب سے بڑھی ہوئی انسانی قربانی تھی۔"

ریورینڈ فادر ہیراس ایس۔ جے پی۔ ایچ ڈی، ڈی عالم متبحر و سابق پرنسپل سینٹ اکسویرس کالج بمبئی نے لکھا ہے "امام حسین کی قربانی یقیناً تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے جس نے صداقت کو کذب پر فتح حاصل کرنے میں مدد پہونچائی ہے۔"

بابو راجندر پرشاد ایم اے ایم ایل۔ ایل ڈی سابق صدر نیشنل کانگریس لکھتے ہیں "کربلا کا واقعۂ شہادت انسانی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور جو دنیا کے کروڑوں مردوں اور عورتوں کی زندگی پر اثر ڈالتا رہے گا۔ ہندوستان میں اس واقعہ کی یادگار

بڑی سنجیدگی سے منائی جاتی ہے جس میں نہ صرف مسلمان حصہ لیتے ہیں بلکہ غیر مسلم افراد بھی مساویانہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔"

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری (الہ آباد یونیورسٹی) لکھتے ہیں:-

"حسین کا نام اس وسیع دنیا کے کروڑوں انسانوں کے لیے آب حیات ہے۔ اس نام نے میری آنکھیں ہمیشہ اشک آلود کر دی ہیں۔ حسین کی بلند اور پاکیزہ سیرت محسوس کیے جانے کی چیز ہے۔ ایسے الفاظ کا پانا آسان نہیں جو اُن کے کردار کی عظمت کے مکمل مظہر ہوں۔ یوں تو ان کی تصویر روحانیت اور آنسوؤں کی سب سے زیادہ تابناک روشنی میں کربلا (کرب و بلا) کے اندر چمک کھاتی ہے۔ لیکن جو لوگ حسین کی زندگی سے کربلا میں شہادت واقع ہونے کے پہلے سے واقف ہیں اُن کے لیے ان کی زندگی کی بے داغ اور استوار پاکیزگی، اس کی بشریت، اس کا خلوص اور وقار، سچ کی عجیب اور سخت امتحان کے مقابلہ کی طاقت۔ یہ باتیں اتنی نمایاں ہیں کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر فرد سے بخوشی خراج عقیدت حاصل کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایسے ہیرو روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسین چرخ نوع بشر کے تارے ہیں حسین
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین
جوش

وہ دنیا کے بڑے سے بڑے خدا رسیدہ رشیوں اور شہیدوں کے ہم پلہ ہیں، اُن کا نام اور اُن کا کام اُن کی زندگی اور موت کے واقعات اُن نسلوں کی روحیں بیدار کریں گے جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں"

دستور کیخسرو مہیار کتور پیشوائے اعظم فرقۂ پارسی بمبئی فرماتے ہیں:-

"اگر شہدائے اعظم کی قربانیاں نہ ہوتیں تو دنیا اخلاق، مذہب اور صداقت سے نا آشنا رہتی دنیا ان شہداء کی ممنون ہے جنھوں نے موت کو ذلت پر ترجیح دی۔ امام حسین ان شہداء میں ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کے لیے جان دی۔ ہم کو ان کی یاد اپنے عمل سے منانا چاہیے اور ان کی قربانیوں سے سبق لینا چاہیے۔"

کیپٹن ایل ایچ بنٹ جے پی ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ نے ایک کتاب سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھی تھی جس میں شاہان اودھ کے حالات، ہندوستان کے خاص خاص مذہبی تہواروں کا ذکر اور بعض دوسری حکایتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مضمون "محرم اور تعزیہ داری" پر ہے۔ اُس میں تعزیہ داری کی

شہیدِ انسانیت

۲۲

کیفیت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اسی طرح دنیائے اسلام اُس واقعہ کی یاد مناتی ہے جو نہایت ہی دردناک تھا اور تاریخ میں بے نظیر۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جامِ شہادت پی کر آپ نے اسلام کو صفحۂ ہستی سے محو ہونے سے بچا لیا۔ (اس کے بعد آپ نے مؤثر طور پر واقعۂ کربلا کا مختصر حال تحریر کیا ہے)

مسٹر کے ایل رلیارام ہندوستانی عیسائیوں کے بہت بڑے لیڈر ہیں۔ آپ نے ملتان میں حسینی جلسہ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔ "اس شخص کی زندگی پر میں کیا کہوں جو روئے زمین پر حق و صداقت کا علم بلند کرنے والا پہلا فرد ہے۔ امام حسین کی شہادت کا واقعہ کسی ایک قوم سے متعلق نہیں ہے — امام اس وقت اپنی بلند سیرت کا اظہار فرما کر آنے والی قوموں کے سامنے ثبات و استقلال، صبر و سکون، اور حق پسندی کا ایک کامل نمونہ رکھ گئے ہیں تاکہ اُن کی قربانی کو سامنے رکھ کر ظالموں اور جفاکاروں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں — کربلا کے میدان میں امام حسین کی سیرت کے وہ وہ جوہر کھلے ہیں جن پر غور کر کے انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے —— اس چودھویں صدی میں جبکہ دنیا انسانیت اور صداقت سے سیکڑوں کوس دُور ہٹ گئی ہے آپ کی بلند سیرت قوموں کیلیے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے — امام نے چونکہ حق و صداقت کے ایک عام اصول کے لیے جان دی اس لیے ہر قوم و مذہب کے لوگ آپ کی مظلومیت اور فداکاری پر آنسو بہاتے ہیں — دنیا سے سیکڑوں سلطنتیں مٹ گئیں۔ ہزاروں بڑے بڑے انسان پیوندِ زمین ہو گئے کہ آج کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا لیکن امام نے اپنی قربانی سے تاریخ پر ایسا نقش چھوڑا ہے جو اپنی پائداری سے جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا ہے دنیا بدل جائے گی۔ عالم ظاہر کے آب و رنگ میں تغیر آجائے گا لیکن ظالم اور مظلوم باقی رہیں گے اور جہاں بھی حق و صداقت جبر اور ظلم سے برسرِ پیکار رہے گی وہاں حسینؑ اور یزید کو یاد کیا جائے گا ہر دور میں یزید پیدا ہوتے رہیں گے لیکن حسین جیسا صداقت پسند بلند سیرت کا انسان اب پیدا نہ ہوگا۔ امام حسین کے اصول کی ہمہ گیری ایک ایسا واقعہ ہے جس پر تمام قوموں کے اتحاد کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔"

اندور میں حسین ڈے کانفرنس ہوئی۔ ہز ہائی نس مہاراجہ ہلکر آف اندور نے پیغام بھیجا جس میں فرماتے ہیں:۔ "آج اس جلسہ کو تمام اقوام و مذاہب کے لوگ مشترکہ طریقہ سے کر رہے ہیں جس میں امام حسین کے اس کارنامہ سے سبق حاصل کریں گے جو آپ نے آزادی کے لیے وحشیانہ طاقت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگا کر وہ عظیم الشان قربانی دکھائی جس سے حق اور انصاف کو

دنیا میں قائم کر دیا۔ اگر تمام ملک میں اس قسم کے جلسے ہونے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ تمام قوموں اور مذہبوں میں اتحاد و اتفاق ہو جائے۔"

فریڈریک جے گولڈ نے لکھا ہے کہ "اگر میں نوجوانان ایشیا۔ افریقہ۔ آسٹریلیا۔ امریکہ اور یورپ کو عراق کے میدان میں جمع کر سکوں اور اگر میں حسین اور عباس کے روضوں کے روبرو کربلا میں کھڑا ہو سکوں اور اگر میری زبان اور لب و لہجہ سب لوگ سمجھ سکیں تو میں حسین کی زندگی اور موت کے اندرونی اور روحانی پیغام کے متعلق گفتگو کروں گا۔ حسین انسانیت کا ایک بہترین نمونہ تھے جبکہ وہ ریگستانوں میں، دریاؤں میں، نفرت اور بے رحمی کی تاریک گھاٹیوں میں امن اور ہمدردی کی دعوت دے رہے تھے۔ اُن کی عملی زندگی میرے نزدیک ایسی ضرب المثل ہے جو عالمگیر معنی رکھتی ہے۔"

پھر جب تمام اقوام عالم اس حادثہ کی عظمت سے اس درجہ متاثر ہوئے۔ تو مسلمان جو قریب سے اس واقعہ کے دیکھنے والے تھے اور جن کے ساتھ براہ راست اُس کا تعلق تھا وہ کیسے متاثر نہ ہوتے چنانچہ ہوئے اور اتنا کہ جتنا کسی چیز سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس کا اظہار جسٹس سر محمد سلیمان "گولڈن ڈیڈس آف حسین" میں ان الفاظ میں فرماتے ہیں "آج دنیا میں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں جو امام مظلوم کی شہادت کے اندوہناک واقعات کو سن کر یا پڑھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکے حضرت امام کی شخصیت کو ہر عہد کے مسلمانوں سے محبت اور عقیدت کا خراج ملتا رہا اور اُن کا نام اسلامی تاریخ کے شہداء کی فہرست میں سب سے اونچا رہا اور رہے گا۔"

ہز اگزالٹڈ ہائی نس محمد عثمان علیخاں نظام حیدرآباد دکن ۱۳۶۱ھ ہجری کے پیغام میں ارشاد فرماتے ہیں "تیرہ سو برس ہوئے حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے وفاداروں اور جانثاروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ رضائے الٰہی پر راہ حق میں قربان ہو گئے۔ اگر وہ ظلم و جور کا اس طرح مقابلہ نہ کرتے تو دین محمدی کو اس سے بھی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا اور ملت اسلامی کو ایک گمراہ رہنما کی تقلید پر مجبور ہونا پڑتا۔ امام مظلوم نے ہمارے سامنے فرض شناسی اور راہ حق میں ایثار و قربانی کی ایک عظیم الشان مثال قائم کر دی ہے۔"

مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کہتے ہیں "امام حسین علیہ السلام سے

۲۴

حسینیت

بہتر ہو روشن تر مثال دنیا میں نہیں پیش کی جا سکتی اس لیے کہ وہ مجسمہ تھے محبت اور بہادری کا اور پیکر تھے قربانی اور ایثار کا۔ ہر مسلمان کو بالخصوص ان کی زندگی سے سبق لینا چاہیے اور ان کی پیروی کرنا چاہیے۔"

مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ شیعہ جماعت نے واقعۂ کربلا کی یاد قائم رکھنے میں نمایاں حصہ لیا اور اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی حیات کا ایک اہم عنصر قرار دے لیا۔ اس کا اندازہ آپ کو آنریبل ڈاکٹر سر سید سلطان احمد ایسے روشن دماغ شیعہ کے ان الفاظ سے ہو جائے گا جو اُنھوں نے شیعہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۴-۱۵ اپریل ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں فرمائے تھے:۔ "اس واقعۂ شہادت کی وہ سالانہ یادگار جو عزاداری کے مختلف مراسم کی شکل میں منائی جاتی ہے شیعوں کی حیات اجتماعی کی ایک ایسی کار فرما روح ہے جو انکی زندگی کے ہر شعبہ پر حکمران ہے۔ اگر آپ اس میں مداخلت کرینگے تو گویا ان کے اُس خزینۂ حیات پر ڈاکہ ڈالیں گے جس کو وہ اپنی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جو ان کے لیے موت و زندگی کا سوال ہے۔"

یہ اہم یادگار کربلا کے واقعہ کے بعد پہلی ہی صدی میں مسلمانوں نے قائم کر لی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ [1] "یہ وہ عزاداری ہے جو چودہ صدیوں سے برابر جاری ہے۔ یہ وہ ماتم ہے جو آج ۱۳۶۱ھ تک چلے کا چلا جا رہا ہے۔ یہ وہ عزاداری ہے جو دبائے دب سکی۔ جو مٹائے مٹ سکی۔ بادشاہتیں اُس کے مٹانے کی درپے ہوئیں مگر خود مٹ گئیں۔ سلطنتیں اسکی بیخکنی میں اپنی طاقتیں صرف کرتی رہیں مگر ساری طاقتیں سلب ہو رہیں۔ بڑے بڑے بادشاہ اسکو پامال کرنے اُٹھے مگر خود پامال ہو رہے ـــــ ہزاروں عزاداروں کو سولیاں دی گئیں۔ ہزاروں ماتمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا مگر یہ ماتم بند نہ ہوا اور یہ عزاداری بند نہ ہوئی۔"

یہ موقع نہیں ہے کہ عزاداری کے ہر دور کی صورت اور اسکی رفتار پر تاریخی حیثیت سے کوئی بسیط تبصرہ کیا جائے اس کے لیے کتاب کے آخر میں ایک مستقل ضمیمہ درج کیا جائے گا مگر اتنا تو ماننا پڑے گا کہ حسینی شہادت کی یہ طولانی عمر رکھنے والی یاد ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں ناپید ہے۔

[1] مولانا حیدر شاہ صاحب نظامی (حیدرآباد دکن)

ـــہ انسان فطرتاً راحت پسند ہے اور غم کو پسند نہیں کرتا اور حوادث زمانہ سے جو غم پیش آتے ہیں اُن کو جلد سے جلد بھول جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں غم کی یادگار قائم نہیں ہوئی۔ جملہ اقوام عالم کی یادگاریں سب خوشی کی یادگاریں ہیں پھر کیا یہ اپنی نوعیت میں عجیب بات نہیں ہے کہ دشت کربلا میں فرزند رسول کی مظلومانہ شہادت کی یادگار صدہا سال سے مستقل طور پر قائم ہے۔"

یہ بھی دیکھیے کہ ہمیشہ حال کا نقش ماضی کو فراموش بنا دیتا ہے اور اثر کو ختم کر دیتا ہے۔ ماضی کی یادگار اس شدت کے ساتھ قائم رہنا کہ حال کا کوئی نقشہ اس نقش کو مٹا نہ سکے یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ عالم میں کوئی مثال اُس کے بعد اُس سے بڑھ کر تو کیا اُسکے قریب بھی نظر نہیں آئی۔

آپ کو معلوم ہے کہ واقعۂ کربلا کے بعد کتنے انقلابات ہوئے۔ تمدن نے کتنی کروٹیں لیں۔ دنیا میں اخلاق کے معیار میں کس درجہ تغیرات ہوئے۔ بہت سی چیزیں جو کسی وقت میں عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں بعد کو انسانوں کی نظروں سے گر گئیں۔ بہت سی وہ باتیں جو نہایت شرمناک اور ذلت آمیز سمجھی جاتی تھیں دوسرے وقت میں وہ باعث عزت عظمت بن گئیں ــــ ہر دسویں برس، پانچویں برس بلکہ ہر سال انسان کے مزاج میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے ، انسان کا اخلاقی معیار بدلتا رہتا ہے جبکہ ہماری آنکھوں کے سامنے نسلی تمدن میں یہ انقلابات ہوتے رہتے ہیں تو کیا خیال کیا جا سکتا ہے اتنی طولانی مدت کے متعلق جس میں بہت سی صدیاں آئیں اور چلی گئیں۔ بادشاہتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں اور انسانوں میں ہزاروں قسم کے حالات میں تبدیلیاں ہوئیں لیکن وہ کون سی چیز تھی کہ جس طرح وہ اپنے وقت میں عزت کی نگاہ سے دیکھی گئی اُسی طرح عزت کی نگاہ سے آج تیرہ سو برس بعد بھی دیکھی جاتی ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ ایسے مشترک انسانی اصول کی حفاظت کے لیے قربانی کی گئی تھی کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اُس اصول کی بھی قدر و منزلت ہے۔ اور اس یادگار قربانی کی یاد بھی قائم ہے۔

ـــہ سفیر صاحب مسند یوگا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جتنا کوئی موضوع اہم ہوگا اور تاریخی حوادث میں جتنی کسی واقعہ کو ندرت اور اہمیت زیادہ ہوگی اُسی قدر اُس پر اہل فکر و قلم طبیعت آزمائی زیادہ کرینگے - اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعہ سے بڑھ کر کسی واقعہ پر نظم و نثر لٹریچر کا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا اسلامی تاریخ کی تدوین سے پہلے خصوصیت سے اس واقعہ پر تصانیف شروع ہو گئے اور ابھی کربلا کی زمین پر خون شہیداں کی تری خشک نہ ہوئی ہوگی کہ شاعروں کی زبان سے اس واقعہ کی نظم کے اشعار تراوش کرنے لگے ۔

سب سے پہلے ؎ "واقعات کربلا کے تاریخی عناصر کا تحفظ بہت کچھ اسیران کربلا نے کیا - جو کچھ مواد اُن سے ملتا ہے وہ اگرچہ مقدار میں کم ہے لیکن اُس سے حسینؑ کے فلسفۂ شہادت اور بنی امیہ کے مقصد زندگی کے سمجھنے میں حوصلے کے مطابق مدد ملتی ہے - اسیران کربلا کی وہ تقریریں جو کوفہ اور شام کے بازاروں اور درباروں میں ہزاروں کے مجمع عام میں ہوئی ہیں اور مدینہ واپس آکر مخدرات عصمت اور امام زین العابدین نے جس طرح ان واقعات کی اشاعت کی ہے اُس کے نتیجے میں اس واقعہ نے سارے عرب سے شناسائی حاصل کرلی - خود اموی نامہ نگاروں اور فوجیوں نے کسی نہ کسی رنگ میں واقعات کو (مسخ کرکے سہی) بیان کیا - وہ بغیر شعور کے اکثر اس کے ایسے جزئیات بیان کر دیتے تھے جن کی مورخ کی نگاہ میں بڑی قیمت ہے - شعراء کے لیے اس واقعہ نے دردانگیز مواد مہیا کیا اور خطیب اس سے اپنے کلام میں زور پیدا کرنے لگے، علاوہ اُن اشعار کے جو اہلبیت حسینؑ کی طرف منسوب ہیں عام شعراء میں چند شعر مرثیہ کے جو پہلے پہل کہے گئے وہ دیوان حماسہ کے صفحات پر اب تک موجود ہیں مگر مستقل طور سے اس سلسلہ کی ابتدا کمیت اسدی شاعر نے کی ہے - پھر سید اسمٰعیل حمیری نے اس میں ترقی کی اور دعبل خزاعی نے اس پر جلا کی اور یہ سلسلہ اس کے بعد جاری ہوگیا -

نثر میں اُن مختلف خطبوں کو چھوڑتے ہوئے جو اہلبیت کی زبان سے یا مختلف مقررین کے دہن سے ہنگامی طور پر نکلے ہیں خصوصاً اُن اقدامات کے ذیل میں جو امام حسینؑ کے خون کا بدلا لینے کے لیے سلیمان بن صرد خزاعی اور پھر مختار کی جانب سے ہوئے ہیں جن کا مقصد

؎ مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری

ہی یہ تھا کہ لوگوں کو واقعۂ کربلا کی اہمیت سے متاثر بنایا جائے۔ ان میں سے بہت کم خطبے موجود ہیں اور میرے خیال میں اگر وہ سب جمع ہوتے تو ایک بہت بڑا ذخیرہ واقعۂ کربلا کے متعلق ہمارے ہاتھ میں ہوتا مستقل طور سے اس سلسلہ میں تصنیف کی ابتدا پہلی صدی کے اواخر سے ہوگئی اور ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی کے مقتل کا نام اس عہد کی یادگار ہے جس سے اس کے بعد کی تمام کتابوں میں واقعات لیے گئے ہیں — اس کے بعد برابر مستند مورخین واقعہ کربلا پر مقاتل لکھتے رہے اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

آخر کتاب میں دوسرا ضمیمہ مختلف زبانوں میں واقعۂ کربلا کے بارے میں کتابوں کی فہرست کے متعلق آئے گا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ دنیا کے کسی موضوع پر اتنا نہیں لکھا گیا اور نہیں کہا گیا ہے جتنا کہ واقعۂ کربلا کے بارے میں لکھا اور کہا گیا ہے۔ مگر جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں سب مذہبی نقطۂ نظر کے ماتحت اُن ہی لوگوں کے لیے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے معتقد ہیں۔ اُن میں قرآن کی آیتیں ہیں۔ پیغمبر کی حدیثیں ہیں اور اس طرح کی روایتیں ہیں جو مسلمانوں کے طبقہ میں مقبول ہو سکتی ہیں۔ کوئی غیر مسلم ہندو، عیسائی یا کسی دوسرے مذہب کا انسان اگر واقعۂ کربلا کو اُس کے اسباب، نتائج اور ضروری تفصیلات کے ساتھ جاننا چاہے تو کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کا پتہ دیا جا سکے۔ پھر؎ جن لوگوں نے تاریخ نویسی کے فریضہ کو اپنے ہاتھ میں لیا وہ مورخ نہیں تھے اور نہ تاریخ نویسی کے قوانین سے واقف تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعۂ کربلا کبھی فلسفۂ تاریخ کے ماتحت صحیح استنتاج سے آشنا نہیں ہوا۔

زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے اور اس موقع پر جبکہ دنیائے انسانیت کے اس عظیم واقعہ کو پورے تیرہ سو برس ہو گئے ہیں اور ہر مذہب و ملت کے افراد متفق ہو کر حسین بن علی کی سیزدہ صدسالہ یادگار کی جانب پورے طور پر متوجہ ہیں تو یہ کتاب اس صدی کی یادگار کے طور پر حق، انصاف اور سچائی کی بارگاہ میں حریت، مساوات اور ایثار کی بارگاہ میں۔ انسانی دل، دماغ اور ضمیر کی بارگاہ میں انسانی جذبات، احساسات اور شریفانہ خیالات کی بارگاہ میں۔ انسانی وقار و عزت

؎ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب۔

اعدا فتخار کی بارگاہ میں۔ انسانی فکر، نظر اور کردار کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے

حسین بن علی کے کارنامۂ جاوید کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو الفاظ کی محدود دنیا کے بس سے باہر ہے لیکن اگر اس پوری کتاب میں ایک جملہ بھی اُس ایثار و قربانی کی تصویر کا کوئی رُخ آنکھوں کے سامنے لاسکے تو یہی اس خدمت کا پورا حاصل ہوگا۔

میراث برصغیر
(شش ماہی)

شہادت امام حسینؑ

تالیف: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
مرتب: ترجمان القرآن لاہور
تاریخ: جولائی ۱۹۶۱ء

- تمثال مؤلف
- مؤلف کے بارے میں
- کتاب کے بارے میں
- متن کتاب
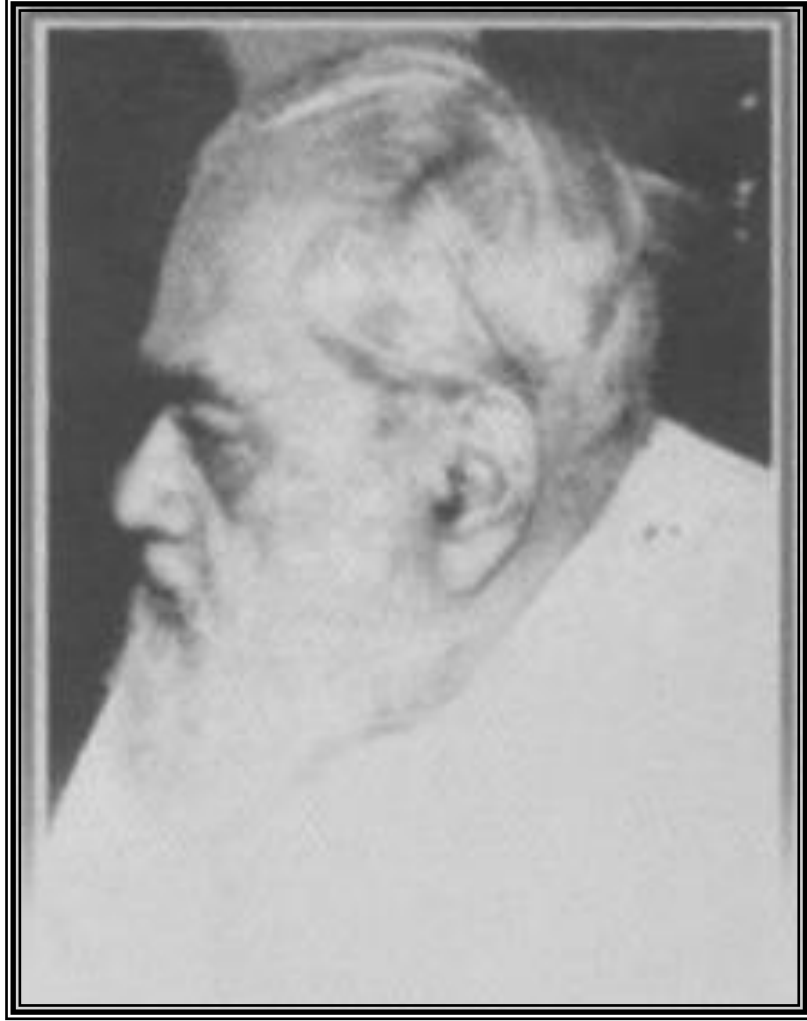
تمثال: علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودی مؤلف کتاب ”شہادت امام حسینؑ“

✍ از قلم: طاہر عباس اعوان

مؤلف کے بارے میں

علامہ سید ابو الاعلیٰ مودودی ؒ 25 ستمبر ۱۹۰۳ء میں حیدر آباد دکن کے علاقے اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۵ سال کی عمر میں صحافت کا آغاز کیا۔ جب گاندھی نے یہ اعتراض کیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، مودودی صاحب نے اس اعتراض کے جواب ۱۹۲۸ء ۲۴ سال کی عمر میں قانون صلح وجنگ پر "الجہاد فی الاسلام" نامی کتاب لکھ کر اسلامی مفکرین ودانشوروں کو جہاد اسلامی کی طرف متوجہ کرایا۔ اور گاندھی کے اعتراضات کو رد کیا۔

۱۹۳۲ء یعنی ۲۹ سال کی عمر میں حیدر آباد دکن میں ماہنامہ ترجمان القرآن کا اجراء کیا جو بغیر وقفہ کے آج ٹھیک اسی ۸۰ سال گذر جانے کے بعد بھی اسی راہ وروش پر جاری ہے۔

علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو لاہور آنے کی دعوت دی، مودودی صاحب نے علامہ کی دعوت قبول کی لیکن عملی جامہ پہنانے سے قبل علامہ اقبال وفات پا گئے۔

۲۶ اگست ۱۹۴۱ء ۳۸ سال کی عمر میں لاہور میں ۷۵ افراد کے اجتماع میں جماعت اسلامی کا سنگ بنیاد رکھا اور مودودی صاحب بحثیت امیر جماعت منتخب ہوئے۔ مودودی صاحب مسلسل ۱۲ سال یعنی ۱۹۴۱ء تا ۱۹۵۳ء تک پاکستان میں اسلامی نفاذ کے لئے کوشاں رہے۔ اور پاکستان میں لیاقت علی خان اور دیگر حکمرانوں کے بعض غیر اسلامی دستورات کی مخالفت کے علاوہ قادیانیت کے خلاف کھل کر تقریریں کیں اور تحریریں لکھیں جس کے جرم میں انہیں چند مرتبہ جیل جانا پڑا۔

اس حق گوئی کی وجہ سے ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء رات کے وقت علامہ کو گرفتار کیا گیا۔ ۵ مئی کو فوجی عدالت نے دو الزام کے تحت مقدمہ چلایا اول باغیانہ بیانات، دوم قادیانیت کے خلاف تحریر۔

۱۱ مئی ۱۹۵۳ء میں فوجی عدالت سے سزا موت سنائی گئی۔ لیکن دنیا بھر میں اس حکم کے خلاف مظاہرات واحتجاجات کی وجہ سے یہ سزابعد میں عمر بھر قید بامشقت میں تبدیل ہوئی۔ لیکن ۲۵ ماہ بعد علامہ کو رہا کر دیا گیا۔

۲۹ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہائی کے بعد جماعت اسلامی کا تیسرا کل پاکستان، کراچی میں اجتماع ہوا۔

۱۹۶۳ءلاہور میں جماعت اسلامی کا پانچویں کل پاکستان اجتماع کے دوران مولانا پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

۶ جنوری ۱۹۶۴ء میں مولانا کے ساتھ جماعت کے ۴۹ افراد کی گرفتاری عمل میں آئی اور اسی سال جماعت اسلامی کو کالعدم جماعت قرار دیا گیا۔

نومبر ۱۹۷۲ء کو مولانا نے مسلسل علالت کی وجہ سے جماعت اسلامی کی امارت سے استعفیٰ دے دیا۔

جنوری ۱۹۷۹ء میں آیت اللہ العظمیٰ مجاہد کبیر رہبر عظیم امام خمینیؒ کے نمایندے جناب ڈاکٹر کمال اور انجینیر محمد نے مرکز جماعت اسلامی اچھرہ لاہور میں مولانا مودودی سے ملاقات کی اور مودودی صاحب کو امام خمینیؒ کا پیغام پہنچایا۔ مولانا مودودی نے اس ملاقات میں انگلش اور فارسی میں گفتگو کی تھی اس ملاقات میں صحافیوں اور دیگر افراد کے علاوہ جماعت کے مندرجہ ذیل افراد شریک تھے:

۱۔ مولانا نعیم صدیقی؛
۲۔ مولانا قاضی حسین احمد؛
۳۔ مولانا خلیل حامدی۔

۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء کو نعلیو (امریکہ) کے ہسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اس طرح نہ فقط مسلمانان پاکستان بلکہ پوری امت مسلمہ ایک راہنما سے محروم ہو گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تصانیف

مولانا مودودی کی ۶ زبانوں میں مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتب کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ۱۹۲۲ء سے ۱۹۷۷ء کے دوران شائع ہو چکی تھیں۔ مولانا ایک روشن فکر مفکر تھے اور ہر اس چیز جس کو غیر

اسلامی سمجھتے تھے بلاخوف لومۃ لائم ٹھکرادیتے تھے اور ایسے افراد کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے تھے جو غیر اسلامی افکار یا افعال کے حامل ہو اس میں فرق نہیں کہ وہ ملت مسلمہ کے عام افراد ہو یا خلفاء حتی خلفاء راشدین۔

اس سلسلہ میں مولانا کی کتاب خلافت وملوکیت ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے یہی وجہ تھی کہ مولانا کی اپنی فکر کے بعض دانشوروں نے مولانا کی اس کتاب کے خلاف متعدد کتب تحریر کیں جن کے جواب میں ملک غلام علی نے خلافت وملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ کے نام سے ایک مستدل کتاب تحریر فرمائی۔اس سے قبل کے ہم غلام علی صاحب کی مذکورہ کتاب سے اس کی تحریر کی وجہ تالیف تحریر فرمائیں ان کتب کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو علماء دیوبند کی طرف سے مولانا مودودی اوران کی جماعت کے خلاف تحریر ہوئیں ہیں:

۱۔فتنہ مودودیت، شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا کاندہلوی؛

۲۔مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی؛

۳۔الاستاد المودودی، علامہ محمد یوسف بنوری؛

۴۔کشف حقیقت، مولانا سعید احمد صاحب مظاہر علوم سہارنپور؛

۵۔مودودی صاحب کا ایک غلط فتویٰ، مولانا سرفراز خان صفدر صاحب؛

۶۔تنقید اور حق تنقید، مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب؛

۷۔مودودی مذہب، مولانا قاضی مظہر حسین صاحب چکوالی؛

۸۔مودودی صاحب کا نصب العین، مولانا لال حسین اختر صاحب؛

۹۔آئینہ تحریک مودودیت، مولانا مفتی مہدی حسن شاہجہانپوری؛

۱۰۔مکتوبات بسلسلہ مودودی جماعت، مولانا حسین احمد مدنی؛

۱۱۔مکتوبات شیخ جلد سوم؛

۱۲۔جماعت اسلامی سے مجلس مشورت تک، مولانا منظور نعمانی؛

۱۳۔حق پرست علماء کی مودودی سے ناراضگی کے اسباب، مولانا احمد علی صاحب لاہوری؛

۱۴۔اظہار حقیقت بجواب خلافت وملوکیت، مولانا محمد اسحاق صدیقی؛

۱۵۔ تقصیرات تفہیم، مولانا مفتی عزیز الرحمن بجنوری صاحب؛
۱۶۔ حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق، مولانا مفتی محمد تقی صاحب؛
۱۷۔ تحریک مودودیت کی ایکسرے رپورٹ، مولانا عبد القدوس رومی؛
۱۸۔ مودودیت بے نقاب، مولانا عبد القدوس رومی صاحب؛
۱۹۔ عادلانہ دفاع، مولانا سید نور الحسن بخاری صاحب؛
۲۰۔ مودودی صاحب کے غلط نظریات، جناب کریم الدین صاحب؛
۲۱۔ تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر اسرار احمد؛
۲۲۔ اسلامی سیاسات یا سیاسی اسلام، حکیم مولانا عبید اللہ سری نگر؛
۲۳۔ تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب؛
۲۴۔ مقام صحابہ کتاب و سنت کی روشنی میں اور مولانا مودودی صاحب، جناب محمد ابو بکر غازی پوری صاحب؛
۲۵۔ مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سر گزشت اور اب میرا موقف، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب؛
۲۶۔ صحابہ کرام اور ان پر تنقید، جناب مولانا محمد عبد اللہ صاحب؛
۲۷۔ ہفوات، محمود احمد عباسی؛
۲۸۔ حقیقت خلافت وملوکیت، محمود احمد عباسی؛
۲۹۔ مودودی صاحب اور ان کی تحریر کے متعلق چند اہم مضامین۔

یاد رہے کہ مودودی صاحب کی مذکورہ کتاب کے خلاف علماء اہل سنت کے علاوہ بعض شیعہ علماء نے بھی قلم اٹھایا ہے جیسے کتاب امامت وملوکیت، علامہ حسین بخش جاڑا مرحوم۔

مودودی صاحب کے خلاف علماء اہل تسنن نے یہ سب کتب صرف اس لئے تحریر کی تھیں کہ مولانا نے بعض صحابہ اور بالخصوص معاویہ کے زندگی کے سیاہ کارناموں کو نمایاں طور پر اپنی کتاب میں تحریر فرمایا تھا۔ اور پھر جب علماء اہل سنت خصوصا محمد تقی عثمانی نے ان کے خلاف جب لکھا تو ملک غلام علی نے ان کے رد اور مودودی صاحب کے دفاع میں جلتی پر تیل کا کام کیا اور اس طرح معاویہ بن ابی سفیان اور اس کے نالائق

فاسق وفاجر بیٹے یزید جسے معاویہ نے اپنا جانشین وولی عہد بنایا تھا اور اسی طرح مروان بن حکم، زیاد بن ابیہ جس کے متعلق چار افراد نے دعوی کیا تھا کہ یہ ہمارا نطفہ ہے، جن میں ایک ابی سفیان تھا، اسی وجہ سے معاویہ نے اس کو اپنا بھائی بنایا تھا جس پر بعض صحابہ نے اعتراضات بھی کیے تھے، ان سب کے متعلق وہ سب کچھ لکھ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔

اس کتاب میں انہیں فاسق، فاجر، ظالم، قاتل، باغی، ملعون، مفسد، بے رحم وغیرہ ثابت کرنے والے تمام واقعات کتب معتبر اہل سنت سے محکم دلائل کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ ملک صاحب اپنی کتاب کے مقدمہ میں ناصبیت کی بڑھتی ہوئی تبلیغ اور اس کتاب کی وجہ تصنیف کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **پاکستان میں اس فتنہ ناصبیت کے بانی اور سر خیل محمود احمد عباسی ہیں اور یہ ایک افسوس ناک اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہمارے بعض سنی حلقوں نے اس فتنے کی خوب پذیرائی وحوصلہ افزائی کی ہے اور چند ایک علمائے اہل سنت کو چھوڑ کر کسی کو اس کی تردید میں ایک لفظ تک کہنے یا لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ان مستثنیات میں سے ایک مولانا محمد عبد الرشید نعمانی، استاذ جامعہ اسلامیہ بہاولپور ہیں جن کے ایک ناتمام سلسلہ مضمون کی چند قسطیں بینات میں شائع ہو سکیں اور پھر اسے بند کر دیا گیا، اس مضمون کا عنوان تھا۔ ناصبیت تحقیق کے بھیس میں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ماہنامہ بینات، رمضان ۱۹۸۲ء سے مولانا موصوف کی ایک عبارت نقل کر دوں، فرماتے ہیں:**

> **یہ محمود احمد صاحب عباسی کی بدنام کتاب "خلافت معاویہ ویزید" پر تنقید ہے اس ملک میں رفض کا فتنہ قدیم سے تھا۔ باطنیہ وامامیہ سب پہلے سے موجود تھے البتہ خوارج ونواصب کا ڈھونڈنے سے بھی پتہ نہ تھا۔ لیکن عباسی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اہل سنت میں ناصبیت کا تازہ فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ اب بہت سے لوگ ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اور یزید کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خاطی وغلط کار سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ**

اس کتاب سے سوائے ضرر کے فائدہ کوئی مرتب نہ ہوا۔ روافض تو اپنی جگہ اور سخت ہو گئے، لیکن اہل سنت کے اعتدال میں بھی فرق آگیا بہت سے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں شک کرنے لگے۔

آج تک کسی ایک رافضی کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا جاسکتا کہ وہ عباسی صاحب کی کتاب پڑھ کر تائب ہو گیا ہو، لیکن اس کے برخلاف اس کتاب کے مطالعے کرنے والوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی نکلے گی جو اس جھوٹ کے پلندہ کو صحیح سمجھ کر حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے اپنے دلوں کو صاف نہ رکھ سکے۔ اس کتاب نے سادہ لوح عوام نہیں، بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کیا ہے جن میں عربی مدارس کے بھی بہت سے فارغ التحصیل شامل ہیں۔

جن لوگوں کی دسترس موضوع کتاب کے اصل مآخذ تک نہیں وہ اس کو تحقیق اور ریسرچ کا ایک نادر شاہکار سمجھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اب مسلمان من حیث القوم علوم اسلامیہ سے نابلد ہو گئے ہیں... اصل بات یہ ہے کہ روافض کے سب و شتم سے لوگ تنگ آئے ہوئے تھے ایسے میں یہ کتاب شائع ہوئی جس میں حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے موقف پر اس سے کہیں زیادہ سلجھے ہوئے اور سنجیدہ انداز میں جرح کی گئی جو روافض کی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے موقف کو مجروح کرنے میں عام روش ہے۔

اس لئے رد عمل کے طور پر بہت سے لوگ عباسی صاحب کے اس طرز عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے حالانکہ تمام اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے اور جو لوگ ان سے بر سر جنگ رہے وہ خطا پر تھے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کر کے غلطی کی اور وہ خلیفہ راشد نہ تھے۔ ان کا بیٹا یزید ظالم و جابر حکمران تھا اور حضرت حسینؓ، حضرت عبد اللہؓ بن زبیر اور وہ تمام صحابہ کرام جو جنگ حرہ میں شہید ہوئے اور جنہوں نے یزید کے تسلط و اقتدار کو برہم کرنے کی کوشش کی وہ سب حق کے داعی اور خیر کے علمبردار تھے مگر اس کتاب "کتاب معاویہ و یزید" کی

تصنیف صرف ان ہی امور کی تردید کے لئے عمل میں آئی ہے اور اس کے مطالعہ سے اہل سنت کا یہ نقطہ نظر صریح طور پر غلط معلوم ہوتا ہے اور یہی ناصبیت کا عین منشاء ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ناصبیت جدیدہ جسے ہمارے بعض علماء و اہل مدرسہ تقویت بہم پہنچارہے ہیں، یہ ناصبیت قدیمہ سے بھی بازی لے گئی ہے پرانی ناصبیت کے علمبرداروں کی یہ جرات نہیں تھی کہ وہ حضرت علیؓ کی خلافت کے انعقاد کا علی الاعلان انکار کرتے یا ان کی سیرت کو داغدار کر کے پیش کرتے اس لئے وہ بس امیر معاویہ کے فضائل و مناقب میں مبالغہ آمیزی کرنے پر اکتفاء کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ محمد بن احمد سفارینی اپنی تصنیف "لوامع الانوار الهيه و سواطع الاسرار لاثريه" میں امام احمد بن حنبل کے صاحب زادے عبداللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

سالت ابي عن علي ومعاوية فقال: اعلم ان عليا كان كثرا الاعداء ففتش له اعداء شيئا فلم يجدوا فجاؤا الي رجل قد حاربه وقاتله فاطروه ليادا منهم له رضي الله عنه

میں نے اپنے والد امام احمد بن حنبل سے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ کے متعلق سوال کیا تو کہنے لگے: تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت علیؓ میں کوئی نقص تلاش کیا مگر نہ پاسکے تو یہ لوگ ایک ایسے شخص (یعنی امیر معاویہ) کی طرف متوجہ ہوئے جس نے حضرت علیؓ سے جنگ وجدال کیا تھا اور ان اعدائے علیؓ نے امیر معاویہ کی تعریف بڑھا چڑھا کر کی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک چال تھی۔[1]

لیکن عہد جدید کے ناصبیوں کا اور ان کے ہمنواؤں کا حال یہ ہے کہ وہ علانیہ حضرت علیؓ کی خلافت کو مشتبہ، غیر منعقد اور ناکام ثابت کرنے اور انہیں طالب اقتدار اور شورش پسندوں کا آلہ کار بنا کر دکھانے کی

[1] لوامع انوار البہیہ، الجزء الثانی ص ۳۳۹، شیخ محمد السفارینی الاثر، مطبع دار الاصفہانی، جدہ ۱۳۸۰ھ۔

مذموم جسارت کررہے ہیں اور اس کے بالمقابل نہ صرف حضرت معاویہ کو صلواۃ اللہ علیہ [1] خلیفہ راشد اور امام معصوم بنا کر پیش کر رہے ہیں بلکہ یزید، مروان اور حکم کو بھی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے زمرہ مبشرہ میں داخل کر رہے ہیں۔ع ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔

اب بعض سنی حضرات (خواہ وہ حنفی و دیوبندی ہوں یا اہل حدیث ہوں) جو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت وملوکیت کے خلاف اتنی ہنگامہ آرائی و خامہ فرسائی کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ سارا جھگڑا اسی کتاب سے پیدا ہوا، ان سے بجا طور پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ فرض کیا اس بے بنیاد الزام کو تسلیم کر لیا جائے کہ اس کتاب سے صحابہ کرام کی توہین اور رافضیوں کی تقویت کا سامان ہو گیا، لیکن اس سے پہلے یہ جو رافضت سے بدتر ناصبیت کا پودا آپ کے زیر سایہ برگ وباز لا رہا ہے اور پھل پھول رہا ہے ، یہ بھی آپ کے نزدیک فتنہ کی تعریف میں آسکتا ہے یا نہیں؟ اگر آسکتا ہے تو اس کے خلاف آپ نے کتنا زور لگایا ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ عباسی صاحب کی کتاب مذکور کا مواد ۱۹۵۶۔۵۷ء میں دو سال تک کراچی کے ماہنامہ تذکرہ میں شائع ہوتا رہا جس کے مدیر، مضمون نگار وغیرہ بیشتر دیوبندی علماء تھے۔ مولانا مودودی کی کتاب اس سے کہیں دس سال بعد جا کر چھپی ہے۔ اس پورے عرصے میں صرف چند اصحاب (مثلاً مولانا طیب صاحب، مولانا عبد الرشید نعمانی صاحب) کو چھوڑ کر اکثر علماء بالکل خاموش رہے ہیں۔ لیکن خلافت وملوکیت کا سلسلہ مضامین جونہی شائع ہونا شروع ہوا تو فضا میں اچانک حرکت پیدا ہوگئی۔ سنی و ناصبی سب گلے مل گئے اور مولانا مودودی کی مخالفت میں یک زبان ہو گئے۔

یہ اتحاد مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ متحد ہیں فقیہان شہر میرے خلاف

---

[1] محمود عباسی صاحب اپنی کتاب حقیقت خلافت وملوکیت ص ۲۴۵ پر لکھتے ہیں معاہد کی دیت مسلمان کے برابر قرار دینا امیر المومنین معاویہ صلٰوۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

خلافت وملوکیت کا مواد ''ترجمان'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا کہ اس کے خلاف عباسی صاحب نے ایک ''ہفوات'' لکھ کر چھاپ دی جسے تین سال بعد ''حقیقت خلافت وملوکیت'' کے نام سے اضافوں سے ساتھ شائع کیا گیا اس کے علاوہ عباسی صاحب ان کے بھتیجے اور ان کے بعض اعوان وانصار نے اپنے افکار ونظریات کی اشاعت کے لئے متعدد دیگر کتب ورسائل لکھے اور طبع کرائے ہیں۔ اس فتنے کی لَے یہاں تک بڑھی ہے کہ ان میں سے ایک شخص محمد دین بٹ نے اپنی کنیت ابویزید رکھ کر رشید ابن رشید امیر المومنین سیدنا یزید رضی اللہ عنہ کے نام سے ایک کتاب شائع کر دی ہے۔

اس تحریک کا ایک مقصد تو وہی ناصبیت تھا جس کی تقویت کے لئے کتاب وسنت کے نصوص صریحہ سے تو اعراض وانکار کیا گیا مگر اپنے مطلب کے لئے جو رطب ویابس حتی کہ شیعوں، قادیانیوں، اسماعیلیوں، یہود وہنود اور نصاری تک کے جو اقوال مل سکے انہیں اپنی تحریروں میں جمع کر دیا گیا۔

مگر ان لوگوں کا ایک دوسرا مقصد بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ پاکستان کے ہر ظالم وجابر حکمران کی چاپلوسی کی جائے اور یہاں استبداد وآمریت کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ چنانچہ میں بطور ثبوت عباسی صاحب کی ایک کتاب سے ایک نمونہ پیش کرتا ہوں۔ تحقیق مزید بہ سلسلہ ''خلافت معاویہ ویزید'' ص۲۳۸ پر وہ لکھتے ہیں:

> **اسلامی تاریخ میں شاید یہی ایک قابل تقلید مثال مفادات امت کے پیش نظر بغیر خونریزی کے سیاسی انقلاب پیدا کرنے کی ہے جو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان حضرات کو کہ اس طرح اسوہ عثمانی پر عمل تو ہو سکا۔**

محمود عباسی وغیرہ کی ''خرافات وہفوات'' سے ہمارے علماء اور تعظیم صحابہ کے علمبرداروں نے صرف اغماض ہی نہیں برتا، بلکہ اسے ریسرچ اور تحقیق انیق قرار دے کر اپنے رسالوں میں ان کو خراج تحسین پیش کیا، ان کی کتابوں کے اشتہار دیئے، فروخت کیا اور ان کی تصانیف پر تقریظات لکھیں۔ مثال کے طور پر علی احمد عباسی کی کتاب ''حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی'' کے شروع میں مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی نے تعارف رقم فرمایا ہے یہ کتاب جب شیعوں کے شور مچانے پر ضبط ہوئی تو حکیم محمود احمد ظفر

صاحب سیالکوٹی نے اس کتاب کا ہو بہو چربہ بلکہ سرقہ کرکے ایک کتاب "سیدنا معاویہ شخصیت و کردار" تیار کرلی اور چھاپ ڈالی جس کا تعارف مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کا ذکر عباسی صاحب نے شکریہ و شکوہ کے جن ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا ہے، وہ ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

> **حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی" مؤلفہ پروفیسر مولوی علی احمد عباسی سلمہ معرکۃ الآرا کتاب پہلے چھپی تھی... اسی مضمون پر ایک اور کتاب حکیم محمود احمد ظفر کی مؤلفہ شائع ہوئی ہے، "سیدنا معاویہ شخصیت و کردار" جس کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ظفر صاحب نے حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی کی کتاب سے استفادہ ہی نہیں، بلکہ اسے سامنے رکھ کر اپنی کتاب مرتب کرڈالی، قدرے لفظی تغیر کے ساتھ عنوانات بھی اسی طرح کے اور مضمون بھی اکثر و بیشتر وہی۔ یہ صاحب کراچی آکر راقم الحروف سے کئی بار ملے، اپنا عندیہ ظاہر کر دیتے اپنی اور اپنے بھتیجے کی کتاب سے مواد لینے کی اجازت بڑے شوق سے دے دی جاتی، کیونکہ مقصد تو تحریک کی اشاعت ہے، یوں بلا اجازت مضامین نقل کر کے کتاب مرتب کرلینا کہاں تک مناسب ہے؟ اسی بحث پر ابویزید محمد دین بٹ کی کتاب "رشید ابن رشید" اچھی تالیف ہے۔ نیز کتابچہ "عارف یزید" بھی۔ (۱)**

ان حکیم محمود احمد صاحب کے بارے میں اتنی مزید وضاحت مناسب ہے کہ ان کا تعلق باری باری سے ہزاروی جمعیت علماء اور مرکزی جمعیت علماء اسلام سے رہا ہے اور ان کے مضامین ان کے رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ (۲)

۱۔ حقیقت خلافت وملوکیت، محمود احمد عباسی ص ۵۵۷۔

۲۔ خلافت وملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ ص ۱۱ تا ۱۷

مولانا مودودی کی کتاب "خلافت وملوکیت" کا اصل اور مرکزی موضوع اگرچہ کتاب وسنت کا نظریہ سیاست اور خلافت راشدہ کی حکومت ہے، تاہم اس کے چند صفحات اس بحث پر بھی مشتمل ہیں کہ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے کے تاریخی وجوہ کیا تھے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ اس کتاب کی زد عباسی صاحب کے ملحدانہ و مبتدعانہ نظریات پر بھی پڑتی تھی وہ آخر اس کتاب کی چوٹ اپنے اوپر کس طرح محسوس نہ کرتے جب کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں اگر کوئی شخص ہے جس کا انتخاب بالکل پہلی بار امت کے عام استصواب سے ہوا تو وہ امیر المومنین یزید ہیں۔ [۱]

لیکن ان علمائے اہل سنت کی روش بڑی تعجب خیز ہے جو عباسی صاحب کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ علماء بیک کرشمہ دو کار انجام دینا چاہتے ہیں اور ایک ہی حربے سے ایسا وار کرنا چاہتے ہیں جس سے "خلافت وملوکیت" کا مصنف بھی مجروح و مطعون ہو اور ناصبیت ویزیدیت کی تحریک بھی مقبول و محبوب ہو۔ حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ، حضرت ابن زبیرؓ ناکام و نااہل نظر آئیں، امیر معاویہ ویزید اور مروان کامیاب و کامران قرار پائیں اور تصویر کا یہ رخ پیش کرنے والے نہ صرف سنی کے سنی ہی رہیں، بلکہ تحقیق و تدقیق اور صحابہ کی تعظیم کرنے والے کہلائیں۔

بہر کیف یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ حضرات اس ضلالت کی روک تھام کرنے کے بجائے اپنا پورزور اس کتاب کی تردید و تغلیط پر لگا رہے ہیں جسے ناصبیت کے پرچارک اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ یہ ساری ہنگامہ آرائی اور غوغہ سرائی جو سالہا سال سے جاری ہے، ہم اب تک اس کے بالمقابل خاموش رہے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ شاید یہ طوفان وعدوان کسی آخری حد تک جا کر رک جائے لیکن بظاہر اس حد کا کوجزر نظر نہیں آرہا اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کہیں رک نہیں سکے گا۔ اس لئے میں نے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ اللہ کا نام لے کر قلم اٹھایا اور تبصرہ وتجزیہ کے لئے اس سلسلہ مضامین کو منتخب کیا جو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحب زادے محمد تقی صاحب عثمانی نے اپنے رسالے "البلاغ" میں محرم ۱۳۸۹ھ سے شروع کیا تھا۔ [۲]

۱۔ ملاحظہ ہو "خلافت معاویہ ویزید" طبع دوم ص ۳۸ مزید واضح رہے کہ شیعوں نے بھی ایک کتاب "امامت وملوکیت بجواب خلافت وملوکیت" چھاپی ہے جس میں خلافت وملوکیت کو شیعیت کے لئے زہر قاتل قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ خلافت وملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ ص ۱۸

مودودی صاحب کے افکار، حالات، تصنیفات کی تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل کتب کی طرف مراجع فرمائیں:

۱۔ نگاہی بہ احوال و آثار و افکار سید ابوالاعلیٰ مودودی، تالیف سعید اسد گیلانی، فارسی ترجمہ استاد نذیر احمد اسلامی؛

۲۔ میری یادگار ملاقاتیں، مؤلف امیر حسین چمن؛

۳۔ صراط مستقیم و ادیان باطلہ، تالیف مفتی محمد نعیم؛ اس کتاب میں مودودی صاحب کے افکار اور اس کی جماعت کو ادیان باطلہ میں شمار کیا گیا ہے۔

کتاب کے بارے میں

یہ رسالہ در حقیقت مولانا مودودی صاحب کی تقریر ہے جو انہوں نے شیعہ و سنی اجتماع میں کی تھی جسے بعد میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" جولائی ۱۹۶۰ء میں افادہ عام کے لئے شائع کیا تھا۔ بعد میں جداگانہ طور پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی نے بھی اسے افادہ عام کے لئے طبع کیا۔

ہمارا شش ماہی مجلہ "میراث برصغیر" چونکہ محرم الحرام اور جمادی الثانی میں نشر ہوتا ہے اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ محرم الحرام میں مجلہ ہمیشہ "محرم الحرام نمبر" کے عنوان سے طبع ہوتا رہے جس میں امام حسین علیہ السلام اور عزاداری سید الشہداء علیہ السلام وغیرہ سے مربوط برصغیر کی شیعہ و سنی دانشوروں کے افادات کو منظر عام پر لایا جائے۔

مودودی صاحب کا یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مودودی صاحب نے اس تقریر میں شہادت امام حسینؑ کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح الفاظ میں تحریر فرمایا تھا کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر اس کی تخت نشینی سے جس چیز کی ابتداء تھی وہ اسلامی حکومت کے دستورات، ارکان و مقاصد کی تغیر تھی اس سلسلہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> **یزید کی ولی عہدی اور پھر اس کی تخت نشینی سے دراصل جس خرابی کی ابتداء ہو رہی تھی وہ اسلامی ریاست کے دستور اور اس کے مزاج اور اس کے مقصد کی تبدیلی تھی۔** (1)

پھر فرماتے ہیں:

---

[1] شہادت امام حسینؑ ص ۵۔

اسلامی ریاست کا مقصد خدا کی زمین میں ان نیکیوں کو قائم کرنا اور فروغ دینا تھا، جو خدا کو محبوب اور ان برائیوں کو دبانا تھا جو خدا کو ناپسند ہیں مگر انسانی بادشاہت کا راستہ اختیار کرنے کے بعد حکومت کا مقصد فتح ممالک اور تسخیر خلائق اور تحصیل باج و خراج اور عیش دنیا کے سوا کچھ نہ تھا اسلامی ریاست کی روح تقویٰ اور خدا ترسی اور پرہیز گاری کی روح تھی جس کا سب سے بڑا مظہر خود ریاست کا سربراہ ہوتا تھا۔

حکومت کے عمال اور قاضی اور سپہ سالار، سب اس روح سے سرشار ہوتے تھے اور پھر اس روح سے وہ پورے معاشرے کو سرشار کرتے تھے، لیکن بادشاہی کی راہ پر پڑتے ہی مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں نے قیصر و کسریٰ سے رنگ ڈھنگ اور ٹھاٹھ باٹھ اختیار کرلئے۔ عدل کے جگہ ظلم و جور کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ پرہیز گاری کی جگہ فسق و فجور اور راگ ناگ اور عیش و عشرت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ حرام و حلال کی تمیز سے حکمرانوں کی سیرت و کردار خالی ہوتی چلی گئی۔ سیاست کا رشتہ اخلاق سے ٹوٹتا چلا گیا۔ خدا سے خود ڈرنے کی بجائے حاکم لوگ بندگان خدا کو اپنے آپ سے ڈرانے لگے اور لوگوں کے ایمان و ضمیر بیدار کرنے کے بجائے ان کو اپنی بخششوں کے لالچ سے خریدنے لگے۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے اسلامی دستور کے سات بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور مولانا نے ان اصولوں کو دو زمانوں میں تقسیم کیا خلافت اولی سے لے کر امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی خلافت کا زمانہ یعنی ان کے بقول دورہ خلافت راشدہ اور پھر اس زمانہ سے لے کر تمام بنی امیہ و بنی عباس اور دیگر جابر حکمرانوں کا دورے اقتدار۔

مودودی صاحب نے اس حقیقت کا اقرار کیا ہے:

خلافت راشدہ کے بعد کوئی بھی حکومت خصوصا یزید کی ولی عہدی سے آج تک ان اسلامی دستوروں کی پابند نہیں رہی بلکہ قیصر وکسری کے سے رنگ ڈھنگ اور ٹھاٹھ باٹھ اختیار کر لیا۔

جن اسلامی دستورات کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ آزادنہ انتخاب؛

۲۔ شورائی نظام؛

۳۔ اظہار رائے کی آزادی؛

۴۔ خدا اور خلق کے سامنے جواب دہی؛

۵۔ بیت المال، ایک امانت؛

۶۔ قانون کی حکومت؛

۷۔ حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات۔

ان دستورات کا گنوانے کے بعد مولانا نے فرمایا: یہ تھے وہ تغیرات جو اسلامی حکومت کو خاندانی بادشاہت میں کرنے سے رونما ہوئے۔ کوئی شخص اس تاریخی حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ یزید کی ولی عہدی ان تغیرات کا نقطہ آغاز تھی ہم مولانا کی اس روشن فکری کی داد دینے کے علاوہ اس شکوہ کا حق محفوظ رکھتے ہیں کہ خود آپ کی کتاب "خلافت وملوکیت" اور تاریخی حقیقت اس بات پر گواہ ہے کہ ان دستورات اسلامی سے انحراف اور اس کا عملی نقطہ نگاہ من جمیع جھات خلافت سوم سے ہوا ہے۔ یزید نے اس کو مستحکم کیا ہے۔ البتہ تاریخ کی حقیقی گواہی کے مطابق امیر المومنین علیؑ کے علاوہ کوئی خلیفہ خلفاء راشدین میں سے صحیح معنوں میں ان اسلامی دستورات کا پابند نہیں رہا۔ خلفاء کے انہی تغیرات کی وجہ سے ۱۴۰۰ چودہ سو سال سے آج تک مسلمانوں میں مباحث مناظرات ہو رہے ہیں۔

لہٰذا مولانا کے اس فیصلہ سے تاریخ کی حقیقی گواہی کو شدید اختلاف ہے، حقیقت کے متلاشیوں کے لیے اس سلسلہ میں دیگر دسیوں کتب کے علاوہ علامہ سید مفتی محمد قلی خانؒ (متوفی ۱۲۶۰ھ) کی کتاب "تشیید المطاعن" کا مطالعہ کافی مدد گار ثابت ہو گا۔

متن کتاب

"یہ تقریر لاہور میں شیعہ سنی حضرات کی ایک مشترکہ نشست میں کی گئی تھی، جو ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور کی اشاعت ماہ جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کو افادہ عام کی خاطر کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔" (ناشر)

مقصد شہادت

ہر سال محرم میں کروڑوں مسلمان شیعہ بھی اور سنی بھی، امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان غمگساروں میں سے بہت ہی کم لوگ اس مقصد کی طرف توجہ کرتے ہیں، جس کے لئے امام نے نہ صرف اپنی جان عزیز قربان کی بلکہ اپنے کنبے کے بچوں تک کو کٹوا دیا۔ کسی شخص کی مظلومانہ شہادت پر اس کے اہل خانہ کا، اور اس خاندان سے محبت و عقیدت یا ہمدردی رکھنے والوں کا اظہار غم کرنا تو ایک فطری بات ہے۔ ایسا رنج و غم دنیا کے ہر خاندان اور اس سے تعلق رکھنے والوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت اس سے زیادہ نہیں کہ اس شخص کی ذات کے ساتھ اس کے رشتہ داروں کی اور خاندان کے ہمدردوں کی محبت کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ امام حسینؓ کی وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی ہر سال ان کا غم تازہ ہوتا ہے؟ اگر یہ شہادت کسی مقصد عظیم کے لئے نہ تھی تو محض ذاتی محبت و تعلق کی بنا پر صدیوں اس کا غم جاری رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں اور خود امام کی اپنی نگاہ میں اس محض ذاتی و شخصی محبت کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ انہیں اگر اپنی ذات اس مقصد سے زیادہ عزیز ہوتی تو وہ اسے قربان ہی کیوں کرتے؟ ان کی یہ قربانی تو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس مقصد کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ لہذا اگر ہم اس مقصد کے لئے کچھ کریں

،بلکہ اس کے خلاف کام کرتے رہیں، تو محض ان کی ذات کے لئے گریہ وزاری کر کے، اور ان کے قاتلوں پر لعن وطعن کر کے قیامت کے روز نہ تو ہم امام ہی سے کسی داد کی امید رکھ سکتے ہیں اور نہ یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ان کا خدا اس کی کوئی قدر کرے گا۔

اب دیکھنا چاہیے کہ وہ مقصد کیا تھا؟ کیا امام تخت و تاج کے لئے اپنے کسی ذاتی استحقاق کا دعویٰ رکھتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی؟ کوئی شخص بھی جو امام حسینؓ کے گھرانے کی بلند اخلاقی سیرت کو جانتا ہے، یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ اپنی ذات کے لئے اقتدار حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں میں خوں ریزی کر سکتے تھے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کا نظریہ ہی صحیح مان لیا جائے جن کی رائے میں یہ خاندان حکومت پر اپنے ذاتی استحقاق کا دعوی رکھتا تھا، تب بھی حضرت ابو بکرؓ سے لے کر امیر معاویہؓ تک، پچاس برس کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حکومت حاصل کرنے کے لیے لڑنا اور کشت وخون کرنا ہرگز ان کا مسلک نہ تھا۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ امام عالی مقام کی نگاہیں اس وقت معاشرے اور اسلامی ریاست کی روح اور اس کے مزاج اور اس کے نظام میں کسی بڑے تغیر کے آثار دیکھ رہی تھیں، جسے روکنے کی جد وجہد کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا، حتیٰ اگر اس راہ میں لڑنے کی نوبت بھی آجائے تو وہ نہ صرف اسے جائز بلکہ فرض سمجھتے تھے۔

ریاست کے مزاج، مقصد اور دستور کی تبدیلی

وہ تغیر کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ لوگوں نے اپنا دین نہیں بدل دیا تھا۔ حکمرانوں سمیت سب لوگ خدا اور رسول ﷺ اور قرآن کو اسی طرح مان رہے تھے، جس طرح پہلے مانتے تھے۔ مملکت کا قانون بھی نہیں بدلا تھا۔ عدالتوں میں قرآن اور سنت ہی کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے بنی امیہ کی حکومت میں بھی ہو رہے تھے، جس طرح ان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ بلکہ قانون میں تغیر تو انیسویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا کی مسلم حکومتوں میں سے کسی دور میں بھی نہیں ہوا۔ بعض لوگ یزید کے شخصی کردار کو بہت نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں، جس سے یہ عام غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تغیر جسے روکنے کے لئے امام کھڑے ہوئے تھے، بس یہ تھا کہ ایک برا آدمی برسر اقتدار آگیا تھا۔ لیکن یزید کی سیرت و

شخصیت کا جو برے سے برا تصور پیش کرنا ممکن ہے، سے جوں کا توں مان لینے کے بعد بھی یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کہ اگر نظام صحیح بنیادوں پر قائم ہو تو محض ایک برے آدمی کا برسرِ اقتدار آجانا کوئی ایسی بڑی بات ہوسکتی ہے، جس پر امام حسینؓ جیسا دانا و زیرک اور علم شریعت میں گہری نظر رکھنے والا شخص بے صبر ہو جائے۔ اس لیے یہ شخصی معاملہ بھی وہ اصل تغیر نہیں ہے، جس نے امام کو بے چین کیا تھا۔

تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو چیز واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر اس کی تخت نشینی سے دراصل جس خرابی کی ابتدا ہو رہی تھی، وہ اسلامی ریاست کے دستور اور اس کے مزاج اور اس کے مقصد کی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کے پورے نتائج اگرچہ اس وقت سامنے نہ آئے تھے لیکن ایک صاحب نظر آدمی گاڑی کا رخ تبدیل ہوتے ہی جان سکتا ہے کہ اب اس کا راستہ بدل رہا ہے اور جس راہ پر مڑ رہی ہے وہ آخر کار اسے کہاں لے جائے گا۔ یہی رخ کی تبدیلی جسے امام نے دیکھا اور گاڑی کو پھر سے صحیح پٹڑی پر ڈالنے کے لیے اپنی جان لڑا دینے کا فیصلہ کیا۔

نقطہ انحراف

اس چیز کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ کی سربراہی میں ریاست کا جو نظام چالیس سال تک چلتا رہا تھا، اس کے دستور کی بنیادی خصوصیات کیا تھیں اور یزید کی ولی عہدی سے مسلمانوں میں جس دوسرے نظام کا آغاز ہوا، اس کے اندر کیا خصوصیات دولت بنی امیہ و بنی عباس اور بعد کی بادشاہیوں میں ظاہر ہوئیں۔

اسی تقابل سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ یہ گاڑی پہلے کس لائن پر چل رہی تھی اور اس نقطہ انحراف پر پہنچ کر آگے وہ کس لائن پر چل پڑی، اور اسی تقابل سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور جس نے صحابہ کی بہترین سوسائٹی میں بچپن سے بڑھاپے تک کی منزلیں طے کی تھیں، وہ کیوں اس نقطہ انحراف کے سامنے آتے ہی گاڑی کو

نئی لائن پر جانے سے روکنے کے لیے کھڑا ہو گیا، اور کیوں اس نے اس بات کی بھی پروانہ کی کہ اس زور دار گاڑی کا رخ موڑنے کے لیے اس کے آگے کھڑے ہو جانے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

انسانی بادشاہی کا آغاز

اسلامی ریاست کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف زبان ہی سے یہ نہیں کہا جاتا تھا بلکہ سچے دل سے یہ مانا بھی جاتا تھا، اور عملی رویہ سے اس عقیدہ ویقین کا پورا ثبوت بھی دیا جاتا تھا کہ ملک خدا کا ہے ، باشندے خدا کی رعیت ہیں اور حکومت اس رعیت کے معاملے میں خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ حکومت اس رعیت کی مالک نہیں ہے۔ اور رعیت اس کی غلام نہیں ہے۔ حکمرانوں کا کام سب سے پہلے اپنی گردن میں خدا کی بندگی و غلامی کا قلادہ ڈالنا ہے، پھر یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ خدا کی رعیت پر اس کا قانون نافذ کریں۔ لیکن یزید کی ولی عہدی سے جس انسانی بادشاہی کا مسلمانوں میں آغاز ہوا، اس میں خدا کی بادشاہی کا تصور صرف زبانی اعتراف تک محدود رہ گیا۔ عملاً اس نے وہی نظریہ اختیار کر لیا جو ہمیشہ سے ہر انسانی بادشاہی کا رہا ہے، یعنی ملک بادشاہ اور شاہی خاندان کا ہے اور وہ رعیت کی جان، مال، آبرو، ہر چیز کا مالک ہے۔ خدا کا قانون ان بادشاہتوں میں نافذ ہوا بھی تو صرف عوام پر ہوا، بادشاہ اور ان کے خاندان اور امراء اور حکام زیادہ تر اس سے مستثنیٰ ہی رہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعطل

اسلامی ریاست کا مقصد خدا کی زمین میں نیکیوں کو قائم کرنا اور فروغ دینا تھا، جو خدا کو محبوب ہیں اور ان برائیوں کو دبانا اور مٹانا تھا جو خدا کو ناپسند ہیں۔ مگر انسانی بادشاہت کا راستہ اختیار کرنے کے بعد حکومت کا مقصد فتح ممالک اور تسخیر خلائق اور تحصیل باج و خراج اور عیش دنیا کے سوا کچھ نہ رہا۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت بادشاہوں نے کم ہی کبھی انجام دی۔

ان کے ہاتھوں اور ان کے امرا اور حکام اور درباریوں کے ہاتھوں بھلائیاں کم اور برائیاں بہت زیادہ پھیلیں۔ بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کی روک تھام اور اشاعتِ دین اور علومِ اسلامی کی تحقیق و تدوین

کے لیے جن اللہ کے بندوں نے کام کیا، انہیں حکومت سے مدد ملنی تو درکنار اکثر وہ حکمرانوں کے غضب ہی میں گرفتار رہے اور اپنا کام وہ ان کی مزاحمتوں کے علی الرغم ہی کرتے رہے۔ ان کی کوششوں کے برعکس حکومتوں اور ان کے حکام و متوسلین کی زندگیوں اور پالیسیوں کے اثرات مسلم معاشرے کو پیہم اخلاقی زوال ہی کی طرف لے جاتے رہے۔ حد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسلام کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالنے سے بھی دریغ نہ کیا، جس کی بدترین مثال بنو امیہ کی حکومت میں نو مسلموں پر جزیہ لگانے کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

اسلامی ریاست کی روح تقویٰ اور خدا ترسی اور پرہیز گاری کی روح تھی، جس کا سب سے بڑا مظہر خود ریاست کا سربراہ ہوتا تھا۔ حکومت کے عمال و قاضی اور سپہ سالار، سب اس روح سے سرشار ہوتے تھے اور پھر اس روح سے وہ پورے معاشرے کو سرشار کرتے تھے، لیکن بادشاہی کی راہ پر پڑتے ہی مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں نے قیصر و کسریٰ سے رنگ ڈھنگ اور ٹھاٹھ باٹھ اختیار کر لیے۔ عدل کی جگہ ظلم و جور کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ پرہیز گاری کی جگہ فسق و فجور اور راگ رنگ اور عیش و عشرت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ حرام و حلال کی تمیز سے حکمرانوں کی سیرت و کردار خالی ہوتی چلی گئی۔ سیاست کا رشتہ اخلاق سے ٹوٹتا چلا گیا۔ خدا سے خود ڈرنے کے بجائے حاکم لوگ بندگانِ خدا کو اپنے آپ سے ڈرانے لگے اور لوگوں کے ایمان و ضمیر بیدار کرنے کے بجائے ان کو اپنی بخششوں کے لالچ سے خریدنے لگے۔

اسلامی دستور کے بنیادی اصول

یہ تو تھا روح و مزاج اور مقصد اور نظریے کا تغیر۔ ایسا ہی تغیر اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں میں بھی رونما ہوا۔ اس دستور کے سات اہم ترین اصول تھے، جن میں سے ہر ایک کو بدل ڈالا گیا۔

ا۔ آزادانہ انتخاب

دستور اسلامی کا سنگِ بنیاد یہ تھا کہ حکومت لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہو۔ کوئی شخص اپنی کوشش سے اقتدار حاصل نہ کرے بلکہ لوگ اپنے مشورے سے بہتر آدمی کو چن کر اقتدار اس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہ ہو بلکہ اس کا سبب ہو۔ بیعت حاصل ہونے میں آدمی کی اپنی کسی کوشش یا سازش کا دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں پوری طرح آزاد ہوں۔ جب تک کسی شخص کو بیعت حاصل نہ ہو وہ برسرِ اقتدار نہ آئے اور جب لوگوں کا اعتماد اس پر سے اٹھ جائے تو وہ اقتدار سے چمٹا نہ رہے۔ خلفائے راشدینؓ میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا۔

امیر معاویہؓ کے معاملے میں پوزیشن مشتبہ ہوگئی۔ اسی لیے صحابی کے باوجود ان کا شمار خلفائے راشدینؓ میں نہیں کیا گیا۔ لیکن آخر کار یزید کی ولی عہدی وہ انقلابی کارروائی ثابت ہوئی جس نے اس قاعدے کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس سے خاندانوں کی موروثی بادشاہتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا، جس کے بعد سے آج تک پھر مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنا نصیب نہ ہوسکا۔ اب لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسرِ اقتدار آنے لگے۔

اب بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل کی جانے لگی۔ اب بیعت کرنے یا نہ کرنے میں لوگ آزاد نہ رہے اور بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قائم رہنے کے لیے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اول تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار تھا، اس کی بیعت نہ کرتے۔ لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا تھا، وہ ہٹنے والا نہ تھا۔ اسی جبری بیعت کو کالعدم قرار دینے کا قصور جب منصور عباسی کے زمانہ میں امام مالکؒ سے سرزد ہوا تو ان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے اور ان کے ہاتھ شانوں سے اکھڑوا دیے گئے۔

۲۔ شورائی نظام

دوسرا اہم ترین قاعدہ اس دستور کا یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ ان بزرگوں سے کیا جائے جن کے علم، تقویٰ اور اصابتِ رائے پر عام لوگوں کو اعتماد ہو۔ خلفائے راشدینؓ کے عہد میں

جو لوگ شوریٰ کے رکن بنائے گئے، اگرچہ ان کو انتخاب عام کے ذریعہ سے منتخب نہیں کرایا گیا تھا۔ جدید زمانے کے تصور کے لحاظ سے وہ نامزد کردہ لوگ ہی تھے۔

لیکن خلفاءؓ نے یہ دیکھ کر ان کو مشیر نہیں بنایا تھا کہ یہ ہماری ہاں میں ہاں ملانے اور ہمارے مفاد کی خدمت کرنے کے لیے موزوں ترین لوگ ہیں۔ بلکہ انہوں نے پورے خلوص اور بے غرضی کے ساتھ قوم کے بہترین عناصر کو چنا تھا، جن سے وہ حق گوئی کے سوا کسی چیز کی توقع نہ رکھتے تھے، جن سے یہ امید تھی کہ وہ ہر معاملے میں اپنے علم و ضمیر کے مطابق بالکل صحیح ایماندارانہ رائے دیں گے، جن سے کوئی شخص بھی یہ اندیشہ نہ رکھتا تھا کہ وہ حکومت کی کسی غلط راہ پر جانے دیں گے۔ اگر اس وقت ملک میں آج کل کے طریقے کے مطابق انتخابات بھی ہوتے تو عام مسلمان انہی لوگوں کو اپنے اعتماد کا مستحق قرار دیتے۔

لیکن شاہی دور کا آغاز ہوتے ہی شوریٰ کا یہ طریقہ بدل گیا۔ اب بادشاہ استبداد اور مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرنے لگے۔ اب شاہزادے اور خوشامدی اہل دربار، اور صوبوں کے گورنر اور فوجوں کے سپہ سالار ان کی کونسل کے ممبر تھے۔ اب وہ لوگ ان کے مشیر تھے، جن کے معاملہ میں اگر قوم کی رائے لی جاتی تو اعتماد کے ایک ووٹ کے مقابلہ میں لعنت کے ہزار ووٹ آتے اور اس کے برعکس وہ حق شناس و حق گو اہل علم و تقوی جن پر قوم کو اعتماد تھا، وہ بادشاہوں کی نگاہ میں کسی اعتماد کے مستحق نہ تھے، بلکہ الٹے معتوب یا کم از کم مشتبہ تھے۔

۳۔ اظہار رائے کی آزادی

اس دستور کا تیسرا اصول یہ تھا کہ لوگوں کو اظہار رائے کی پوری آزادی ہو۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اسلام نے ہر مسلمان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا۔ اسلامی معاشرے اور ریاست کے صحیح راستہ پر چلنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ لوگوں کے ضمیر اور ان کی زبانیں آزاد ہوں، وہ ہر غلط کام پر بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔ خلافت راشدہ میں صرف یہی نہیں کہ لوگوں کا یہ حق پوری طرح محفوظ تھا بلکہ خلفائے راشدینؓ اسے ان کا فرض سمجھتے تھے اور اس فرض کے ادا کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کی مجلس شوری کے ممبروں ہی کو نہیں، قوم کے ہر شخص کو بولنے

اور ٹوکنے اور خود خلیفہ سے باز پرس کرنے کی مکمل آزادی تھی، جس کے استعمال پر لوگ ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں بلکہ داد اور تعریف سے نوازے جاتے تھے۔

یہ آزادی ان کی طرف سے کوئی عطیہ اور بخشش نہ تھی جس کے لیے وہ قوم پر اپنا احسان جتاتے، بلکہ یہ اسلام کا وہ عطا کردہ ایک دستوری حق تھا، جس کا احترام کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، اور اسے بھلائی کے لیے استعمال کرنا ہر مسلمان پر خدا اور رسول ﷺ کا عائد کردہ ایک فریضہ تھا جس کی ادائیگی کے لیے معاشرے اور ریاست کی فضا کو ہر وقت سازگار رکھنا ان کی نگاہ میں فرائض خلافت کا ایک اہم جز تھا۔ لیکن بادشاہی دور کا آغاز ہوتے ہی ضمیروں پر قفل چڑھا دیے گئے اور منہ بند کر دیے گئے۔ اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ زبان کھولو تو تعریف میں کھولو، ورنہ چپ رہو۔ اور اگر تمہارا ضمیر ایسا زور آور ہے کہ حق گوئی سے تم باز نہیں رہ سکتے تو قید یا قتل کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یہ پالیسی رفتہ رفتہ مسلمانوں کو پست ہمت، بزدل اور مصلحت پرست بناتی چلی گئی۔ خطرہ مول لے کر سچی بات کہنے والے ان کے اندر کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ خوشامد اور چاپلوسی کی قیمت مارکیٹ میں چڑھتی اور حق پرستی و راست بازی کی قیمت گرتی چلی گئی۔ اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ایماندار اور آزاد خیال لوگ حکومت سے بے تعلق ہو گئے اور عوام کا حال یہ ہو گیا کہ کسی شاہی خاندان کی حکومت برقرار رکھنے کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔ ایک کو ہٹانے کے لیے جب دوسرا آیا تو انہوں نے مدافعت میں انگلی تک نہ ہلائی اور گرنے والا جب گرا تو انہوں نے ایک لات اور رسید کر کے اسے زیادہ گہرے گڑھے میں پھینکا۔ حکومتیں جاتی اور آتی رہیں، مگر لوگوں نے تماشائی سے بڑھ کر اس آمدورفت کے منظر سے کوئی دلچسپی نہ لی۔

۴۔ خدا اور خلق کے سامنے جواب دہی

چوتھا اصول، جو اس تیسرے اصول کے ساتھ لازمی تعلق رکھتا تھا، یہ تھا کہ خلیفہ اور اس کی حکومت خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ جہاں تک خدا کے سامنے جواب دہی کا تعلق ہے، اس کے شدید احساس سے خلفائے راشدین پر دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو گیا تھا اور جہاں تک خلق کے

سامنے جواب دہی کا تعلق ہے، وہ ہر وقت، ہر جگہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔ ان کی حکومت کا یہ اصول نہ تھا کہ صرف مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) میں نوٹس دے کر ہی ان سے سوال کیا جا سکتا ہے، وہ ہر روز پانچ مرتبہ نماز کی جماعت میں اپنے آپکو عوام کے سامنا کرتے تھے۔ وہ ہر ہفتے جمعہ کی جماعت میں عوام کے سامنے اپنی کہتے اور ان کی سنتے تھے۔ وہ شب و روز بازاروں میں کسی باڈی گارڈ کے بغیر، کسی ہٹو بچو کی آواز کی بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔

ان کے گورنمنٹ ہاؤس (یعنی ان کے کچے مکان) کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا تھا اور ہر ایک ان سے مل سکتا تھا۔ ان سب مواقع پر ہر شخص ان سے سوال کر سکتا تھا اور جواب طلب کر سکتا تھا۔ یہ محدود جواب دہی نہ تھی بلکہ کھلی اور ہمہ وقتی جواب دہی تھی۔ یہ نمائندوں کے واسطہ سے نہ تھی بلکہ پوری قوم کے سامنے براہِ راست تھی۔ وہ عوام کی مرضی سے برسرِ اقتدار آئے تھے اور عوام کی مرضی انہیں ہٹا کر دوسرا خلیفہ ہر وقت لا سکتی تھی۔ اس لیے نہ تو انہیں عوام کا سامنا کرنے میں کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا اور نہ اقتدار سے محروم ہونا ان کی نگاہ میں کوئی خطرہ تھا کہ وہ اس سے بچنے کی کبھی فکر کرتے۔ لیکن بادشاہی دور کے آتے ہی جواب دہ حکومت کا تصور ختم ہو گیا۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا خیال چاہے زبانوں پر رہ گیا، مگر عمل میں اس کے آثار کم ہی نظر آتے ہیں۔ رہی خلق کے سامنے جواب دہی، تو کون مائی کا لال تھا جو ان سے جواب طلب کر سکتا۔ وہ اپنی قوم کے فاتح تھے۔ مفتوحوں کے سامنے کون فاتح جواب دہ ہوتا ہے۔

وہ طاقت سے برسرِ اقتدار آئے تھے اور ان کا نعرہ یہ تھا کہ جس میں طاقت ہو وہ ہم سے اقتدار چھین لے۔ ایسے لوگ عوام کا سامنا کب کیا کرتے ہیں اور عوام ان کے قریب کہاں پھٹک سکتے تھے۔ وہ نماز بھی پڑھتے تھے تو نتھو خیرے کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے محلوں کی محفوظ مسجدوں میں، یا باہر اپنے نہایت قابل اعتماد محافظوں کے جھرمٹ میں۔ ان کی سواریاں نکلتی تھیں تو آگے اور پیچھے مسلح دستے ہوتے تھے اور راستے صاف کر دیے جاتے تھے۔ عوام کی اور ان کی مڈبھیڑ کسی جگہ ہوتی ہی نہ تھی۔

۵۔ بیت المال۔ ایک امانت

پانچواں اصول اسلامی دستور کا یہ تھا کہ یہ بیت المال خدا کا مال اور مسلمانوں کی امانت ہے، جس میں کوئی چیز حق کی راہ کے سوا کسی دوسری راہ سے آنی نہ چاہیے اور جس میں سے کوئی چیز حق کے سوا کسی دوسری راہ میں جانی نہ چاہیے۔ خلیفہ کا حق اس مال میں اتنا ہی ہے جتنا قرآن کی رو سے مال یتیم میں اس کی ولی کا ہوتا ہے کہ من کان غنیا فلیستعفف و من کان فقیرا فلیا کل بالمعروف (جو اپنے ذاتی ذرائع آمدنی اپنی ضرورت بھر رکھتا ہو، وہ اس مال سے تنخواہ لیتے ہوئے شرم کرے اور جو واقعی حاجت مند ہو وہ اتنی تنخواہ لے جسے ہر معقول آدمی مبنی بر انصاف مانے) خلیفہ اس کی ایک ایک پائی کے آمد و خرچ پر حساب دینے کا ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کو اس سے حساب مانگنے کا پورا حق ہے۔ خلفائے راشدینؓ نے اس اصول کو بھی کمال درجہ دیانت اور حق شناسی کے ساتھ برت کر دکھایا۔ ان کے خزانے میں جو کچھ آتا تھا، ٹھیک ٹھیک اسلامی قانون کے مطابق آتا تھا اور اس میں سے جو کچھ خرچ ہوتا تھا، بالکل جائز راستوں میں ہوتا تھا۔

ان میں سے جو غنی تھا، اس نے ایک حبہ اپنی ذات کے لیے تنخواہ کے طور پر وصول کیے بغیر مفت خدمت انجام دی، بلکہ اپنی گرہ سے قوم کے لیے خرچ کرنے میں بھی دریغ نہ کیا اور جو تنخواہ کے بغیر ہمہ وقتی خدمت گار نہ بن سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے اتنی کم تنخواہ لی کہ ہر معقول آدمی اسے انصاف سے کم ہی مانے گا، زیادہ کہنے کی جرات ان کا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔

پھر اس خزانے کی آمد و خرچ کا حساب ہر وقت ہر شخص مانگ سکتا تھا اور وہ ہر وقت ہر شخص کے سامنے حساب دینے کے لیے تیار تھے۔ ان سے ایک عام آدمی بھرے مجمع میں پوچھ سکتا تھا کہ خزانے میں یمن سے جو چادریں آئی ہیں، ان کا طول و عرض تو اتنا نہ تھا کہ جناب کا یہ لمبا کرتا بن سکے، یہ زائد کپڑا آپ کہاں سے لائے ہیں؟ مگر جب خلافت بادشاہی میں تبدیل ہوئی تو خزانہ خدا اور مسلمانوں کا نہیں بلکہ بادشاہ کا مال تھا، ہر جائز و ناجائز راستے سے اس میں دولت آتی تھی اور ہر جائز و ناجائز راستے میں بے غل و غش صرف ہوتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے حساب کا سوال اٹھا سکے۔

سارا ملک ایک خوان یغما تھا جس پر ایک ہرکارے سے لے کر سربراہِ مملکت ہے، حکومت کے سارے کل پرزے حسب توفیق ہاتھ مار رہے تھے اور ذہنوں سے یہ تصور ہی نکل گیا تھا کہ اقتدار کوئی پروانہ اباحت

نہیں ہے جس کی بدولت یہ لوٹ مار ان کے لیے حلال ہو اور پبلک کا مال کوئی شیر مادر نہیں ہے، جسے ہضم کرتے رہیں اور کسی کے سامنے انہیں اس کا حساب دینا نہ ہو۔

۶۔ قانون کی حکومت

چھٹا اصول اس دستور کا یہ تھا کہ ملک میں قانون (یعنی خدا اور رسول ﷺ کے قانون) کی حکومت ہونی چاہیے۔ کسی کو قانون سے بالاتر نہ ہونا چاہیے۔ کسی کو قانون کے حدود سے باہر جا کر کام کرنے کا حق نہ ہونا چاہیے۔ ایک عام آدمی سے لے کر سربراہِ مملکت تک سب کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے اور سب پر اسے بے لاگ طریقے سے نافذ ہونا چاہیے۔ انصاف کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ ہونا چاہیے اور عدالتوں کو انصاف کرنے کے لیے ہر دباؤ سے بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ خلفائے راشدینؓ نے اس اصول کی پیروی کا بھی بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔

بادشاہوں سے بڑھ کر اقتدار رکھنے کے باوجود وہ قانون الٰہی کی بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے، نہ ان کی دوستی اور رشتہ داری قانون کی حد سے نکل کر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکتی تھی، اور نہ ان کی ناراضگی کسی کو قانون کے خلاف کوئی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ کوئی ان کے اپنے حق پر بھی دست درازی کرتا تو وہ ایک عام آدمی کی طرح عدالت میں کھینچ لا سکتا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے حکومت کے گورنروں اور سپہ سالاروں کو بھی قانون کی گرفت میں کس رکھا تھا، کسی کی مجال نہ تھی کہ عدالت کے کام میں کسی قاضی پر اثر انداز ہونے کا خیال بھی کرتا۔ کسی کا یہ مرتبہ نہ تھا کہ قانون کی حد سے قدم باہر نکال کر مواخذہ سے بچ جاتا۔ لیکن خلافت سے بادشاہی کی طرف انتقال واقع ہوتے ہی اس قاعدے کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔

اب بادشاہ اور شاہزادے اور امراء اور حکام اور سپہ سالار ہی نہیں، شاہی محلات کے منہ چڑھے لونڈی غلام تک قانون سے بالاتر ہو گئے۔ لوگوں کی گردنیں اور پیٹھیں اور مال اور آبروئیں، سب ان کے لیے مباح ہو گئیں۔ انصاف کے دو معیار بن گئے۔ ایک کمزور کے لیے اور دوسرا طاقت ور کے لیے۔ مقدمات میں عدالتوں پر دباؤ ڈالے جانے لگے اور بے لاگ انصاف کرنے والے قاضیوں کی شامت آنے لگی۔ حتیٰ

کہ خدا ترس فقہانے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے کوڑے کھانا اور قید ہو جانا زیادہ قابلِ ترجیح سمجھا تا کہ وہ ظلم وجور کے آلہ کار بن کر خدا کے عذاب کے مستحق نہ بنیں۔

۷۔ حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات

مسلمانوں میں حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات، اسلامی دستور کا ساتواں اصول تھا جسے ابتدائی اسلامی ریاست میں پوری قوت کے ساتھ قائم کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان نسل، وطن، زبان وغیرہ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ قبیلے اور خاندان اور حسب ونسب کے لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ تھی۔ خدا اور رسول ﷺ کے ماننے والے سب لوگوں کے حقوق یکساں تھے اور سب کی حیثیت برابر تھی۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح اگر تھی تو سیرت واخلاق اور اہلیت وصلاحیت، اور خدمات کے لحاظ سے تھی۔

لیکن خلافت کی جگہ جب بادشاہی نظام آیا تو عصبیت کے شیاطین ہر گوشے سے سر اٹھانے لگے۔ شاہی خاندان اور ان کے حامی خانوادوں کا مرتبہ سب سے بلند وبرتر ہو گیا۔ ان کے قبیلوں کو دوسرے قبیلوں پر ترجیحی حقوق حاصل ہو گئے۔ عربی اور عجمی کے تعصبات جاگ اٹھے اور خود عربوں میں قبیلے اور قبیلے کے درمیان کش مکش پیدا ہو گئی۔ ملتِ اسلامی کو اس چیز نے جو نقصان پہنچایا اس پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

امام حسینؓ کا مومنانہ کردار

یہ تھے وہ تغیرات جو اسلامی خلافت کو خاندانی بادشاہت میں تبدیل کرنے سے رونما ہوئے۔ کوئی شخص اس تاریخی حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ یزید کی ولی عہدی ان تغیرات کا نقطہ آغاز تھی اور اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اس نقطے سے چل کر تھوڑی مدت کے اندر ہی بادشاہی نظام میں وہ سب خرابیاں نمایاں ہو گئیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ انقلابی قدم اٹھایا گیا تھا اس وقت یہ خرابیاں اگرچہ بتمام وکمال سامنے نہ آئی تھیں، مگر ہر صاحبِ بصیرت آدمی جان سکتا تھا کہ اس اقدام کے لازمی نتائج یہی کچھ ہیں اور اس سے ان اصلاحات پر پانی پھر جانے والا ہے جو اسلام نے سیاست وریاست کے نظام میں کی ہیں۔ اسی لیے امام حسینؓ اس پر صبر نہ کر سکے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ جو بدتر سے بدتر نتائج بھی انہیں

ایک مضبوط جمی جمائی حکومت کے خلاف اٹھنے میں بھگتنے پڑیں، ان کا خطرہ مول لے کر بھی انہیں اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کوشش کا جو انجام ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔

مگر امامؓ نے اس عظیم خطرے میں کود کر اور مردانہ وار اس کے نتائج کو انگیز کر کے جو بات ثابت کی وہ یہ تھی کہ اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات امت مسلمہ کا وہ بیش قیمت سرمایہ ہیں، جسے بچانے کے لیے ایک مومن اپنا سر بھی دے دے اور اپنے بال بچوں کو بھی کٹوا بیٹھے تو اس مقصد کے مقابلے میں یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے اور ان خصوصیات کے مقابلے میں وہ دوسرے تغیرات جنہیں اوپر نمبر وار گنایا گیا ہے ، دین اور ملت کے لیے وہ آفت عظمیٰ ہیں جسے روکنے کے لیے ایک مومن کو اگر اپنا سب کچھ قربان کر دینا پڑے تو اس میں دریغ نہ کرنا چاہیے۔ کسی کا جی چاہے تو اسے حقارت کے ساتھ ایک سیاسی کام کہہ لے مگر حسینؓ ابن علیؓ کی نگاہ میں تو یہ سراسر ایک دینی کام تھا، اسی لیے انہوں نے اس کام میں جان دینے کو شہادت سمجھ کر جان دی۔

از قلم: سید محسن حسینی کشمیری

امام باڑہ جڈیبل (سرینگر) تاریخ کے جھروکوں سے

ادھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ۲۸ صفر المظفر کو اپنی آنکھیں بند کرلیں تو اُدھر زنجیروں کی جھنکاریں ، تلواروں کی ضربتیں، زہر کا مزہ، آگ کے شعلے، زندان کی تاریکیاں، پھانسی کے پندھے، اہل بیت محمد علیہم السلام اور ان کے شیعوں کی قسمت شجرہ خبیثہ کے قلم سے شجرہ طیبہ کے صفحوں پر خون سے تحریر کی گئی۔ آج پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کو ۱۴۲۲ سال گذر چکے ہیں۔

لیکن جو آگ ۱۱ھ میں ہمارے گھر کو مدینہ میں لگی وہ آج تک ٹھنڈی نہ ہو سکی اور تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے تب سے لے کر اب تک گردنیں تو کٹوائیں مگر ظالم کے سامنے جھکنے نہیں دیں۔ آج بھی پوری دنیا دیکھ رہی ہے کہ ہم گردنوں کو جھکانے کے عادی نہیں بلکہ کٹوانے کے عادی ہیں۔ کیونکہ ہمارے وجود کو آب زمزم سے غسل دیا گیا ہے اور کوثر ہماری میراث ہے۔ جسے چاہیے کتنا ہی دشمن مٹانے کی کوشش کرے لیکن خدائی وعدہ ہے کہ مٹ نہیں سکتی!

بہر حال جس امام باڑے کی تاریخ سپرد قلم کرنے جارہا ہوں یہ مرکزی امام باڑہ جڈیبل میں واقعہ ہے اور خود جڈیبل سری نگر کے قلب میں واقعہ ہے۔ ابتداء سے سری نگر کشمیر کا مرکز رہا ہے اور اور پوری دنیا میں اسے خاصی شہرت حاصل ہے۔ کشمیر میں مذہب اہل بیت علیہم السلام کا بیج سادات نے بویا تھا اور اپنے خون سے اس کی آبیاری کی تھی۔ پھر کشمیر کے کونے کونے میں پھول کھلنے لگے اور ہر طرف سے خوشبوے آل محمد علیہم السلام پھیلتی گئی۔

جن علاقوں میں شیعہ رہائش پذیر ہیں۔ ان میں سے ایک جگہ یہی جڈیبل ہے جہاں قدیم الایام سے شیعہ آباد تھے چنانچہ شہید ثالث قاضی نور اللہ شوشتریؒ (۱۰۱۹ہجری) لکھتے ہیں:

مجھے کشمیر کے حالات کہیں سے معلوم نہیں ہوئے بلکہ خود دیکھ کر آیا ہوں وہاں شیعہ آباد ہیں اور پھر ان جگہوں کے نام گناتے ہوئے جڈیبل کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱] جیسا کہ علامہ سید محسن امین عاملیؒ نے بھی "اعیان الشیعہ" میں ان سے نقل کیا ہے۔[۲]

جڈیبل میں بڑے بڑے علماء، صلحاء، تجار، خطاط، اطباء، نقاش وغیرہ نے جنم لیا ہے اور جو معروف خاندان یہاں پہلے سے آباد ہیں ان میں سادات رضوی جو موسی مبرقعؑ کی نسل سے ہیں، سادات موسوی جو میر عراقیؒ کی نسل سے ہیں، خاندان ملک جو ملک حیدر چاڈورہ کی نسل سے ہیں۔ بحرین کا علم پرور خاندان کہ جن کے جد اعلی ملا محمد رضا بحرین سے ہجرت کر کے یہاں پر ساکن ہوگئے اور سادات جلالی جو میرزا سید حسین سبزواری کی نسل سے ہیں اور مختاری اور اعرجی بھی کہلاتے ہیں پہلے سے ہی مجالس عزا اور جلوس ذوالجناح کا انتظام سادات جلالی کے ہاتھوں میں تھا۔ بالخصوص نواب آغا سید حسین شاہ جلالی مرحوم کی خدمات اس سلسلے میں قابل قدر ہیں۔

جس امام باڑے کی بات ہو رہی ہے یہ کشمیر میں شیعوں کا سب سے قدیم امام باڑہ ہے جسے سلطان محمد شاہ کے وزیر کاجی چک نے ۹۲۴ھ (۱۵۱۸م) سے ۹۳۴ھ (۱۵۲۷م) تک کے درمیانی سالوں میں بنوایا تھا۔[۳]

علامہ شہید سید عبد الغنی موسوی (۹۳۲ھ) اور ان کے دو عالم فاضل فرزندان شہید سید حسن موسوی (م ۹۵۷ھ)، شہید سید حسین موسوی (م ۹۵۷ھ) اور میر یعقوب اصفہانی نے اس امام باڑے کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔[۴] بقول حکیم صفدر ہمدانی ڈوگرہ حکومت کے ابتدائی دور تک یہ شیعوں کا واحد امام باڑہ رہا ہے۔[۵] اس امام باڑے کی داستان بہت ہی دردناک ہے اور تاریخ نے اپنے سینے میں اسے حفظ کیا

۱۔ مجالس المومنین، ج۱، ص۵۱۔۵۲۔

۲۔ اعیان الشیعہ، ج۱، ص۲۰۷۔

۳۔ شیعیان کشمیر، ص۲۲۷۔

۴۔ دانشنامہ شیعیان کشمیر، ج۱، ص۹۶۔

۵۔ شیعیان کشمیر، ص۲۲۷۔

ہے۔ دس دفعہ اس کو نذر آتش کیا گیا اور اس کے گرد نواح میں جتنے بھی شیعہ آباد تھے ان کے گھروں کو تاراج کر کے جلایا گیا۔

ان کے ناموس کی بے حرمتی کی گئی اور بڑے بڑے علماء و افاضل شیعہ کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ اس پر آشوب زمانے میں خدا جانے ہمارے کتنے ہی کتابخانے آگ کی نذر اور کتنے ہی شہ پارے ضایع ہوئے ہوں گے۔

غالب رکھیو مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

ہم یہاں سالہائے تاراج کو مد نظر رکھ کر سنوات کے لحاظ سے تمام تاراجوں کا ذکر یکے بعد دیگرے کریں گے:

تاراج اول (۹۵۵ھ بمطابق ۱۵۴۸ء)

پہلی دفعہ مرزا حیدر کاشغری نے جلایا[۱] مرزا حیدر بہت متعصب اور دشمن اہل بیت علیہم السلام تھا۔ اسے حضرت علی علیہ السلام سے بغض تھا اور شیعیان علی علیہ السلام سے کینہ اور عناد رکھتا تھا۔[۲] چنانچہ اس نے حاجی بانڈے اور دوسرے امرائے کشمیر کی مدد سے ۹۵۵ھ میں شیعہ مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دیا۔[۳] اسی سال اس نے میر عراقی کی خانقاہ اور امام باڑے کو بھی نذر آتش کیا اور شیعوں کے قتل عام کے بعد بزرگان دین کو بھی موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پھر دولت چک نے امام باڑے کو از سر نو ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں تعمیر کیا۔[۴]

تاراج دوم (۹۹۴ھ بمطابق ۱۵۸۵ء)

۱۔ ہمان۔

۲۔ تحفۃ الاحباب، ص ۵۵۔۹۰۔

۳۔ مقدمہ، بہارستان شاہی، ص ۱۲۱۔

۴۔ شیعیان کشمیر، ص ۲۲۷۔

دوسری بارے شمس چک کپواری کے بیٹے ظفر چک کپواری نے مذہبی تعصب کی بنا پر پھر سے جلا دیا اور دوبارہ تعمیر ہوا۔[1]

تاراج سوم (۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء)

تیسری دفعہ شاہجہان کے عہد حکومت میں دشمنان آل محمد علیہم السلام نے اسے پھر سے جلایا۔ اس وقت کشمیر میں ظفر خان صوبیدار تھا۔ اس سال سرینگر کے لوگ ایک دن مایسمہ توت کھانے کے لیے گئے تھے۔ اسی اثناء میں کوئی شخص پیڑے سے نیچے گر گیا اور لڑائی شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ نوبت شیعہ سنی فساد پر پہنچی۔ چونکہ شیعہ کم تھے اسے لیے انہیں زد کوب کیا گیا اور پھر توہین مذہب کا الزام لگا کر قاضی سے ان کے قتل کا حکم جاری کرایا گیا اگرچہ ظفر خان نے قاضی کے حکم کی تعمیل کرنے میں تاخیر کی کیونکہ وہ جانتا تھا یہ سب بے بنیاد ہے۔ لیکن شر پسندوں کو آرام کہاں انہوں نے شیعوں کا قتل عام شروع کیا اور ان کے مکانات کو آگ لگائی اور حکومت فقط دیکھتی رہی۔

اس سے بھی انہیں تسلی نہیں ہوئی انہوں نے ایک کٹر مذہبی رہنما خواجہ خاوند محمود نقشبندی کی طرف رجوع کیا۔ اس نے اپنے ساتھ دیگر افراد کو ملا لیا اور ہجرت کی دھمکی دے کر چنار باغ چلا گیا۔ اس سے فساد کا اندیشہ پیدا ہوا اور ظفر خان بھی ڈر گیا۔ اس نے ناحق ان لوگوں کا خون بہایا جن پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا تھا۔[2]

تاراج چہارم (۱۰۹۶ھ بمطابق ۱۶۸۲ء)

چوتھی دفعہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جلایا گیا۔ اس وقت کشمیر کا صوبیدار ابراہیم خان تھا۔ اس دوران ایک فرقہ وارانہ فساد ہوا پھر سے بیچارے شیعوں پر توہین مذہب کی تہمت لگائی گئی۔ قاضی یوسف نے بغیر تحقیق کے ان کے قتل کے حکم جاری کئے۔ یہ لوگ صوبیدار کے پاس پناہ گزین ہوئے کیونکہ وہ خود بھی شیعہ تھا۔ قاضی یوسف نے عوام کو مشتعل کر کے فتنہ برپا کیا اور ان تباہ کاروں نے محلہ

۱۔ شیعیان کشمیر، ص ۲۲۷۔

۲۔ تاریخ حسن، ج ۱، ص ۴۸۳۔

حسن آباد کے شیعوں کو لوٹا اور مکانات جلادئے۔ اس کی اطلاع جب صوبیدار کو ملی تو اس نے اپنے بیٹے فدائی خان کو کچھ سپاہی ساتھ دے کر مومنان حسن آباد کی مدد کے لیے بھیجا۔ [1] ابراہیم خان کے اس اقدام پر سنی فوجی سردار برہم ہوئے اور فرید خان، الف خان اور مرزا مقیم اور دیگر خوانین کابل اپنے سپاہیوں کے ساتھ خواجہ شریف دہ بیدی، خواجہ محمد صابر مرزا سلیم، مرزا حلیم اور دیگر سنی سرداروں کے ساتھ شامل ہوگئے اور شہر کے سنی مسلمانوں کے ساتھ فدائی خان کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے۔ [2]

انہوں نے شیعوں کا خون بہایا اور ان کے مکانات نذر آتش کئے۔ اس جماعت کا سردار ایک لیٹرا خواجہ حاجی بانڈے تھا۔ اس جماعت کا نعرہ یہ تھا:

بلہ کر حاجو بلۂ چھوی نور
گٹنی ذالون کمانگر پور

یعنی حاجی جلدی کر پہلے کمانگر پورہ (یہاں بھی شیعہ آباد ہیں) کو جلائیں گے جو ہمارے نزدیک ہی ہے اور پھر جڈ بیل کی نوبت ہے۔ ملا محمد طاہر مفتی اعظم ابراہیم خان اور قاضی یوسف کے درمیان صلح کرنا چاہتا تھا۔ اس کا پتہ بعض غنڈوں کو لگا اور انہوں نے مفتی پر یہ تہمت لگائی کہ وہ صوبیدار کی طرفداری کر رہا ہے اس وجہ سے انہوں نے اس کے مکان کو بھی نذر آتش کر دیا۔ اس فساد میں شیعوں کے عالم و فاضل شیخ قاسم جسے مورخ حسن نے مقتدای شیعہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اسے راہ چلتے پکڑ کر اور اس قدر مارا گیا کہ راستہ پر ہی جام شہادت نوش کیا۔ [3]

تاراج پنجم (۱۱۳۲ھ بمطابق ۱۷۱۹ء)

پانچویں دفعہ محتوی خان کے فتنہ میں جلایا گیا۔ اس سال بھی اس غنڈہ جماعت نے جڈ بیل پر حملہ کر دیا۔ اس محلہ کے شیعوں نے بھی مورچے لگائے اور شام سے سحر تک لڑائی ہوئی۔ شیعہ اگرچہ تعداد میں کم

---

[1] ۔ تاریخ حسن، ج ۱، ص ۴۸۳۔

[2] ۔ تاریخ حسن، ج ۱، ص ۴۸۳۔

[3] تاریخ حسن، ج ۱، ص ۴۸۴؛ تاریخ خلیل وجان پوری، ص ۱۹۳؛ گوہر عالم، ص ۲۹۴-۲۹۱۔

تھے لیکن وہ لڑتے رہے اور انہوں نے حملہ کرنے والوں کو پیچھے دھکیل دیا اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ [1] اس شکست کی اطلاع جب خواجہ محمد آفتاب اور خواجہ بادشاہ کو ہوئی جو اس وقت سلسلہ نقشبندی کے معزز اراکین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا اثر و رسوخ حکومت اور عوام دونوں پر تھا۔ انہوں نے بعض سپاہیوں کو حملہ آوروں کی مدد کے لیے بھیجا۔ اس سے وہ اور زیادہ طاقت ور ہو گئے اور انہوں نے ہر طرف سے حملہ شروع کر دیا۔ شیعہ تعداد میں کم تھے اور انہیں کہیں سے مدد کی امید بھی نہ تھی کیونکہ دیگر علاقوں کے شیعہ بھی خود مصیبت میں مبتلا تھے۔

شیعہ لڑتے رہے اور جب ان کے کافی افراد شہید ہو گئے تو یہ تباہ کار جماعت جڈ بیل میں داخل ہو گئی۔ بوڑھے بچے اور عورتوں تک کو نہ بخشا نہ گیا۔ معصوم بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ کچھ بچے اور عورتیں خانقاہ میر عراقی میں داخل ہو گئیں اور اندر سے خانقاہ کا دروازہ بند کر دیا۔ ان بے رحم ظالموں نے خانقاہ کو آگ لگا دی اور یہ بچے اور عورتیں زندہ جل کر راکھ ہو گئے۔

اسی طرح حسن آباد اور دیگر علاقوں کا تاراج کیا گیا۔ لوٹ کھسوٹ کا یہ سلسلہ ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) تک جاری رہا۔ [2] اسی سال ملا عبد الحکیم کو بھی شہید کیا گیا ہے جو جملہ علوم میں ماہر تھے۔ سید ابو القاسم رضوی نے انہیں ان الفاظ سے یاد کیا۔ ہادی طریقت حافظ شریعت مکمل الحلیۃ حضرت ملا عبد الحکیم الشہید یہ روز جمعرات ۲۳، ذیقعدہ ۱۱۳۲ھ تھا۔ [3]

تاراج ششم (۱۱۵۸ھ بمطابق ۱۷۴۵ء)

اس سال ابو البرکات خان کشمیر کا صوبیدار تھا۔ اس نے ببر اللہ خان کے ساتھ جنگ کی جو ۱۱۵۸ھ سری نگر پر حملہ آور ہوا۔ ابو البرکات نے اسے شکست دے دی اور وہ کامراج کی طرف بھاگ گیا۔ بجائے اس کے ابو البرکات اس کا تعاقب کرتا اس مجرم نے شیعوں کو تاخت و تاراج کرنے کی کھلی اجازت دی اور بیچارے

۱۔ گوہر عالم، ص ۳۲۴۔۳۲۳۔

۲۔ تاریخ خلیل مرجان پوری، ص ۳۲۴؛ گوہر عالم، ۳۲۴۔۳۲۳۔

۳۔ دانشنامہ شیعیان کشمیر، ج ۱، ص ۱۵۸۔

محبان آل محمد علیہم السلام پر اس سال وہ قیامت ڈھائی گئی کہ وہ محتوی خان کا فساد بھول گئے ہزاروں گھر نذر آتش کئے گئے اور جو شیعہ ہاتھ آیا اسے قتل کیا گیا۔ اس قتل و غارتگری کی تاریخ "عام التشویش" ہے۔[۱]

تارج ہفتم (۱۱۷۵ھ بمطابق ۱۷۶۳ء)

بلند خان بامزی کے عہد میں ساتویں بار اس امام باڑے کو جلایا گیا۔ ایک دن سری نگر کے سنی مسلمان عیدہ گاہ نماز استقاء ادا کرنے کے لیے گئے تھے۔ جب نماز تمام ہو گئی تو نو شہر محلہ کے شر پسند عناصر نے یہ افواہ اڑائی کہ جڈ بیل کے شیعوں نے خواجہ حبیب اللہ نوشہری کے حق میں بے ادبی کی۔ بس بہانہ ملنا تھا کہ یہ غنڈگی جماعت شیعوں پر ٹوٹ پڑی قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا ہزاروں گھر نذر آتش کئے اور صوبیدار فقط دیکھتا رہا۔

ستم بالائے ستم اس نے الٹا شیعوں کو گرفتار کیا اور اکثر شیعوں کے ناک اور کان کاٹے اور دیگر شیعہ افراد سے جرمانہ وصول کیا اور بہت سوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ لیکن ان لٹیروں سے کسی قسم کی کوئی پوچھ تاچھ نہ کی۔[۲] بالآخر علاقے کے بعض اہل بصیرت افراد کے ہمراہ سید امیر الدین موسوی کی مداخلت کی وجہ سے یہ تنازعہ رفع ہو گیا۔[۳] اسی لوٹ میں ملا محمد مہدی جو جامع علوم و فنون اور محدث کبیر تھے۔ ان کا بے مثال کتابخانہ جلایا گیا۔[۴]

تاراج ہشتم (۱۲۱۶ھ بمطابق ۱۸۰۱ء)

آٹھویں دفعہ افغانیوں کی حکومت میں روز عاشورا ۲۴ جون کو پھر سے جلایا گیا۔ افغان حکمرانوں نے ماتم پر پابندی لگائی تھی۔ شیعہ عاشورا کے موقعہ پر امام باڑہ جڈ بیل میں جمع ہو گئے۔ جب ان بدمعاشوں کو خبر ہوئی تو تمام پٹھان سردار دوسرے غنڈوں کو لے کر جڈ بیل پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے امام باڑے کو آگ

۱۔ تاریخ خلیل مرجان پوری، ص ۲۴۸۔۲۴۷۔

۲۔ تاریخ حسن، ج ۱، ص ۲۹۰۔

۳۔ دانشنامہ شیعیان کشمیر، ج ۱، ص ۱۵۸۔

۴۔ دانشنامہ شیعیان کشمیر، ج ۱، ص ۱۶۱۔

لگادی۔ سامان کو لوٹا گیا اور مکانوں کو جلایا گیا۔ ناموس کی بے حرمتی اور مردوں کو موت کے گھاٹ اتارا قتل وغارتگری کا یہی بازار دوسرے شیعہ محلوں میں بھی گرم کیا گیا۔[1]

تاراج نہم (۱۲۴۶ھ بمطابق ۱۸۳۰ء)

اس سال ایک ملا روز عاشورا ۲۱ جولائی جامع مسجد میں عوام اہل سنت کو مشتعل کر کے لڑنے پر آمادہ کیا۔ وہ مسجد سے باہر آئے اور شیعوں کے خلاف نعرہ بازی شروع کی اور جامع مسجد کے نزدیک کمانگر پورہ میں جہاں شیعہ آباد ہیں پہلے انہیں تاراج کیا گیا اور پھر جڈی بیل کی طرف دوڑے۔ چونکہ روز عاشورا تھا اور لوگ ماتم میں مشغول تھے۔ جب لوگوں نے لیٹروں کے نعرے سنے تو کچھ عورتیں اپنے بچوں کو لے کر ایک غار میں پناہ گزین ہوگیں۔ انہوں نے اس غار کے منہ پر آگ جلائی اور پھر غار کو بند کیا۔ دھویں سے عورتوں اور بچوں کو دم گھٹ گیا اور وہ تمام اسی غار میں شہید ہوگئے۔ اسی لے یہ جگہ بیبہ مزار کہلاتی ہے یعنی عورتوں کا مزار علامہ میر سید رضا موسوی امام باڑہ جڈ بیل میں مشغول خطابت تھے کہ آل ابی سفیان نے امام باڑے کے دروازے بند کر کے چاروں طرف آگ لگادی اور اکثر عزاداران زندہ جل گئے۔

میر سید رضا کو زخمی حالت میں باہر لایا گیا لیکن انہوں نے وہیں پر جام شہادت نوش فرمایا۔ ہزاروں آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر قتل کیا گیا اور جنہیں امام باڑے کے باہر قتل کیا گیا ان کی تعداد تقریباً اٹھارہ سو بتلائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جگہ مرگ بل کے نام سے مشہور ہوگئی۔[2] پھر حکیم مہدی خان کشمیری جو بادشاہ اور اودھ ناصر الدین کا منسٹر تھا۔ اس نے ایک رقم باقر خان سوداگر ایرانی کے پاس بھیج دی اور اس نے دیگر افراد کے ذریعہ امام باڑے کو پھر سے تعمیر کیا۔

تاراج دہم (۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۸۷۲ء)

اس وقت کشمیر کا حاکم مہاراجہ رنبیر سنگھ تھا۔ ہیضہ کی بیماری اس سال کشمیر میں عام ہوگئی اور لوگ مسجدوں میں جاکر استغفار اور دعائیں مانگنے لگے۔ محلہ مدین صاحب جو کہ جڈ بیل سے متصل ہے۔ وہاں کے

---

[1] ۔ تاریخ حسن، ج ۱، ص ۴۹۱۔

[2] ۔ دانشنامہ شیعیان کشمیر، ج ۱، ص ۱۹۱؛ تاریخ حسن، ج ۱، ص ۴۹۲۔۴۹۱؛ شیعیان کشمیر، ص ۱۶۲۔۱۶۱۔

شیعوں نے میر سید محمد مدنی کے بقعہ کے قریب ایک مسجد تعمیر کی تھی یہ شر پسندوں پر ناگوار گزرا۔ اس دوران سید محمد مدنی کا عرس بھی آگیا۔ اس تقریب پر جب سنی مسلمان جمع ہوئے تو انہوں نے شیعوں کی مسجد گرائی اس پر دونوں فرقے آپس میں بر سرپیکار ہوگئے یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیلی اور دوسرے دن شر پسند لوگ جڈ یبل اور دیگر محلوں کے تاخت و تاراج کرنے کے لیے گئے اور ان کا نعرہ یہ تھا۔

دین محمد بر قرار   رأفضن پتہ ځھے کأفرن لار

یعنی حضرت محمد ﷺ کا دین بر قرار ہے۔ رافضوں کے بعد کافروں کو لوٹا جائے گا۔ جڈ یبل کو لوٹا گیا اور اس فساد میں صرف جڈ یبل میں ایک ہزار گھرانے تاخت و تاراج کر کے نذر آتش کے گئے۔ جن میں امام باڑہ جڈ یبل بھی شامل ہے اور دیگر محلوں کے بارے میں خدا ہی جانتا ہے۔ مہاراجہ نے شیعوں کو تین لاکھ روپیہ بطور امداد دی اور پھر دوبارہ شیعوں نے اس امام باڑے کو تعمیر کیا۔ (۱)

خاندان جلالی کے بزرگان اپنا پیسہ صرف کر کے اس امام باڑے کی وقت فوقتاً مرمت کروائی اور مرحوم نواب آغا سید حسین شاہ جلالی صاحب نے بھی اپنا پیسہ اس پر لگا کر اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا۔ لیکن بعد میں ایک تنازعہ کے دوران انہوں نے اپنے آپ کو اس امام باڑے سے جدا کیا جیسا کہ خود انہوں نے اپنے ایک رسالہ بنام ”اعلان“ میں اس بات کی تصریح کی ہے۔ پھر یہ امام باڑہ شخصی تصرفات میں رہنے کی وجہ سے اپنی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ مولانا محمد جواد انصاری (م ۱۳۷۷ھ) نے اس عظیم ثقافتی اور علمی مرکز کو شخصی تسلط سے آزاد کرا کر ۲۸ محرم ۱۳۵۳ھ (۱۴ مئی ۱۹۳۴ء) روز یکشنبہ آل جموں و کشمیر شیعہ ایسوسی ایشن کی تحویل میں لایا اور آیت اللہ اصفہانی کی باضابطہ اجازت سے اس کی انتظامیہ کمیٹی ترتیب دے کر اپنے زیر صدارت قائم فرمائی اور اسکے لیے زینت و آرائش کا سامان مہیا فرمایا۔

یہ امام باڑہ عرصہ دراز سے متنازعہ صورت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن مولانا نے یہ قصہ سرے سے ہی ختم کیا اور ۲۷ نومبر ۱۹۰۰ء میں ایک دستاویز بعنوان مصالحہ مومنین لکھا گیا۔ جس نے اس ابھرتے ہوئے فساد کو رفع کیا اور مولانا صاحب ان تمام افراد کا مرتے دم تک شکریہ ادا کرتے رہے جن کی مداخلت سے یہ قضیہ

۱۔ شیعیان کشمیر، ص ۱۶۴۔۱۶۳؛ تاریخ حسن، ج ۱، ص ۴۶۴؛ الکرام البررہ، قسم ثالث، ص ۲۶۲۔۲۶۱۔

حل ہو گیا۔ جن میں سید باقر صاحب بن غفران مآب سید حسن صاحب مرحوم ساکنہ خوشحال سر جڈ بیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[۱]

اگرچہ مولانا محمد جواد صاحب اس امام باڑے کو پھر سے تعمیر نہ کر سکے لیکن ان کے فرزند مولانا افتخار حسین انصاری دام ظلہ نے اپنے والد کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرتے ہوئے اس امام باڑے کو از سر نو تعمیر فرما کر ایک نئی تاریخ رقم کی اور ابھی تک اس کی تعمیر کا کام جاری ہے جو بہت جلد پورا ہو گا۔ ان شاء اللہ۔

الاحقر

سید محسن حسینی کشمیری متعلم حوزہ علمیہ قم۔ ایران

اول محرم الحرام ۱۴۳۳ ہجری قمری

۱۔ دانشنامہ شیعیان کشمیر، ج ۱، ص ۳۱۰۔۳۰۹۔